اسلامی

تاریخ و تمدّن

امتیاز احمد سعید

فیصل پبلیکیشنز

۹۸۔ گلزیب کالونی یسمن آباد لاھور

ملنے کا پتہ۔ نیو بک پیلس چوک اردو بازار لاہور

اظہار تشکر

پروفیسر محمد اشرف صدیقی ایم اے ۔ شعبہ علوم اسلامیہ
گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور

کیلئے

جن کی اعانت کے بغیر یہ کام تکمیل نہ پا سکتا

طبع اول ... ایک ہزار .. ستمبر ١٩٧٥ء
طبع دوم ... ایک ہزار .. اکتوبر ١٩٧٧ء

ناشر ـــــــ رشید احمد فاروقی

مطبع ـــــــ ندرت پرنٹرز - لاہور

قیمت ـــــــ ١٢/٥٠ روپے

انتساب

حضرت مولینا حافظ قاری حکیم محمد امین فاروقیؒ

کے نام

جن کے روحانی فیض نے مجھے اس قابل
بنایا کہ دین متین کی خدمت کر سکوں

تعارفِ مصنّف

نام .. .. .. امتیاز احمد سعید

تعلیم .. .. ایم۔ اے (علوم اسلامیہ)
ایم اے (عربی)
جے۔ ڈی (پنجاب)
ڈپلوما ان ٹرکش (انقرہ)

شغل .. .. اسسٹنٹ پروفیسر علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج لاہور

تدریسی تجربہ .. انٹر و ڈگری کلاسز : ۱۶ سال
ایم اے کلاسز : ۱۲ سال

تصانیف .. .. ۱۔ امام ترمذیؒ۔ سوانح و تصانیف
۲۔ تدریس اسلامیات
۳۔ دینی تعلیمات
۴۔ اربعین نوویؒ
۵۔ رہنمائے اسلامی نظریہ حیات
۶۔ تفہیم اسلامیات
۷۔ مطالعہ اسلامیات
۸۔ اسلامی تقریبات
۹۔ تاریخ اسلام (مکمل) زیرِ طبع

پیش لفظ

یہ اب تسلیم کی جا چکی ہے کہ پاکستان کی بقاء اور نشوو ارتقاء کے لیے ہماری نوجوان نسل کو اسلامی نظریہ حیات سے روشناس کرانا لازم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر علوم اسلامیہ کو نصاب تعلیم میں ہر سطح پر شامل کیا گیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے طلباء کو اسلام سے متعلق صحیح مستند اور غیر متعصب معلومات بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ آگے چل کر ملک و ملت کے لئے مفید ثابت ہوں۔

زیر نظر کتاب "اسلامی تاریخ و تمدن" جملہ ثانوی تعلیمی بورڈوں کے امتحان انٹرمیڈیٹ (اسلامیات) کے لیے ترتیب دی گئی ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور غالباً بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن ہر لکھنے والے کا انداز جداگانہ ہوتا ہے اور ہر ایک کے پیش نظر مقاصد بھی الگ ہوتے ہیں۔ یہ کتاب بنیادی طور پر ان طلبہ کے لئے مرتب کی گئی ہے جو زیادہ محنت اور کاوش سے کتراتے ہیں اور تن آسانی چاہتے ہیں اس لئے اس میں بے جا طوالت اور غیر ضروری اختصار دونوں سے اجتناب کیا گیا ہے اور مقررہ نصاب کے ہر عنوان پر نہایت آسان، عام فہم اور سادہ انداز میں مواد جمع کیا گیا ہے۔ مضامین کی وضاحت میں آیات قرآنی، احادیث نبوی اور مفکرین اسلام کی آراء کو جا بجا نقل کیا گیا ہے۔ تاریخ کے حصے میں فرقہ وارانہ تعصب کو نظر انداز کر کے نہایت مستند معلومات کو شامل کیا گیا ہے تاکہ طلباء کی شخصیت کسی طور متاثر نہ ہو۔ کتاب کے آخر میں اہم امتحانی سوالات بھی دیئے گئے ہیں تاکہ طلباء امتحانی نقطۂ نگاہ سے بھی پوری واقفیت حاصل کر سکیں۔

مواد مذکورہ کی تکمیل کے لئے ہر امکانی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش کس حد تک کامیاب

ہے۔ اس کا فیصلہ اساتذہ کرام اور طلباء ہی کریں گے۔ قارئین کرام سے استدعا ہے کہ وہ کتاب میں اگر کوئی خامی دیکھیں تو ضرور مطلع فرمائیں تاکہ اگلی طباعت میں اس کا ازالہ کیا جا سکے اور کتاب کو مزید بہتر بنایا جا سکے۔

آخر میں میں اپنے واجب الاحترام اساتذہ اور احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی نیک دعاؤں اور تعاون نے مجھے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مدد دی۔ ان میں استاذ گرامی محترم علامہ علاؤالدین صدیقی سابق وائس چانسلر جامعہ پنجاب برادر محترم ڈاکٹر محمد ضیاء الحق رانا، صدر شعبہ علوم اسلامیہ گورنمنٹ کالج لاہور اور جملہ اساتذہ شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب و گورنمنٹ کالج لاہور کا خصوصاً ممنون ہوں کہ ان کا اخلاص اگر میرے شامل حال نہ ہوتا تو شاید یہ کتاب معرض وجود میں نہ آسکتی۔

دعا ہے کہ رب العزت اس حقیر کوشش کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین!

یکم ستمبر ۱۹۷۳ء　　　　مؤلف

نصابِ اسلامیات

برائے امتحان انٹرمیڈیٹ ۱۹۷۶ء و مابعد

پرچہ اول

ا۔ اسلامی تہذیب و تمدن (ضمیمہ الف)	۵۰ نمبر
ب۔ سیاسی و ثقافتی تاریخ اسلام (ضمیمہ ب)	۵۰ نمبر
میزان	۱۰۰ نمبر

ضمیمہ الف: (اسلامی تہذیب و تمدن)

کتاب و سنت اور مفکرین اسلام کے افکار کی روشنی میں مندرجہ ذیل عنوانات کا مطالعہ:۔

الف: اسلامی تہذیب و تمدن:

۱۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا مفہوم ۲۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی خصوصیات

ب۔ فرد: مندرجہ ذیل اخلاق اسلامی کا مطالعہ:۔

تقویٰ۔ ذکر۔ شکر۔ صبر۔ عفو۔ عدل۔ احسان۔ خدمت خلق۔ تدبر۔ تحمل۔

ج۔ خاندان: ۱۔ عائلی زندگی اور اس کی اہمیت

۲۔ والدین اور اولاد کے حقوق و فرائض

۳۔ خاوند اور بیوی کے حقوق و فرائض

د۔ مکتب و مسجد: ۱۔ اسلامی معاشرے میں تعلیم کی نوعیت و اہمیت ۲۔ استاد اور شاگرد کے حقوق و فرائض ۳۔ اسلامی معاشرے میں مکتب کی اہمیت ۴۔ اسلامی معاشرے میں مسجد کی اہمیت

ہ اسلامی معاشرہ:

حقوق و فرائض۔ ا رشتہ دار ۲۔ ہمسایہ۔ شہری۔ ۴۔ ریاست

۲۔ نظام اسلام: ۱۔ امت۔ ۲۔ ہجرت۔ ۳۔ تبلیغ۔ ۴۔ جہاد

ضمیمہ ب: سیاسی و ثقافتی تاریخ اسلام

۱۔ اسلام کا پس منظر:

۱۔ عرب کا جغرافیہ ۲۔ اسلام سے قبل عربوں کی سیاسی، سماجی اور تمدنی زندگی۔

۲۔ سیرت النبیؐ:

آنحضرتؐ کی ابتدائی زندگی۔ بعثت۔ تبلیغ دین اور ابتدائی مشکلات۔ ہجرت۔ غزوات اور فتوحات۔ تعلیمات نبوی۔ آنحضرتؐ کی بحیثیت مصلح اور بانی ملت اسلامیہ سیرت و اخلاق۔

۳۔ خلافت راشدہ:

۱۔ حضرت ابوبکرؓ: انتخاب خلافت۔ حضرت اسامہؓ کی مہم۔ فتنۂ ارتداد اور باغیوں کی سرکوبی۔ ایران اور روم کی سلطنت سے آویزش کی ابتدا۔ سیرت و اخلاق۔ کارہائے نمایاں۔

۲۔ حضرت عمرؓ: انتخاب خلافت۔ عراق۔ ایران، شام، اور مصر میں اشاعت و فروغ اسلام۔ اسلام بحیثیت قوت سیاسی۔ شہر اور فوجی نظام حکومت کا ارتقاء۔ غیر مسلموں سے سلوک۔ شہادت۔ سیرت و اخلاق۔ کارہائے نمایاں

۳۔ حضرت عثمانؓ: انتخاب خلافت۔ اشاعت و فروغ اسلام۔ شہادت۔ سیرت و اخلاق۔ کارہائے نمایاں۔

۴۔ حضرت علیؓ: انتخاب خلافت۔ انتشار امت کا آغاز۔ انتظام حکومت شہادت و اخلاق۔ کارہائے نمایاں۔

۵۔ خلفائے راشدین کے عہد میں اسلام کی ترقی۔ اس کے سیاسی، سماجی اقتصادی اور تمدنی پہلو۔

نوٹ: ۱۔ "تدبر اور تحمل" لاہور، ملتان اور آزاد کشمیر کے بورڈوں کے نصاب سے خارج ہیں۔

۲۔ "صبر، عفو۔ عدل۔ احسان، استاد اور شاگرد کے حقوق و فرائض، امت اور اخوت" سرگودھا بورڈ کے نصاب سے خارج ہیں۔

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱	انتساب	۳
۲	پیش لفظ	۵
۳	فہرست مضامین	۹
۴	نصاب	۷

حصہ اول اسلامی تہذیب و تمدن

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۵	اسلامی تہذیب و تمدن کا مفہوم	۱۴
۶	اسلامی تہذیب و تمدن کی خصوصیات	۱۶
	فرد (اسلامی زندگی)	
۷	اخلاق اسلامی	۲۲
۸	تقویٰ	۳۱
۹	ذکر	۳۸
۱۰	شکر	۴۹
۱۱	صبر	۵۹
۱۲	عفو	۶۸
۱۳	عدل	۹۳
۱۴	احسان	۹۴
۱۶	تدبر	۱۲۰
۱۷	تحمل	۱۳۱
	خاندان (عائلی زندگی)	۱۴۲
۱۸	عائلی زندگی اور اس کی اہمیت	۱۴۲
۱۹	حقوق والدین	۱۵۵
۲۰	حقوق اولاد	۱۶۴
۲۱	حقوق زوجین	۱۷۵
	مکتب و مسجد (اسلامی نظام تعلیم)	۱۹۲
۲۲	اسلامی معاشرے میں تعلیم کی نوعیت و اہمیت	۱۹۲ تا ۱۹۴
۲۳	استاد اور شاگرد کے حقوق و فرائض	۲۰۰
۲۴	اسلامی معاشرے میں مکتب کی اہمیت	۲۱۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۲۵	اسلامی معاشرے میں مسجد کی اہمیت	۲۲۰	۲۹	ریاست	۲۶۳
			○	عالم اسلام	
○	اسلامی معاشرہ	۲۳۳	۳۰	امت	۲۷۶
۲۶	رشتہ دار	۲۴۰	۳۱	اخوت	۲۸۳
۲۷	ہمسایہ	۲۴۸	۳۲	تبلیغ	۲۹۴
۲۸	شہری	۲۵۴	۳۳	جہاد	۳۰۸

حصہ دوم: تاریخ اسلام

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
○	اسلام کا پس منظر		○	حضرت ابوبکر صدیق رضؓ	۴۲۰
۱	قدیم تہذیبیں	۳۲۲	۱۰	ابتدائی حالات	"
۲	عرب کا جغرافیہ	۳۲۰	۱۱	انتخاب خلافت	۴۲۴
۳	عربوں کی سیاسی، سماجی اور تمدنی زندگی	۳۳۱	۱۲	مہم اسامہ اور دیگر مشکلات	۴۲۸
		۳۳۲	۱۳	ایران اور روم سے آویزش	۴۳۲
○	سیرت النبی ﷺ		۱۴	نظام حکومت	"
۴	آنحضرت ﷺ کی ابتدائی زندگی	۳۴۵	۱۵	وفات	۴۳۳
۵	بعثت نبوی	۳۵۵	۱۶	سیرت و اخلاق	۴۳۶
۶	تبلیغ دین اور مشکلات		۱۷	نمایاں کارنامے	۴۳۸
۷	ہجرت غزوات اور فتوحات	۳۷۵	○	حضرت عمر فاروق رضؓ	۴۴۴
۸	تعلیمات نبوی		۱۸	ابتدائی حالات	"
۹	سیرت و اخلاق	۴۰۸	۱۹	اشاعت و فروغ اسلام	"
۱۰	نظام حکومت	۴۱۳	۲۰	نظام حکومت	۴۶۰

مجھے اعتراف ہے کہ میں نہ عالم ہوں نہ مصنف اس لیے کسی ادبی لغزش کیلئے معذرت خواہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو بنایا۔ جس میں ارض وسماء۔ فضا و خلا۔ جمادات نباتات۔ چرند پرند اور وہ تمام مظاہرات جو ہم سے مخفی ہیں لیکن عالم شہادت کی آبادی جن وانس سے فرمائی اور اپنی اس مخلوق کی ہدایت وراہنمائی کیلئے اپنے انبیاء ورسل اور ان کے علاوہ صالح بندوں پر مشتمل ایک حزب اللہ بنائی جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک اپنا کردار ادا کرتی رہے گی۔ اپنے رسول نبی اور نمائندے مقرر فرمائے تاکہ یہ مخلوق اس کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارے کیونکہ اس نوع کو کسی قدر فعل مختار بنادیا گیا تھا۔ اس پروگرام پر کس طرح عمل ہوا میری اس کتاب کا یہی موضوع ہے اگر قارئین پسند فرمائیں تو میرے لیے یہی کافی ہے کہ وہ دعائے مغفرت فرمائیں۔

تاریخ الانبیاءؑ کی تیاری میں قرآن مجید کی مختلف تفاسیر۔ تاریخ اور سیرت کی جن کتب سے استفادہ کیا ہے ان میں سیرت النبیؐ ابن ہشام۔ علامہ حفظ الرحمٰن کی قصص القرآن۔ علامہ شبلی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ۔ پیر محمد کرم شاہ علیہ رحمت کی ضیاء النبیؐ علامہ مولانا مودودی کی سرور عالمؐ۔ میاں خالد صاحب کی شان محمدؐ اور مولانا سید ابوالحسن ندوی کی نبیؐ رحمت قابل ذکر ہیں۔

میں علامہ محمد نصرت اللہ ناظم دارالعلوم نقشبندیہ امینیہ کا بہت شکر گزار ہوں وہ اپنی مصروف ترین ذمہ داریوں سے وقت نکال کر میرے مضامین کی اصلاح فرماتے رہے۔ میں جناب محمد یعقوب بھٹی اکاؤنٹنٹ جامعۃ البنات کا ذکر نہ کروں تو یہ ناشکری ہوگی آپ نے بھی اس کتاب کی تیاری میں بڑی مدد فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا شکر ادا کرنے کیلئے الفاظ کہاں ہیں کہ اس عمر میں بھی مجھے اپنی حمد بیان کرنے کی توفیق عطاء فرمائی اور اپنے محبوب ترین بندوں کا ذکر خیر کرنے کے مواقع عطا فرمائے۔

مولوی محمد انور

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۲۱	شہادت	تا ۴۷۱
۲۲	سیرت واخلاق	۴۷۲
۲۳	نمایاں کارنامے	"
○	حضرت عثمان غنیؓ	
۲۴	ابتدائی حالات	۴۷۸
۲۵	انتخاب خلافت	۴۸۱
۲۶	اشاعت وفروغ اسلام	تا
۲۷	شہادت	۵۰۲
۲۸	سیرت واخلاق	۵۰۳
۲۹	نمایاں کارنامے	"
○	حضرت علی مرتضیٰؓ	
۳۰	ابتدائی حالات	۵۱۰
۳۱	انتخاب خلافت	۵۱۳
۳۲	انتشار امت کا آغاز	تا
۳۳	انتظام حکومت	۵۲۴
۳۴	شہادت	۵۲۵
۳۵	سیرت واخلاق	۵۲۹ تا
۳۶	نمایاں کارنامے	۵۳۲
○	خصائص خلافت راشدہ	۵۳۳
۳۷	اسلام کی ترقی	تا
۳۸	دیگر خصوصیات	۵۳۶
	اہم امتحانی سوالات	۵۳۷
	بورڈوں کے پرچہ جات	تا ۵۵۲

شہادت

ابتدائی ۱۰
۱۱

اسلامی
تہذیب و تمدّن

اسلامی تہذیب و تمدن

مفہوم: ("تہذیب" لفظ "ہذب" سے ماخوذ ہے اور اس کے لغوی معنی کاٹنا، چھانٹنا سنوارنا، اصلاح کرنا، عیوب سے پاک کرنا، عمدہ و احسن بنانا اور شائستہ و مہذب بنانا ہیں۔ "تمدن" کا لفظ "مدن" سے نکلا ہے اور اس کے معنی شہریت اختیار کرنا ہے۔ اصطلاح میں تمدن سے مراد کسی قوم یا ملت کا وہ ظاہری خاکہ ہے۔ جو اسے ایک قوم یا ملت کی صورت دیتا ہے۔ اور تہذیب سے مراد اس قوم یا ملت کی وہ شکل و صورت یا وضع و قطع ہے۔ جو کانٹ چھانٹ کے بعد اسے دوسری قوموں سے متمیز کرتی ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن سے مراد ملت اسلامیہ کا وہ ظاہری نقشہ و خاکہ ہے۔ جو اسے دیگر قوموں اور ملتوں سے ممتاز کرتا ہے۔)

تہذیب اور تمدن کا فرق: تہذیب و تمدن کا فرق یوں بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ جب ایک سنگتراش مجسمہ تیار کرنا چاہتا ہے تو پہلے وہ آب و گل سے اس کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے۔ پھر اس کی نوک پلک درست کرتا ہے اور اسے ایک مجسمے کی صورت دیتا ہے۔ اس مجسمے کی پہلی یعنی ڈھانچے کی حالت تمدن ہے اور آخری جب کہ وہ سنور کر تیار ہو گیا تہذیب ہے۔ اسی طرح جب کوئی قوم بدویت سے نکل کر شہرت اختیار کر لیتی تو وہ متمدن کہلاتی ہے۔ اور جب وہ اپنے اخلاق و عادات کو سنوار کر طرز زندگی کو عمدہ و احسن اور شائستہ بنا لیتی ہے۔ تو وہ تہذیب یافتہ یا مہذب کہلاتی ہے۔

درحقیقت تمدن، تہذیب کی پہلی منزل ہے۔ اور اس کے معنی محدود ہیں۔ لیکن تہذیب کے معنوں میں نہایت ہی وسعت ہے۔ کسی قوم یا ملت کی عادات و اطوار، طرز بود و باش، لباس و خوراک، معاشرت و سیاست، عقائد و عبادات، رسم و رواج، علوم و فنون اور دیگر معاملات زندگی سب تہذیب ہی میں شامل ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ تہذیب ترقی یافتہ تمدن کا نام ہے۔

تمدن کے معنی طرز معاشرت کے ہیں۔ لہٰذا جہاں معاشرتی ادارے مثلاً ذرائع آمد و رفت،

حفظانِ صحت کا انتظام، صنعت وحرفت کا معیار اور قابلِ تعریف انتظامیہ موجود ہو وہاں ایک اعلیٰ
بجے کا تمدن تو ضرور ہوتا ہے مگر تہذیب کا پایا جانا ضروری نہیں تہذیب کے لیے ضروری ہے کہ
لوگ علوم وفنون فلسفہ، مذہب اور سائنس سے بھی دلچسپی لیں دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ
تمدن معاشرتی اور فنی ترقی کا ایک درجہ ہے لیکن تہذیب روحانی اور ذہنی ارتقا کا ایک مقام ہے
تہذیب وتمدن کے اس نمایاں فرق کے باوجود بعض اوقات یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے
کے مترادف استعمال ہوتے ہیں یعنی تہذیب کا لفظ تمدن کے معنوں میں اور تمدن کا لفظ تہذیب کے
معنوں میں مگر عام طور پر یہ دونوں الفاظ ہم معنی مستعمل ہیں۔ (3

تہذیب وتمدن کے عوامل:

(عوامل جمع ہے عامل کی جس کے معنی اثر پیدا کرنے والا ہیں) تہذیب وتمدن کے عوامل سے مراد وہ قوتیں ہیں
جو کسی جگہ کے لوگوں پر اثر انداز ہو کر انہیں متمدن ومہذب ہونے پر مجبور کریں یہ عوامل دو طرح کے
ہیں ایک روحانی مثلاً مذہبی عقائد ونظریات، قوانین واخلاق معاشی نظریات وغیرہ دوسرے مادی
مثلاً جغرافیائی حالات اور نسلی وجسمانی خصوصیات وغیرہ لیکن مادی عوامل بھی روحانی عوامل کے
تابع ہیں کیونکہ تہذیب وتمدن کی تشکیل تعمیر اور نشوو ارتقاء میں عقائد ونظریات کو بنیادی
حیثیت حاصل ہے پھر چونکہ ہر مذہب ایک خاص عقیدہ ایک خاص مقصد حیات اور ایک خاص اندازِ
فکر پیش کرتا ہے اس لیے بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر تہذیب وتمدن کا بنیادی سرچشمہ
مذہب ہی ہوتا ہے اور مادی عوامل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

دراصل انسان پہلے علمی اور عقلی اعتبار سے کسی عقیدے یا نظریے کو اپناتا ہے اور پھر اسی
عقیدے کے مطابق عملی زندگی اختیار کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر عقیدہ ہی ایک ایسی طاقت ہے جس کے
زیرِ اثر عملی زندگی کے تمام شعبے پروان چڑھتے ہیں اس طرح عقیدہ ومذہب ہی صحیح معنوں میں کسی
تہذیب وتمدن کی تخلیق کرتا ہے۔ (91

اسلامی تہذیب و تمدن کی خصوصیات

اسلامی تہذیب و تمدن کی اہم امتیازی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- توحید:- اسلامی تہذیب و تمدن کی سب سے اولین خصوصیت جو اسے دیگر تمام تہذیبوں سے ممتاز کرتی ہے عقیدہ توحید ہے۔ اسلامی تعلیمات میں توحید باری تعالیٰ کا تصور مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن پاک میں جابجا توحید کا بیان پھیلا ہوا ہے! اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا نچوڑ بھی توحید ہی ہے۔ قرآن پاک نے تخلیق بنی نوع انسان کا مقصد بھی صرف باری تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر اور اس کی عبادت بتایا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذّٰریٰت: ۵۶)

میں نے جن اور انسان کو محض اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

لہٰذا مسلمان کی زندگی کے ہر پہلو سے یادِ الٰہی کا وابستہ رہنا نہایت ضروری ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور لباس و رہائش وغیرہ کے آداب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خدا کے ذکر سے غافل نہ ہو مختصر یہ کہ انسان کی زندگی کا ہر لمحہ یادِ الٰہی میں مصروف گذرنا چاہئے

۲- احترامِ انسانیت: اسلامی تہذیب و تمدن کا دوسرا امتیازی پہلو احترام انسانیت ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے بنی نوع انسان کو باقی تمام مخلوقات پر برتری حاصل ہے! ہر انسان ہی جگہ قابلِ عزت و احترام ہے۔ قرآن حکیم کا واضح ارشاد ہے:۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (بنی اسرائیل: ۷۰)

اور البتہ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (التین: ۴)

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا۔

احترامِ انسانیت کے پیش نظر ہی اسلام غلامی و بردہ فروشی وغیرہ کی سخت حوصلہ شکنی کرتا

ہے۔ اور انسان کی فطری آزادی کو برقرار رکھتا ہے۔ اسلام اگرچہ دیگر افراد معاشرہ کیلئے ہر طرح ایثار و قربانی کا تقاضا کرتا ہے لیکن کوئی بھی حکم ایسا نہیں دیتا جس کے باعث انسان اپنی انفرادی حیثیت کھو دے اور عزت نفس کو نقصان پہنچے۔

۳۔ اتحاد انسانیت:۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی ایک نمایاں خصوصیت اتحاد انسانیت ہے۔ اسلام نسلی و لسانی اور قومی و ملکی سب امتیازات کو ختم کر کے تمام بنی نوع انسان کو ایک انسانی برادری میں منسلک ہونے کی دعوت دیتا ہے اسلام نے وحدت نسل انسانی کی تعلیم دی ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ اس دنیا کے تمام انسان ایک آدمؑ کی اولاد ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي	اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو
خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ	جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور
خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا	پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان سے
رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النسآء: ۱)	بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

ایک دوسرے مقام پر قوموں اور قبیلوں کی تقسیم کو محض تعارف قرار دیتے ہوئے فرمایا:۔

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ	اور تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں
لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ	تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان
أَتْقَاكُمْ (الحجرات: ۱۳)	سکو بیشک تم میں اللہ کے نزدیک معزز
	وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

۵ ۔ آفاقیت:۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک اور نمایاں پہلو آفاقیت و ہمہ گیریت ہے۔ اسلامی تہذیب کسی ایک قوم یا نسل کا ورثہ نہیں بلکہ اس کی حدود تمام کائنات اور جمیع نسل انسانی پر حاوی ہیں۔ ہر شخص توحید باری تعالیٰ اور رسالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اقرار کر کے اس تہذیب کو اپنا سکتا ہے۔ خواہ وہ کسی رنگ، نسل، قوم اور ملک سے تعلق رکھتا ہو۔ اور کوئی سی بھی زبان بولتا ہو۔ اس میں مخصوص قومیت کی تنگ نظری نام کو نہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، سلمان فارسیؓ وغیرہ مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے سبھی موجود تھے

اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک اور خصوصی پہلو مساوات و یکسانیت ہے۔

۵۔ مساوات:۔۔۔ اسلام ایسی تہذیب کی اجازت نہیں دیتا جس میں سب افراد معاشرہ شریک نہ ہو سکیں اور معاشرے میں طبقاتی تقسیم رونما ہو جائے بلکہ اسلام اس قسم کی تفریق کو مٹاتا ہے اور ایسی تہذیب عطا کرتا ہے جس میں امیر و غریب، آقا و غلام، حاکم و محکوم، گورا و کالا سب ایک جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا "کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ماسوائے تقویٰ کے۔"

اسلامی تہذیب و تمدن کی ایک نمایاں خصوصیت امن عالم کا قیام بھی ہے امن

۶۔ امن عالم:۔۔۔ کا مفہوم خود لفظ اسلام میں موجود ہے۔ لہٰذا اسلام یہ تقاضا کرتا ہے۔ کہ تمام نوع انسان امن و امان کی زندگی بسر کریں اور آپس میں فساد اور خونریزی نہ پھیلائیں۔ دنیا میں نیکی کو فروغ دیں اور بدی کو مٹائیں تاکہ زندگی کا ماحول خوشگوار ہو۔ اسلام اگر کسی وقت جہاد کی بھی اجازت دیتا ہے تو اس کا مقصد ہرگز جنگ و جدال اور تباہی و بربادی نہیں بلکہ اس کا مدعا بھی فتنہ و فساد کو دور کر کے امن عالم کا قیام ہے۔ عہد رسالت کے تمام غزوات کا مقصد بھی کفر و شرک اور فتنہ و فساد کو دور کر کے دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام دینا تھا۔

اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک نمایاں پہلو سادگی بھی ہے اسلام زندگی کے ہر پہلو میں

۷۔ سادگی: سادگی کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ اور عیش پسندی و فضول خرچی سے منع کرتا ہے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور ہر معاملے میں سادگی کی تعلیم دیتا ہے اور ایسے امور جن میں تصنع، تکلف، فضول خرچی اور عیاشی کو دخل ہو آپ کی مخالفت کرتا ہے چنانچہ قرآن پاک پکار پکار کر کہتا ہے۔:

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ — کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الاعراف) — فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

درحقیقت سادگی سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور عیش و عشرت سے دوسروں سے ہمدردی مفقود ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فقر پر ہی فخر کیا کرتے تھے اور اس بات کا اندیشہ رکھتے تھے کہ آپ کی امت کہیں مال و دولت میں کھو کر تباہ نہ ہو جائے۔

٨۔ صفائی و پاکیزگی: اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک اور پہلو جو اسے دیگر تہذیبوں سے ممیز کرتا ہے صفائی و پاکیزگی ہے اسلام میں عبادت کے بعد سب سے زیادہ اہمیت صفائی کو ہی حاصل ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو صفائی کو عبادت پر اولیت حاصل ہے کیونکہ پانچ وقت کی نماز کیلئے وضو شرط ہے جس سے ہاتھ منہ اور دانت وغیرہ صاف ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ نماز کے لئے بدن اور کپڑوں کا پاک و صاف ہونا بھی ضروری ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ٣١)	اے بنی آدم ہر نماز کے وقت خوش پوش رہو۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (الاعراف: ٣٢)	(اے نبی) فرما دیجئے کہ کس نے حرام قرار دیا ہے اس زینت کو جسے اللہ نے پیدا کیا۔

دراصل ظاہری صفائی سے ہی باطنی اصلاح بھی ہوتی ہے کیونکہ انسان کے ہر ظاہری فعل کا اثر اس کے باطن پر ضرور ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صفائی پر بہت تاکید کی ہے اور اسے جزو ایمان قرار دیا ہے۔

٩۔ اعتدال پسندی: اسلامی تہذیب کا ایک اور خصوصی پہلو اعتدال پسندی و میانہ روی ہے اسلام اعتدال کا مذہب ہے اور اس کے پیروکاروں کو قرآن حکیم میں "امت وسط" کا لقب دیا گیا ہے جس کے معنی میانہ رو امت کے ہیں اسلام خوشی غمی کھانے پینے پہننے اوڑھنے کھیلنے کودنے حتیٰ کہ عبادت اور ریاضت میں بھی میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے اور بے اعتدالی سے روکتا ہے جہاں غم میں حد سے زیادہ بڑھتے ہوئے نالہ و شیون سے منع کیا ہے وہاں خوشی میں بھی راگ رنگ اور فحاشی و عریانی کی محفلوں کے انعقاد سے روکا ہے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں بھی اسراف اور بخل دونوں سے ہٹ کر اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی تاکید کی ہے کھیل کود بھی اسی حد تک درست ہے جس سے مفید نتائج کی توقع ہو اور جو محض وقت کا ضیاع ہوں صحیح نہیں ہیں عبادت و ریاضت بھی اتنی ہی جائز ہے جس سے جسم پر خواہ مخواہ بوجھ نہ پڑے اور دنیاوی فرائض کی انجام دہی میں رکاوٹ نہ ہو اسلام ایک متوازن نظام معیشت، متوازن نظام سیاست، متوازن نظام معاشرت اور زندگی کے ہر پہلو میں اعتدال و میانہ روی قائم

رکھنے کا حکم دیتا ہے۔

۱۰- **اخوت** :- اسلامی تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت "اخوت" ہے۔ اسلام اپنے تمام پیروکاروں کو ایک برادری قرار دیتا ہے اور انہیں ایک رشتہ اخوت میں منسلک کرتا ہے تاکہ سب افراد معاشرہ میں ایک دوسرے کے لئے ایثار و قربانی اور اتفاق و ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں قرآن حکیم کا ارشاد ہے :-

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات:۱۰) بیشک سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا :-

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران:۱۰۳)

اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور تم اس کی نوازش سے بھائی بھائی بن گئے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل کوششوں سے تمام مسلمان اپنی قومی و ملکی اور نسلی و لسانی تنگ نظریوں سے نکل کر ایک دینی برادری میں شامل ہو گئے۔ ان کے آپس کے تعلق کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جسم سے مشابہت دی ہے جس کے ایک عضو میں تکلیف ہو تو سارا جسم بے خوابی و بخار کا شکار ہو جاتا ہے۔ مسلمان خواہ دنیا کے کسی گوشے میں ہوں وہ ایک امت مسلمہ کے رکن ہیں اور دوسرے بھائیوں کی ذراسی تکلیف کیلئے بے چین ہو جاتے ہیں۔

اسلامی تہذیب و تمدن اور زندگی

اسلامی زندگی انفرادیت سے شروع ہو کر مختلف دائروں میں پھیلی ہوتی ہے۔ انسان کی اولین حیثیت فرد کی ہے لہٰذا زندگی کا سب سے پہلا دائرہ شخصی زندگی کا ہی ہے۔ شخصی زندگی کی اہمیت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان اور عقیدہ انسان کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ ہر شخص کا سب سے پہلا تعلق اپنے گھر کے ساتھ ہوتا ہے جہاں وہ پرورش پاتا ہے اس لئے زندگی کا دوسرا دائرہ خاندان یا عائلی زندگی کا ہے۔ گھر سے نکل کر انسان مسجد و مکتب میں عملی زندگی کی تربیت حاصل کرتا ہے اس لئے تیسرا دائرہ نظام تعلیم کا ہے پھر اس سے آگے بڑھ کر انسان معاشرے کے وسیع دائرے میں قدم رکھتا ہے آخری دائرہ عالم اسلام ہے جہاں ایک مسلمان پوری دنیا کے مسلمانوں

کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ پاتا ہے زندگی کے یہ تمام دائرے ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اس لئے نہ تو رہبانیت کو پسند کرتا ہے اور نہ ہی محض فانی نجات کے حصول کی تلقین کرتا ہے بلکہ فلاح انسانی کا ایک مکمل نظام پیش کرتا ہے زندگی کا کوئی بھی پہلو انفرادی ہو یا اجتماعی، قومی ہو یا بین الاقوامی معاشی ہو یا معاشرتی سیاسی ہو یا قانونی اخلاقی ہو یا روحانی اسلام کی ہدایات سے محروم نہیں ہے انسانی زندگی کے مذکورہ تمام دائروں کی اصلاح و فلاح کیلئے قوانین و ضوابط موجود ہیں اسلام کے ان قوانین و ضوابط یا تعلیمات کو مندرجہ ذیل عناصر میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

ا۔ عقائد ب۔ عبادات ج۔ اخلاق د۔ معاملات

ان عناصر سے زندگی کی جو صورت قائم ہوتی ہے اس کے خدوخال کو اسلامی تہذیب و تمدن کہتے ہیں۔

اسلامی تہذیب وتمدن کا خاکہ

اسلامی زندگی

انفرادی زندگی — اجتماعی زندگی

فرد		خاندان	نظام تعلیم	اسلامی معاشرہ	عالم اسلام
تقویٰ	ذکر	والدین	استاد	رشتہ دار	امت
شکر	صبر	اولاد	شاگرد	ہمسایہ	اخوت
عفو	عدل	زوجین	مکتب	شہری	تبلیغ
احسان	خدمت خلق	(خاوند۔بیوی)	مسجد	ریاست	جہاد
تدبر	تحمل				

فرد

(شخصی زندگی)

اخلاق

مفہوم: اخلاق، خُلق کی جمع ہے جس کے معنی طبیعت، عادت اور خصلت کے ہیں اصطلاح میں اخلاق سے مراد وہ عادات و خصائل ہیں جو انسان سے مسلسل سرزد ہوتے رہنے سے اس کی طبیعت کا جزو بن جائیں۔ اگر یہ عادات عمدہ ہوں تو انہیں "اخلاق حسنہ" کہتے ہیں اور اگر یہ عادات بری ہوں تو انہیں "اخلاق سیئہ" کا نام دیا جاتا ہے۔

اسلامی اخلاق سے مراد وہ اخلاق حسنہ ہیں جو اسلام نے بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کیلئے دنیا کو دیئے ہیں۔

اہمیت

اسلام میں اخلاق کی اہمیت مندرجہ ذیل دلائل سے واضح ہوتی ہے:۔

۱۔ حُسنِ زندگی: انسان کی اولین حیثیت فرد کی ہے اور افراد ہی کے مجموعے سے معاشرہ بنتا ہے لہذا اگر کسی معاشرے کے تمام افراد اپنی اصلاح کر لیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال لیں تو وہ معاشرہ درست و صالح ہو جائے گا اور ایک مثالی اسلامی معاشرہ کہلائے گا یہی وجہ ہے کہ اسلام فرد کی اصلاح کے لئے "اخلاق حسنہ" کے اپنانے کی تاکید کرتا ہے۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ دنیا کے امن و سکون اور ساری خوشحالی کا انحصار اخلاق پر ہے اور اگر اخلاق نہ ہوں تو زندگی کا سکھ اور چین ختم ہو جائے۔ وہی قوم زندگی کے فیوض و برکات کی مستحق ہے جس کے افراد اخلاق حسنہ سے مزین ہوں اور جو قوم اخلاق سے بے بہرہ ہو اس کا تمدنی و معاشرتی شیرازہ منتشر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مفکرین کا خیال ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا سبب بھی اخلاق ہے چنانچہ خدا تعالیٰ جب کسی قوم کو ملک و سلطنت کے شرف سے نوازنا چاہتا ہے تو پہلے اس کی اخلاقی حالت کی اصلاح فرماتا ہے اور پھر اسے یہ شرف عطا کرتا ہے اسی طرح جب کوئی قوم بداطواریوں اور

بداخلاقیوں کی گرویدہ ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ اسے حکمرانی سے محروم کر کے اس کی جگہ دوسروں کو برسرِ اقتدار لاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اخلاقِ حسنہ کے اپنانے سے زندگی میں حُسن و نکھار پیدا ہوتا ہے اور تمدنی و معاشرتی ترقی حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ مذاہب کی بنیاد: اخلاق کی اہمیت کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد اخلاق پر ہے۔ دنیا میں جس قدر پیغمبر اور مصلح ہو گزرے ہیں سب نے اخلاقیات پر زور دیا ہے اور عمدہ اخلاق کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی تعلیم اخلاق ہی بتایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ ۲)

وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو خدا کی آیات اور ان کو پاک کرتا سناتا اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

علماء کرام کے نزدیک آیت قرآنی میں "تزکیۂ نفس" اور "تعلیم حکمت" سے مراد مکارم اخلاق کی تعلیم و تکمیل ہے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد یہی بیان کیا ہے فرمایا:

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ — بیشک میں عمدہ اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ — میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں

۳۔ عبادات کا مقصد: اسلام محض عبادات کا نام نہیں بلکہ عبادات اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ درحقیقت عبادات اور اخلاق اسلام کے دو بازو ہیں جن میں سے کسی ایک کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ نہ تو تنہا عبادت ہی انسان کو صحیح مسلمان بنا سکتی ہے اور نہ ہی تنہا اخلاق۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں عبادتِ الٰہی کا حکم دیا گیا ہے وہاں ساتھ ہی اخلاقِ حسنہ کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (الحج ۷۷)

اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور اچھے کام کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عبادات کا ایک مقصد اخلاق حسنہ کی تعلیم دینا بھی ہے۔ چنانچہ نماز کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (عنکبوت ۴۵)

بیشک نماز برائی اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے۔

روزے کے متعلق قرآن پاک میں بتایا گیا ہے کہ یہ اس لئے فرض کیا گیا ہے تاکہ لوگوں میں تقویٰ پیدا ہو اور تقویٰ ہی سے خدا ترسی، صلہ رحمی، محبت و شفقت اور حقوق العباد کی ادائیگی کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ زکوٰۃ کا مقصد بھی دولتمندوں اور غرباء و مساکین کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے انسانی ہمدردی و غمخواری اور اخوت و محبت کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و تربیت کا ذریعہ ہے اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔ اگر عبادات سے یہ روحانی و اخلاقی ثمرات حاصل نہ ہوں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ جوہرِ معنی سے یکسر خالی ہیں۔

ایک لحاظ سے تو اخلاق کی اہمیت عبادات سے بھی زیادہ ہے۔ وہ اس طرح کہ عبادات کا تعلق محض خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اگر کوئی شخص ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے تو سزا دے یا معاف کر دے لیکن اخلاق کا تعلق بندوں کے ساتھ ہے اور خدا تعالیٰ بندوں کے حقوق غصب کرنے والے کو معاف نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ شخص جس کا حق غصب کیا گیا ہے خود معاف نہ کر دے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس بھائی نے کسی دوسرے بھائی پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہیئے کہ وہ اس دنیا میں اس سے معاف کرا لے ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لئے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا صرف اعمال ہوں گے۔ ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور اگر نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی (بخاری)

۳۔ اسوۂ رسولؐ: اخلاق کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے لئے بہترین نمونہ اخلاق بنا کر

پہنچا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۲۱) البتہ تمہارے لئے رسولؐ خدا میں بہترین نمونہ ہے

ایک دوسرے مقام پر آپؐ کے اعلیٰ اخلاق کی یوں گواہی دی گئی ہے۔ فرمایا:۔

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (قلم ۴) (اے نبیؐ) بیشک آپؐ عمدہ و اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔

درحقیقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس قرآن پاک یعنی احکام اسلام کی عملی تصویر ہے چنانچہ روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے کسی نے پوچھا کہ آنحضورؐ کا اخلاق کیا ہے؟ آپؓ نے سائل سے دریافت کیا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ اس نے کہا ہاں پڑھا ہے۔ آپؓ نے کہا یہی حضورؐ کا اخلاق ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کا اندازہ حضرت جعفر طیارؓ کی اسی تقریر سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے نجاشی شاہ حبشہ کے دربار میں کی۔ انہوں نے کہا "اے بادشاہ ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے بتوں کو پوجتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ بدکاریاں کرتے تھے ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا۔ زبردست زیردستوں کو کھا جاتے تھے اس اثنا میں ایک شخص (حضرت محمدؐ) ہم میں پیدا ہوا۔ اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں۔ پاکدامن عورتوں پر تہمت نہ لگائیں"۔

اسی طرح ہرقل روم کے دربار میں دشمن اسلام ابوسفیان نے بھی آپؐ کے اخلاق حسنہ کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ آپؐ لوگوں کو خدا کی توحید و عبادت کی تعلیم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ سچ بولیں اور رشتہ داروں کا حق ادا کریں۔

مختصر یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق جمیلہ کی مثالیں بے شمار ہیں۔

۵۔ ارشاداتِ نبوی: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں اخلاق کی اہمیت بتائی ہے اخلاق کے اپنانے پر زور دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں کمل ایمان اس شخص کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ تم میں سے نیک وہ ہے جو اخلاق میں تم سب سے اچھا ہے"۔

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق

سب سے اچھے ہیں۔

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! انسان کو جو چیزیں دی گئی ہیں ان میں سے بہتر کون سی ہے؟ آپؐ نے فرمایا خوش خلقی ایک مرتبہ ایک شخص نے سوال کیا کہ دین کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا خوش خلقی۔ ایک شخص نے پوچھا کہ اعمال میں سے افضل کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ حسن خلق۔ آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ میزان عمل میں خوش اخلاقی سے بھاری کوئی نیک عمل نہیں ہوگا نیز آپؐ نے فرمایا ہے کہ خوش خلقی اللہ کا خلق عظیم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اخلاق حسنہ کا اجر آخرت میں بھی بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے روز مومن بندے کے ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہیں ہوگی۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ قیامت کے روز تم میں سے میرا محبوب ترین اور قریب ترین جلیس وہ ہوگا جو تم سب سے عمدہ اخلاق والا ہوگا اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوگا جو بد خلق ہوگا۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ میں جنت کی بلندی میں اس شخص کے لئے ایک گھر کا ذمہ لیتا ہوں جو اپنے خلق کو عمدہ بنائے۔ نیز آپؐ سے پوچھا گیا کہ کون سی چیز جنت میں سب سے زیادہ داخل ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا تقویٰ اور حسن اخلاق۔

آپؐ نے اخلاق کی اہمیت پر اس قدر زور دیا کہ فرمایا انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلامی نظام اخلاق کی خصوصیات

اسلام نے اخلاق کا ایک نہایت ہی جامع نظام پیش کیا ہے جس کی بعض امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جامعیت: اخلاق اسلامی کی سب سے اولین خصوصیت یہ ہے کہ یہ نہایت ہی جامع ہیں۔ دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ ان سے مستفید ہو سکتے ہیں نیز حاکم و محکوم آقا و غلام امیر و غریب ہر طبقہ کے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اصل بنیاد نیت کوشش پر ہے۔ اگر ایک کروڑ پتی نام و نمود کی خاطر کروڑوں روپے خرچ

کر دیتا ہے تو وہ بے سود ہے اور اس کے بر عکس ایک غریب شخص خلوص دل سے روٹی کا ایک ٹکڑا محتاج کو دیتا ہے تو وہ خدا کے ہاں مقبول ہے۔ غرضیکہ اسلامی دستور اخلاق نہایت جامع و ہمہ گیر ہے۔

۲۔ تفصیلیت: اسلامی اخلاق کی دوسری خصوصیت ان کا مفصل ہونا ہے۔ اسلامی نظام اخلاق انسان کے سب احوال کو پیش نظر رکھتا ہے اور زندگی کے کسی جزئیے کو نظر انداز نہیں کرتا۔ سکھ دکھ، بیماری و تندرستی، دشمنی و دوستی ہر طرح کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اصول و ہدایات دیتا ہے۔ اور زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں احکام مہیا کرتا ہے۔

۳۔ دوامیت: اسلامی نظام اخلاق محض آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی کے لئے نہ تھا بلکہ قیامت تک کے لئے ابدی و دائمی اصول و قوانین دیتا ہے جو ہر دور اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہیں۔ اسلامی دستور اخلاق میں فطری لچک موجود ہے جو اسے ہر زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ڈھال دیتی ہے البتہ اس کے بنیادی اصولوں میں قطعاً کوئی لچک و تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

۴۔ عملیت: اسلامی نظام اخلاق کی ایک خصوصیت عملیت یا عمل پذیری ہے یعنی یہ آسانی سے عمل کے سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔ اسلامی اخلاق محض فرشتوں اور دیوتاؤں کے بس کی چیز نہیں بلکہ عام انسان بھی اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عملی نمونہ پیش کیا اور آپ کے صحابہ کرام رض نے بھی نہایت کامیاب مثالیں پیش کیں۔

اخلاق اسلامی کی تقسیم

اسلامی اخلاق کو مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ حقوق و فرائض: ہر انسان پر دوسرے انسانوں کے لئے کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جنہیں فرائض کہا جاتا ہے اور کچھ دوسروں کی طرف سے مراعات حاصل ہیں جنہیں حقوق کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلام اپنے فرائض ادا کرنے اور حقوق طلب نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے کیونکہ فرائض کی ادائیگی سے حقوق خود بخود ادا ہوتے رہتے ہیں۔

۲۔ فضائل در ذائل اخلاق : انسان کے ذاتی چال چلن کی اچھائی اور کردار کی بلندی کے مختلف پہلو مثلاً صداقت، امانت ایفائے عہد، عفو و درگزر، عدل و انصاف، خدمت خلق وغیرہ فضائل اخلاق ہیں اس کے برعکس کسی انسان کے ذاتی چال چلن کی برائی اور کردار کی پستی کے مختلف پہلو مثلاً جھوٹ، خیانت، غیبت، وعدہ خلافی، ظلم وغیرہ رذائل اخلاق کہلاتے ہیں اسلام فضائل اخلاق کے اپنانے کی تلقین کرتا ہے اور رذائل اخلاق سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔

۳۔ آداب : کسی انسان کے اطوار و عادات کی شائستگی کا نام آداب ہے مثلاً اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور ملنے جلنے کے پسندیدہ طور و طریق کو آداب کہتے ہیں اسلام معاشرتی و اجتماعی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے آداب اسلامی کے اپنانے پر زور دیتا ہے۔

تقویٰ

مفہوم: "تقویٰ" عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ و ق ی ہے جس کے معنی ڈرنا، بچنا، حفاظت کرنا اور پرہیز کرنا ہیں۔ اصطلاح شریعت میں "تقویٰ" سے مراد خدا تعالیٰ کے خوف سے اپنی حدود کے اندر رہنا اور ہر قسم کے تجاوز سے بچ کر زندگی بسر کرنا ہے۔ تقویٰ کے بالمقابل قرآن حکیم میں لفظ "عدوان" استعمال ہوا ہے جس کے معنی حد سے بڑھنا اور دست درازی کرنا ہے۔ اس اعتبار سے تقویٰ کا مفہوم یہ ہوا کہ انسان اپنی تمام زندگی اس احساس سے بسر کرے کہ وہ اپنے تمام اقوال و اعمال کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ لہٰذا ہر اس کام سے اجتناب کرے جس سے خدا تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور ہر اس کام کے لئے تیار رہے جس کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

دراصل تقویٰ اس فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کا نام ہے جو انسان کے دل میں خوف خدا سے ہر وقت جاگزیں رہتا ہے اور وہ نیکی پر مستعد اور بدی سے مجتنب رہتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تقویٰ کا مرکز و مسکن دل ہی قرار دیا جیسا کہ فرمایا

اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا۔ (تقویٰ یہاں ہے)

تقویٰ کا مفہوم اس مثال سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت کعب الاحبار سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کیا آپ کبھی خاردار راستہ پر چلے ہیں؟ فرمایا ہاں۔ پھر پوچھا کہ آپ کس طرح گذرے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنا آپ بچایا اور دامن سمیٹ کر چلا۔ حضرت کعب الاحبار نے کہا یہی تقویٰ ہے۔

تقویٰ کے مراتب:- علماء نے تقویٰ کے تین مراتب کئے ہیں ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ۔ ادنیٰ توحید باری تعالیٰ پر ایمان لانا ہے جس سے انسان دوزخ کے ابدی عذاب سے نجات حاصل کرے گا۔ اوسط یہ ہے کہ انسان ہر اس کام سے اجتناب

کرے جس میں گناہ کا اندیشہ ہو اور اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انسان ہر اس کام سے بچنے کی کوشش کرے جس سے اس کی توجہ خدا کے سوا کسی اور طرف مبذول ہو۔

تقویٰ کی حد: شریعت نے تقویٰ کی ایک حد بھی مقرر کی ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی مشتبہ باتوں سے اجتناب کرے۔ لیکن بعض لوگ اس سے بھی آگے گذرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جوش تقویٰ میں بعض جائز و حلال اشیاء کو بھی اپنے پر حرام کر لیتے ہیں یہ درحقیقت حد شکنی ہے اور رہبانیت کے مترادف ہے جس سے اسلام نے منع کیا ہے۔

مختصراً تقویٰ لاپرواہی اور متشددانہ احتیاط کے مابین اعتدال کا نام ہے جس سے انسان خدا تعالیٰ کے احکام کو نہایت احتیاط سے اس کی منشاء و رضا کے مطابق بجا لاتا ہے۔

تقویٰ کے تقاضے: تقویٰ کے بہت سے تقاضے ہیں جن میں سے زیادہ اہم یہ ہیں۔

۱۔ توحید باری تعالیٰ اور آخرت کا یقین: انسان کو خدا تعالیٰ کے خالق، مالک، رب، رازق اور معبود ہونے پر کامل ایمان ہونا چاہیئے۔ ساتھ ہی یہ بھی یقین ہونا چاہیئے کہ یہ زندگی عارضی ہے اور ایک روز خدا تعالیٰ کے حضور میں پیش ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی یہی خوف و ڈر انسان کو متقی بناتا ہے۔

۲۔ اپنی حدود کا سمجھنا: تقویٰ کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان یہ جانے کہ اس زندگی میں اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کیا حدیں مقرر کی ہیں؟ اس میں کن باتوں کی اجازت ہے اور کن کن باتوں سے روکا گیا ہے؟ تاکہ وہ حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھے اور مشتبہ و مشکوک چیزوں سے اجتناب کرے۔

۳۔ حقوق کی نگہداشت: انسان کو چاہیئے کہ اپنے اور دوسروں کے حقوق کو پوری طرح سمجھے تاکہ وہ دوسروں کے حقوق صحیح طور پر ادا کر سکے۔ اگر کسی کا مال اس کے ذمہ ہے تو وہ ادا کرے۔ دوسروں کے مراتب کا خیال رکھے اپنے سے بڑوں کی تعظیم اور چھوٹوں سے محبت کرے۔

اس کے علاوہ ایفائے عہد، عفو و درگذر، عدل و انصاف، دوسروں سے حسن سلوک، غرور و تکبر سے

کی مالی مدد وغیرہ بے شمار تقویٰ کے تقاضے ہیں۔

اہمیت

قرآن و سنت کی روشنی میں تقویٰ کی اہمیت درج ذیل ہے:۔

۱۔ تعمیر کردار و تشکیل سیرت: انسانی کردار کی تعمیر اور اس کی سیرت کی تشکیل میں تقویٰ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے تمام اعمال و افعال کی ابتدا ارادے سے ہوتی ہے اور ارادے کا تعلق دل سے ہے۔ اس لئے اگر دل میں تقویٰ و پرہیزگاری ہوگی۔ تو نیت صحیح ہوگی اور انسان جو کام بھی سرانجام دے گا وہ درست و صحیح ہوگا۔ اگر دل میں تقویٰ نہ ہو تو نیت و ارادہ پر کوئی بندش نہ رہے گی اور انسان خواہشات نفسانی کا تابع ہو کر فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور کسی کام کا بھی نتیجہ درست نہ ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

"خبردار جسم میں ایک لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک ہو تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے اور جان لو کہ وہ دل میں ہے"

لہٰذا تکمیل شخصیت اور تعمیر کردار کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنے دل میں تقویٰ پیدا کرے اسی لئے خدا تعالیٰ نے بھی قرآن پاک کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ"، "یہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے" یعنی قرآن پاک سے استفادہ کرنے کے لئے بھی دل میں تقویٰ ہونا ضروری ہے۔

۲۔ معیار فضیلت: اسلام میں شرافت و بزرگی اور فضیلت و برتری کا معیار مال و دولت یا حسب و نسب یا رنگ و نسل یا قوم و وطن نہیں بلکہ محض تقویٰ ہے۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہی شخص شریف و معزز اور اعلیٰ و ارفع ہے جو متقی و پرہیزگار ہو خواہ وہ امیر ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام اور خواہ وہ کسی قوم، خاندان، رنگ، نسل اور وطن سے تعلق رکھتا ہو۔ شرف و فضیلت اسی کو حاصل ہوگا جس میں خدا خوفی و

خدا ترسی یعنی تقویٰ موجود ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز (الحجرات ۱۳) وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے زیادہ معزز کون ہے؟ آپ نے فرمایا جو سب سے زیادہ متقی ہے، اس کی مزید تصریح نبی کریمؐ کے اس خطبہ سے ہوتی ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا

"کسی عربی کو عجمی پر کسی عجمی کو عربی پر کسی سیاہ کو سفید پر کسی سفید کو سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر سب کے سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے پیدا کئے گئے۔"

ارشاد نبویؐ سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ فضیلت و فوقیت کا معیار فقط تقویٰ ہے

۳۔ جملہ عبادات کی اصل:

اسلام کی جملہ عبادات اور نیکیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی اصل غرض و غایت فقط تقویٰ ہے۔ چنانچہ خود باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ ۲۱) اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ اب اگر الگ الگ طور تمام عبادات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً روزے کی فرضیت کا حکم جاری کرتے ہوئے فرمایا "لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" (تاکہ تم متقی بن جاؤ) حج کے متعلق جہاں یہ حکم دیا کہ سفر پر روانگی سے قبل زاد راہ لو وہاں یہ بھی بتا دیا کہ وَخَیْرُ الزَّادِ التَّقْوٰی "(بقرہ ۱۹۷) اور بہترین زاد راہ تقویٰ اسی طرح قربانی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی (حج ۳۷) "خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے،" نماز بھی انسان میں تقویٰ پیدا کرتی ہے جیسا کہ فرمایا، "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ" (بیشک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے) غرضیکہ اسلام کی تمام عبادت کا مقصود تقویٰ ہی ہے۔

۴۔ اخلاق کی روح: اسلام کے سارے اخلاق نظام کی بنیاد تقویٰ پر ہے اور کسی انسان کے نیک و بد ہونے کا معیار فقط تقویٰ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے عدل، عفو، صبر، وغیرہ اخلاق حسنہ کے اختیار کرنے کا مقصد یہ بتایا کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:۔

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ ۸) عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (بقرہ ۲۳۷) اور معاف کر دینا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے

لباس ستر ڈھانپنے کے لئے اشد ضروری ہے مگر اس بارے میں بتا دیا گیا کہ "بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے"۔ غرضیکہ تقویٰ اسلامی اخلاق کی روح اور ماحصل ہے۔

۵۔ تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید: تقویٰ کی اہمیت کے مذکورہ پہلوؤں کے علاوہ سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ خود خدا تعالیٰ نے قرآن پاک میں کئی مقامات پر تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ — خدا تعالیٰ سے ڈرو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو

اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ — خدا تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے

اللہ تعالیٰ فقط تقویٰ اختیار کرنے کی ہی تاکید نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ہی برائی اور شر سے بچنے کا حکم بھی دیتا ہے جیسا کہ فرمایا:۔

"تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" — نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو

۶۔ ارشادات نبوی: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی تقویٰ و پرہیزگاری اور خدا خوفی و خدا ترسی کا مرقع تھی۔ آپ نے بچپن ہی سے متقیانہ زندگی بسر کی۔ آپ کے خطبوں کا اکثر موضوع تقویٰ ہوتا تھا۔ ہجرت کے بعد قبا کے مقام پر آپ نے جو خطبہ دیا اس کا موضوع تقویٰ ہی تھا۔ آپ نے فرمایا کہ "میں تمہیں تقویٰ کی تلقین کرتا ہوں کیونکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو جو بہترین ہدایت کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے آخرت کے لئے آمادہ کرے اور تقویٰ کا حکم دے۔

مدینہ شریف میں جمعہ کا جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا اس کا مرکزی مضمون بھی تقویٰ تھا۔ آپ نے فرمایا تقویٰ آبرو دلاتا ہے، خدا کی خوشنودی دلاتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے۔ فتح مکہ کے بعد آپ کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر ماسوئی تقویٰ کے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی لاکھوں انسانوں سے آپ نے یہی کلمات ارشاد فرمائے۔ غرضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا نچوڑ تقویٰ ہی ہے۔

ثمرات و فوائد:

تقویٰ کے بے شمار فوائد و ثمرات ہیں جن میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ خدا کی رضا و خوشنودی: چونکہ متقین ہر وقت خدا تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے میں معروف رہتے ہیں اور اپنی تمام کوششیں اسی راہ میں صرف کرتے ہیں اور ہمیشہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں اس لئے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ انہیں محبوب رکھتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (بقرہ ۱۹۴) (اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہوگا)

۲۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ ۴) بیشک اللہ تعالیٰ متقیوں سے محبت رکھتا ہے

۳۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ (جاثیہ ۱۹) بیشک اللہ تعالیٰ متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔

۲۔ دنیاوی کامیابی: خدا تعالیٰ دنیاوی زندگی میں متقیوں کے کاموں میں آسانی پیدا فرماتا ہے اور ان کے رزق میں کشائش عطا کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا اور جو خدا سے ڈرتا ہے خدا اس کے لئے اس کا کام سہل کر دیتا ہے

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط اور جو خدا سے ڈرتا ہے خدا اس کے لئے راہ نجات پیدا کر دیتا ہے اور اسے رزق دیتا ہے جہاں اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔

۳۔ اخروی زندگی میں کامرانی: اہلِ تقویٰ کو راہ حق میں بہت سی قربانیاں دینا پڑتی ہیں مال و دولت، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محروم رہنا پڑتا ہے اس کا اجر اللہ تعالیٰ اخروی زندگی میں دائمی کامرانی کی صورت میں عطا فرماتا ہے ارشاد ربانی ہے:

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (اعراف ۱۲۸) — اور عاقبت متقیوں کے لئے ہے اور آخرت

وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (زخرف ۳۵) — تیرے پروردگار کے نزدیک پرہیزگاروں کیلئے ہے

۴۔ گناہوں کی مغفرت: اللہ تعالیٰ متقین کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور انہیں عظیم بخشش سے نوازتا ہے، جیسا کہ فرمایا۔

مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗ اَجْرًا — جو شخص خدا سے ڈرتا ہے خدا اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور اس کے اجر کو زیادہ کر دیتا ہے

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۔ — اور اگر تم ایمان لاؤ اور خدا سے ڈرو تو تمہارے لئے بہت بڑا اجر ہے۔

۵۔ انعاماتِ ربانی: خدا تعالیٰ متقیوں پر رحمت و سلامتی کرے گا اور انہیں اپنے خاص انعامات سے نوازے گا۔ جیسا کہ فرمایا۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۔ — بیشک متقین باغوں اور چشموں میں ہوں گے

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ فِيْ جَنّٰتٍ نَّعِيْمٍ ۔ (ذاریات ۱۵) — بیشک متقین امن کی جگہ یعنی باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔

مختصر یہ کہ تقویٰ کے بے شمار فوائد و ثمرات ہیں۔ خدا کی رضا و خوشنودی۔ دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی اور دیگر انعامات و اکرامات متقیوں کو حاصل ہیں۔ علاوہ اس کے تقویٰ سے عبادات و اعمال میں خشوع و خضوع اور خلوص پیدا ہوتا ہے معاملات میں ذمہ داریوں کا احساس اور دوسروں کے حقوق کے تحفظ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان خدا تعالیٰ کی تمام رحمتوں اور برکتوں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

ذکر

مفہوم: ذکر کے لغوی معنی یاد کرنا اور ذہن میں دہرانا ہیں۔ نیز اس لفظ کا اطلاق قول و بیان اور گفتگو پر بھی ہوتا ہے قرآن حکیم میں یہ لفظ یاد الٰہی، قرآن مجید، نصیحت، یاد دہانی اور نماز وغیرہ متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن اصطلاح میں ذکر سے مراد خدا تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔ صوفیاء اور علماء کے نزدیک ذکر یاد الٰہی کا وہ طریقہ ہے جس سے نفس معرفت ربانی حاصل کرتا ہے اور مدارج عالیہ نصیب ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ذکر کے بالمقابل "غفلت" اور "نسیان" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن کے معنی بھول جانا اور فراموش کرنا ہیں۔

لہٰذا ذکر کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مسلمان خدا تعالیٰ کی طرف سے کبھی بھی غافل نہ ہو بلکہ ہر وقت اور ہر حالت میں اس معبود حقیقی کو یاد رکھے۔

اقسام: ذکر الٰہی کی دو بڑی قسمیں خفی اور جلی ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا	اور اپنے پروردگار کو دل میں
وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ	گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے
بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ	دھیمی آواز سے صبح و شام یاد کر
الْغَافِلِينَ (اعراف ۵-۲)	اور غافلوں میں سے نہ ہو۔

ذکر خفی سے مراد وہ ذکر ہے جو پوشیدہ اور مخفی ہو یعنی محض دل سے خدا تعالیٰ کا ذکر کیا جائے اس میں زبان خاموش رہتی ہے اور دل بیدار و متحرک ہوتا ہے

اس لئے اسے قلبی ذکر بھی کہتے ہیں

ذکر جلی سے مراد وہ ذکر ہے جس میں بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے تاکہ سامعین بھی محظوظ ہوں اسے لسانی ذکر بھی کہتے ہیں

لسانی ذکر انفرادی بھی ہو سکتا ہے اور جماعتی بھی لیکن جماعتی ذکر زیادہ افضل ہے کیونکہ اس صورت میں جذبات و خیالات میں یک جہتی و ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے علاوہ ازیں یہ طریقہ نہایت ہی موثر ہے . اور اس سے دوسروں میں بھی ذکر الٰہی کا رجحان پیدا ہوتا ہے احادیث میں بھی جماعتی ذکر کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے . حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب کوئی گروہ ذکر الٰہی کیلئے جمع ہوتا ہے تو ملائکہ ان کو ڈھانپ لیتے ہیں اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے اور سکون نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی محفل میں یاد کرتا ہے صحابہؓ بھی مسجد نبویؐ میں اکثر اس طرح کے حلقے قائم کرتے تھے جن میں وہ باہم خدا تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتے تھے

درجات : صوفیاء نے ذکر کے چار درجات بیان کئے ہیں :-

اوّل یہ کہ خدا تعالیٰ کا ذکر محض زبان پر ہو اور دل اس سے بے خبر ہو ۔ ذکر کا یہ سب سے ادنیٰ درجہ ہے اور بہت کم اثر رکھتا ہے۔

دوم یہ کہ دل میں ذکر الٰہی تو ہو مگر اسے جبر اور تکلف سے اس کا خوگر کیا گیا ہو۔ ذکر کا اوسط درجہ ہے اور مستحسن ہے کیونکہ اس سے ذکر کے اعلیٰ مدارج طے ہوتے ہیں۔

سوم یہ کہ ذکر الٰہی پختہ ہو اور بغیر کسی تکلف کے جاری و ساری رہے ۔ یہ ذکر کا اعلیٰ درجہ ہے ۔

چہارم یہ کہ دل یادِ الٰہی میں اس قدر مستغرق و مستحکم ہو جائے کہ زبان سے ذکر کی ضرورت باقی نہ رہے ۔ یہ ذکر کا اعلیٰ ترین طریقہ ہے اور صوفیاء کی اصطلاح میں اسے فنا فی اللہ کہتے ہیں ۔

اہمیت

ذکر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے قرآن پاک میں تقریباً بیس مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور نہایت پر زور الفاظ میں اس کی جانب ترغیب دلائی گئی ہے بلکہ اس سے غفلت برتنے والوں کو شدید عذاب اور تنگدستیوں کی وعید سنائی گئی ہے۔ ذکر کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ روحانی اصلاح: نفس انسانی فطری طور پر شر اور برائی کی طرف رغبت رکھتا ہے اس لئے برائی اور گناہ سے روکنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے نیکی اور خیر کے کاموں میں مشغول رکھا جائے اس لحاظ سے ذکر الٰہی اس کی سب سے عمدہ صورت ہے جس طرح جسمانی زندگی کی بقا کے لئے غذا ضروری ہے اسی طرح روحانی زندگی کے قیام کے لئے ذکر الٰہی اہم ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے پروردگار کا ذکر کرتا ہے اس کی حالت زندہ کی سی ہے اور جو نہ کرتا ہو اس کی حالت مردہ کی سی ہے درحقیقت انسان اگر سچے دل سے خدا تعالیٰ کا ذکر کرے تو وہ برائی اور گناہ سے محفوظ رہتا ہے۔

۲۔ جملہ عبادات کی روح: اللہ تعالیٰ کا ذکر سب اعمال سے افضل ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ۝ (عنکبوت ۴۵)	بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ اور اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔

ذکر الٰہی تمام اعمال و نفلی عبادات سے افضل ہی نہیں بلکہ تمام عبادات اسلامی کی اصل روح بھی ہے اگر عبادات میں ذکر الٰہی نہ ہو تو یہ بے کیف و بے اثر ہو جائیں

چنانچہ قرآن پاک میں نماز کا مقصد یہی بیان ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۔ (طٰہٰ ۲۰ : ۱۴) اور میرے ذکر کے لئے آپ نماز قائم کریں

ایام حج کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (البقرہ ۲ : ۲۰۳) اور ان چند دنوں میں اللہ کا ذکر کرو

ایک صحابیؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کونسا عمل سب سے افضل ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب تو اس دنیا سے سفر کرے تو تیری زبان ذکر الٰہی سے تر ہو۔

۲۔ قرآن پاک کی تاکید :

قرآن پاک میں نہ صرف متعدد مقامات پر ذکر الٰہی کی تلقین کی گئی ہے بلکہ ذکر الٰہی کثرت سے کرنے کی تاکید کی گئی ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے :۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۙ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۔ (الاحزاب ۳۳ : ۴۱، ۴۲) اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو اور صبح و شام اس کی پاکیزگی بیان کرو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا :۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (جمعہ ۶۲ : ۱۰) اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا :۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (آل عمران ۳ : ۴۱) اور اپنے رب کا خوب ذکر کر اور صبح و شام تسبیح بیان کر۔

ان آیات ربانی میں اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ انسان خواہ کسی حالت میں ہو

اور کہیں بھی ہو سفر و حضر، صحت و بیماری، رات و دن اور صبح و شام ہر وقت اٹھتے بیٹھے اور چلتے پھرتے ذکر الٰہی وردِ زبان ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم میں ایسے ہی لوگوں کو صحیح مومن کہا گیا ہے جو ہمہ وقت ذکر الٰہی میں مصروف رہتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا	مومن ہیں جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے
وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ (آل عمران ۱۹۱)	ہر حالت میں ذکر الٰہی کرتے ہیں۔

ذکر الٰہی خدا تعالیٰ کی توجہ کا موجب ہے اور

۴:۔ ذکر سے روگردانی پر وعید: جو شخص ذکر الٰہی سے روگردانی کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کو بھول جاتا ہے تو دنیا میں اس کے رزق میں تنگی واقع ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی اس کے لئے سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ جیسا کہ فرمایا :۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ	اور جس نے میرے ذکر سے منہ موڑا
لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُہٗ	اس کے لئے رزق تنگ ہو جاتا ہے
یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی	اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے
(طٰہٰ : ۱۲۴)	

اس دنیا میں رنج و راحت اور دکھ سکھ کا چولی

۵۔ اطمینان قلب کا ذریعہ: دامن کا ساتھ ہے اور ہر سکھی سے سکھی انسان کو بھی کوئی نہ کوئی غم ضرور لاحق رہتا ہے۔ پھر انسان فطری طور پر مادیت کی طرف راغب ہے کسی کو مال و دولت کی رغبت ہے کسی کو اولاد کی اور کسی کو دنیاوی جاہ و حشمت کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو ذہنی سکون حاصل نہیں ہے اور بڑے سے بڑا دولتمند اور جاہ و عزت کا مالک شخص بھی اس دنیا میں مطمئن نظر نہیں آتا اس پریشانی اور بے اطمینانی کا فقط ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے ذکر الٰہی۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں وہ ہر حال میں مطمئن نظر آتے ہیں نہ کسی چیز کے چھن جانے کا ڈر انہیں لاحق ہوتا ہے اور نہ ہی کسی مادی مفاد کے حصول سے کوئی غیر ضروری خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد

باری تعالیٰ ہے :۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ خبردار! اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ (رعد ۲۸)

۶۔ احادیث میں فضیلت :

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ہر وقت اور ہر حالت میں ذکر الٰہی کا چشمہ جاری رہتا تھا۔ آپؐ کے ہر سانس میں خدا کی تحمید و تقدیس کے نغمے ہوتے خواہ آپؐ کھڑے ہوں یا بیٹھے۔ سوار ہوں یا پیدل اور سفر میں ہوں یا حضر میں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر الٰہی کی بے حد اہمیت بیان فرمائی ہے ایک حدیث میں آپؐ نے ذکر کو تمام اعمال سے بہتر، سب سے ستھرا، درجات میں سب سے بلند اور مال و دولت خرچ کرنے سے بھی اچھا بتایا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس شخص کو میرا ذکر اس قدر مشغول رکھے کہ وہ دعا مانگنے کے لئے بھی فرصت نہ نکال سکے تو میرے نزدیک اس کا انعام دعا مانگنے والوں کے انعام سے زیادہ ہے۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ ذکر الٰہی کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں تو ان کے اردگرد فرشتے آجاتے ہیں رحمت ان پر چھا جاتی ہے سکون ان پر نازل ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ ان کا ذکر فرشتوں سے کرتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ذکر الٰہی کو مالی قربانیوں کا بدل قرار دیا ہے۔ ایک مرتبہ چند نادار صحابہؓ نے بارگاہ رسالتؐ میں عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ اہل ثروت اپنی مالی قربانیوں کی بدولت ہم سے سبقت لے جائیں گے حالانکہ باقی جملہ عبادات میں ہم ان کے برابر ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کیا میں تمہیں ایسی بات نہ بتاؤں جس پر عمل پیرا ہونے سے تمہیں ان کے برابر اجر و ثواب مل جائے۔ ہر نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔

ذکر کے طریقے

ذکر الٰہی کے بے شمار طریقے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں :-

۱- ورد : ذکر الٰہی کا سب سے اہم طریقہ ورد کا ہے۔ قلب و ذہن پر کسی بات کا اثر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے وردِ زبان کیا جائے یعنی بار بار دہرایا جائے اس غرض کے لئے سب سے مقبول ورد اسمائے باری تعالیٰ کا ہے، جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے :-

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی	اور اللہ تعالیٰ ہی کے اچھے اچھے
فَادْعُوْہُ بِھَا	نام ہیں پس تم انہی سے اس کو پکارا کرو۔

خدا تعالیٰ کے یہ نام بے شمار ہیں اور اس کی مختلف صفات کے مظہر ہیں اس لئے مخصوص نعمتوں کے حصول کیلئے اسی قسم کے مخصوص نام سے خدا کو یاد کیا جائے تو زیادہ پر اثر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عام طور پر جو کلماتِ ذکر بیان ہوئے ہیں وہ ذیل کی اصطلاحات کے تحت ذکر کئے جا سکتے ہیں :-

(ا) تہلیل : لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ	اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔
(ب) تسبیح : سُبْحَانَ اللہِ	اللہ پاک ہے۔
(ج) تحمید : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ	سب تعریف اللہ کے لئے ہے۔
(د) تکبیر : اَللہُ اَکْبَرُ	اللہ سب سے بڑا ہے

اگرچہ کلمات ذکر اور بھی ہیں لیکن سب سے افضل تہلیل یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہنا ہے۔

۲- دعا : خدا تعالیٰ کے حضور میں خشوع و خضوع اور عاجزی و انکساری سے دعا کرنا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنا بھی ذکر کی ایک صورت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ — دعا عبادت ہی ہے۔

یہ بھی فرمایا:۔

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ — دعا عبادت کا مغز ہے۔

۳۔ تلاوت: تلاوت کلام پاک بھی ذکر کی ایک عمدہ و اعلیٰ صورت ہے قرآن پاک کو بار بار پڑھنے اور اس میں غور و فکر کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے حضرت ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ آیات الٰہی اور ان کی عظمت و قدرت میں غور و فکر سب اذکار سے افضل اور ان کی اصل ہے۔

۴۔ درود: ذکر کا ایک طریق جسے قرآن پاک نے بھی بیان کیا ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنا ہے اور آپؐ پر درود و سلام بھیجنا ہے کیونکہ آپؐ احکامات خداوندی لوگوں تک پہنچانے کا وسیلہ تھے ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

اے ایمان والو! نبی کریمؐ پر درود اور سلام بھیجا کرو۔

۵۔ اعتکاف: ذکر کا یہ بھی ایک طریقہ ہے جس میں انسان کچھ عرصے کے لئے دنیاوی تعلقات سے الگ ہو کر گوشہ نشینی میں اللہ کی عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف مسنون ہے۔

شرائط ذکر

ذکر الٰہی کی بعض شرائط بھی ہیں جو یہ ہیں:۔

۱۔ خلوص: ذکر الٰہی کی سب سے اہم شرط خلوص ہی ہے یعنی اس میں نام و نمود اور ریا و نمائش شامل نہ ہو بلکہ محض خدا تعالیٰ کی رضا و خوشنودی

حاصل کرنے کے لئے کیا جائے ذکر کرتے ہوئے تمام وقت تقویٰ دل میں جاگزیں رہنا چاہئے

۲۔ تفکر: ذکر الٰہی کے ساتھ تدبّر و تفکر بھی نہایت اہم ہے کیونکہ بغیر تفکر و تدبر تو جمادات و نباتات بھی ذکر باری تعالیٰ میں مصروف رہتے ہیں اور ہمہ وقت اسی کی تسبیح و تقدیس بیان کرتے رہتے ہیں۔ انسان کے ذکر میں چونکہ تفکر شامل ہوتا ہے اس لئے وہ سب سے افضل ہے قرآن حکیم نے بھی اس مقصد کے پیش نظر بار بار مطالعۂ کائنات اور تدبر کائنات کی دعوت دی ہے۔

۳۔ اعتدال: ذکر الٰہی کی تیسری شرط اعتدال ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ کا جس قدر ذکر کیا جائے کم ہے لیکن اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان دنیاوی کام کاج اور اپنی معاشرتی و دیگر ذمہ داریوں کو چھوڑ کر دن رات وظائف پڑھتا رہے۔

ذکر دراصل دل میں یاد الٰہی کا نام ہے جو دنیاوی کاروبار کے دوران بھی ہو سکتی ہے۔ اور اسلام تقاضا بھی یہی کرتا ہے کہ انسان دنیاوی کاروبار میں ہوتے ہوئے بھی ذکر الٰہی اپنے دل میں جاری و ساری رکھے اور قیامت کے محاسبے سے ڈرتا رہے تاکہ رزق حلال ہی کمائے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ	اے ایمان والو! تمہیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد خدا کی یاد سے غافل نہ کردیں۔

لسانی ذکر کے بارے میں بھی جو احادیث نبی کریمؐ سے مروی ہیں ان میں زیادہ طویل اذکار کا حکم نہیں ہے تاہم جن لوگوں کو دنیاوی معاملات سے فرصت ہو ان پر طویل اذکار کی پابندی نہیں ہے۔

ثمرات و فوائد

ذکر الٰہی سے مندرجہ ذیل فوائد و ثمرات حاصل ہوتے ہیں:۔

۱- اطمینانِ قلب : ذکرِ الٰہی سے دل، تمام دنیاوی پریشانیوں اور دکھوں سے نجات حاصل کرتا ہے اور صحیح معنوں میں سکون و اطمینان حاصل کرتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد ۲۸) — خبردار اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

۲- بارگاہِ ایزدی میں مقبولیت : ذکرِ الٰہی سے انسان بارگاہِ ایزدی میں مقبولیت حاصل کر لیتا ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

فَاذْكُرُوْنِىْ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ) — تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کرونگا

اللہ کا ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انسان کو اپنی رحمت خاصہ سے نوازتا ہے ہر مشکل و تکلیف میں اس کا مددگار ہوتا ہے اور اسے کبھی بھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ میرے بارے میں جو گمان کرتا ہے میں اس گمان کے قریب ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں اگر وہ مجھے دل میں یاد کرے تو اسے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے برسرِ عام یاد کرے تو میں اسے برسرِ عام یاد کرتا ہوں۔

۳- فلاح و کامرانی : ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنے والا شخص نہ صرف دنیاوی زندگی میں اطمینان و سکون اور راحت و آسودگی حاصل کرتا ہے بلکہ اس کی عاقبت بھی سنور جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر اپنا خاص فضل و کرم کرتا ہے۔ اس کے گناہوں کی مغفرت کر دیتا ہے اور اسے اجرِ عظیم سے نوازتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے :-

وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا — ... والے مرد اور ذکر کرنے والی

الذَّاكِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (الاحزاب ۳۵)

عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے بخشش اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے

اور فرمایا:۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (جمعہ ۱۰)

اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح حاصل کرو

۴۔ عاجزی انکساری وقناعت:

ذکر الٰہی سے انسان میں عاجزی وانکساری اور خشیتِ الٰہی جیسی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:۔

اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (حج ۳۵)

جب اللہ کو یا د یاد کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں

اس کے علاوہ ذکر الٰہی میں مشغول رہنے والے شخص میں صبر وقناعت جیسی صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ ہر حال میں اللہ کا شکر کرنے والا ہوتا ہے

۵۔ تزکیہ نفس:

ذکر الٰہی سے انسان تزکیہ نفس حاصل کرتا ہے اس کا نفس ہر وقت برائی سے گریزاں اور نیکیوں کا خواہاں رہتا ہے وہ ان تمام تر امور کو ترک کر دیتا ہے جس میں خدا تعالیٰ کی ناراضگی ہو اور پھر ان امور میں مصروف ہو جاتا ہے جس میں خدا کی رضا و خوشنودی شامل ہو۔

شکر

مفہوم: شکر کے معنی کسی دینے والے کی نعمت کا اعتراف کرنا اور اس کی قدر پہچاننا ہے اور اصطلاح شریعت میں اس سے مراد منعم و محسن حقیقی اللہ تعالیٰ کے بے حد و کنار انعامات، اکرامات اور احسانات کا دل زبان اور عمل سے اعتراف کرنا ہے۔ یعنی دل ہمیشہ احسان شناسی کے جذبہ سے معمور ہو زبان سے کوئی بات ایسی نہ نکلے جو احسان ناشناسی پر محمول کی جا سکے بلکہ اس پر ہر وقت شکر گذاری کے الفاظ جاری ہوں اور ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء سے اعمال و افعال سرزد ہوں جو دینے والے کی عظمت و بزرگی کا اظہار کریں۔

شکر کے لئے چند باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک علم دوسرے حال تیسرے عمل اور چوتھے مقصد۔ علم سے مراد یہ ہے کہ نعمت کو منعم حقیقی کی طرف سے سمجھے اور اسے اپنی جد و جہد اور قابلیت قرار نہ دے۔ حال سے مراد یہ ہے۔ کہ منعم کے انعام سے خوشی کا اظہار کرے۔ عمل سے مراد یہ ہے کہ ایسی باتوں پر عمل پیرا ہو جو منعم کو پسندیدہ ہوں اور مقصد سے مراد یہ ہے کہ شکر گذاری کی غرض و غایت، خدا کا تقرب اور اس کی رحمتوں کا حصول ہو۔

قرآن پاک میں شکر کے بالمقابل کفر کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی چھپانا ڈھانپنا اور انکار کرنا ہے اور اصطلاحاً اس سے مراد قدر ناشناسی اور احسان فراموشی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

"اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا	ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا اب
شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (دہر ۳)	وہ شکر کرے یا کفر

گویا کفر اسلام کے نزدیک بدترین خصلت ہے اور اس کے برعکس

شکر سب سے بہتر و اعلیٰ صفت ہے۔

اہمیت

شکر کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ فطری تقاضا:۔ منعم و محسن حقیقی خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔ انسان اگر اپنی ذات اور کائنات پر غور کرے تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کا کوئی کمال ذاتی نہیں بلکہ محض خدا تعالیٰ کا عطیہ و انعام ہے۔ جو بلا استحقاق اسے حاصل ہوا ہے۔ اور جو خالق کائنات کی بندہ نوازی اور بندہ پروری کا مظہر ہے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے انعامات و اکرامات اس قدر لامتناہی ہیں کہ ان کا شمار کرنا ناممکن ہے۔ جیسا کہ خود باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا (النحل ۱۸)	اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو شمار نہیں کر سکتے

خدا تعالیٰ کی ہر نعمت اپنی خصوصیات و صفات کے لحاظ سے منفرد و متمیز ہے اور نعمتوں میں تنوعات کی کثرت انسانی طبائع کے مطابق ہے قرآن مجید انسان کی توجہ بار بار ان انعامات ربانی کی طرف مبذول کرتا ہے۔ تاکہ انسان ان پہ تدبر کرے جس کا لازمی نتیجہ شکر باری تعالیٰ ہے۔ خود انسانی جسم خدا تعالیٰ کے بیشمار احسانات پہ دلالت کرتا ہے جسم کے اعضاء کا تناسب اس کی صحت اس کی کارکردگی اور فہم و ادراک سب باری تعالیٰ کے بے پایاں احسانات ہیں جن کا تقاضا نیازمندی و شکر گذاری ہے۔

۲۔ احکامات شریعت کا مقصد:۔ شکر ایک مسلمان کی ساری زندگی پر محیط ہے اور شریعت کے تمام احکامات کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ شکر اخلاق و اعمال اور عبادات کا بنیادی جزو ہے

تمام اعمال اور خدا تعالیٰ کی عبادات بے معنی ہو جاتے ہیں جبتک کہ یہ جذبۂ شکر سے معمور نہ ہوں۔ ایک صاحب دولت جب اپنی دولت راہ خدا میں صرف کرتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے اور ایک صاحب علم جب اپنے علم سے بندگان خدا کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کا شکرانہ ہے اور اسی طرح ایک صاحب قوت جب نادار و کمزور کی مدد کرتا ہے تو یہ قوت و طاقت کا شکریہ ہے۔ غرضیکہ ہر وہ کام جو انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت فرمانبرداری اور رضا و خوشنودی کے لئے انجام دیتا ہے شکر ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ — اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ کے ہی عبادت گزار ہو تو اس کے لئے شکر ادا کرو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:۔

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ — اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر بجا لاؤ۔

۳۔ قرآن پاک کی تاکید: اللہ تعالیٰ نے خود بھی قرآن پاک میں بار بار انسان کو ادائیگی شکر کی تاکید کی ہے۔ تاکہ وہ حق تعالیٰ کے انعامات و کرامات کا معترف ہو کر اس کا صحیح معنوں میں اطاعت گزار و فرمانبردار بندہ بن جائے جیسا کہ فرمایا:۔

وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (البقرہ ۱۵۲) — اور میرا شکر ادا کرو اور میری نعمتوں کا کفر نہ کرو۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا:۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ (النحل ۱۱۴) — پس اللہ تعالیٰ نے جو جائز اور پاکیزہ چیزیں تمہیں دے رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو۔

۴۔ جملہ انبیاءؑ کا عمل: جملہ انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کی زندگیاں شکر باری تعالیٰ کا زندہ نمونہ ہیں تمام انبیاء باری تعالیٰ کے ہمیشہ ممنون احسان رہے چنانچہ قرآن پاک میں حضرت نوحؑ کے بارے میں ارشاد ہے

اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (بنی اسرائیل ۳) بیشک وہ شکر گزار بندے تھے۔

حضرت سلیمانؑ سے حق تعالیٰ نے فرمایا:۔

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (سبا: ۱۳) اے داؤد کے گھر والو شکر گزاری پر عمل کرو

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اِجْتَبٰهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (النحل: ۱۲۱)

ابراہیم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے اللہ نے انکو چن لیا انکو سیدھا راستہ دکھایا۔

۵۔ اسوۂ رسول: سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی شکر باری تعالیٰ کی زندہ مثال ہے آپؐ ہمہ وقت ذکر و شکر میں مشغول رہتے اور اس مقصد کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اتنی دیر مشغول عبادت رہتے کہ آپؐ کے پاؤں تک سوج جاتے تھے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ کی یہ حالت دیکھ کر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ کے لئے تو خدا نے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے پھر آپؐ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا:۔

اَفَلَآ اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں

آپؐ کی مراد یہ تھی کہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر جس قدر بھی ادا کیا جائے کم ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خود مجسم پیکر شکر تھے بلکہ آپؐ اپنے صحابہؓ کو بھی جذبۂ شکر پیدا کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ وہ لوگ جو تم میں سے مال و دولت اور دنیاوی جاہ و مرتبہ میں کم ہیں ان

کی طرف دیکھو (تاکہ تم میں جذبۂ شکر پیدا ہو) اور ان لوگوں کی طرف نہ دیکھو جو تم سے مال و دولت اور دنیاوی ساز و سامان میں بڑھے ہوئے ہیں تاکہ جو نعمتیں تمہیں اس وقت ملی ہوئی ہیں وہ تمہاری نگاہ میں حقیر نہ ہوں (کیونکہ اس سے خدا کی ناشکری کا جذبہ ابھرتا ہے)۔

آپؐ کی اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کو ہر حال میں خدا تعالیٰ کا شکر گذار رہنا چاہئے نہ کہ اپنے سے امیر و دولتمند لوگوں کو دیکھ کر مایوسی و بددلی پیدا کریں اور خدا تعالیٰ سے شکوہ و شکایت کرنے لگیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بھی عطا کی ہیں۔ ان کا اعتراف و اظہار کرنا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی عنایات میں اور اضافہ کرے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۔ اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کیجیے

(والضحیٰ ۱۱)

شکر کے طریقے

اظہارِ شکر کے تین طریقے ہیں (۱) قلبی (۲) قولی اور (۳) عملی

۱۔ قلبی شکر: اس سے مراد یہ ہے کہ محسن و منعمِ حقیقی خدا تعالیٰ کے احسانات و اکرامات کا اعتراف اور قدر شناسی کا جذبہ دل میں پیدا ہو۔ کیونکہ یہی احسان شناسی اور قدر کا احساس بالآخر اسے خدا تعالیٰ کی طرف مائل کر دیتا ہے۔

دل انسانی خواہشات و جذبات کا منبع ہے اور تمام اچھے برے خیالات و نیک و بد افعال اسی سے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے انسان کے قول و عمل میں اصلاح و درستی کے لئے ضروری ہے کہ دل میں خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف اور شکر گذاری کا جذبہ پیدا ہو۔ اس جذبے کی پرورش کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنی ذات اور کائنات پر غور و فکر کرے۔

(۱) خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو کامل طور پر سمجھ سکے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "ہم نے تمہیں ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کیا۔ تم نا سمجھ تھے تمہیں کان اور آنکھیں اور دل عطا کئے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ (النحل: ۷۸)

اس ارشاد باری تعالیٰ کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے عطا کردہ تمام قویٰ کان، آنکھیں دل وغیرہ درحقیقت اس کے انعامات بے پایاں ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان ان سے کام لے کر خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا کچھ احساس و ادراک کرے اور اس طرح منعم حقیقی کیلئے دل میں شکر گذاری کا جذبہ پیدا ہو۔

۲۔ قولی شکر: شکر گذاری کے دلی جذبات و احساسات کا الفاظ کی صورت میں اظہار قولی شکر کہلاتا ہے یعنی قولی شکر یہ ہے کہ انسان محسن و منعم حقیقی کے احسانات و اکرامات کا تذکرہ زبان سے حمد و ثنا کی صورت میں کرتا رہے۔ تاکہ دلی احساس کو تقویت حاصل ہو۔ زبان سے شکر ادا کرنے سے خدا تعالیٰ کی محبت و عقیدت دل میں جاگزین ہوتی ہے۔ جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ یوں بھی جس طرح ایمان کی تکمیل کے لئے دل کی تصدیق اور زبان کا اقرار دونوں لازمی ہیں بعینہٖ خدا کی نعمتوں کا شکر دل اور زبان دونوں سے ادا کرنا ضروری ہے اس لئے اگر قولی شکر سے گریز کیا جائے۔ تو قلبی شکر بھی بے سود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے خدا کی حمد و ثنا بیان کی اس نے شکر ادا کیا اور جس نے (اس کی نعمتوں کو) چھپایا اس نے کفر کیا۔

قولی شکر کا ایک طریقہ حمد باری تعالیٰ کا بیان ہے حمد کی فضیلت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود خدا تعالیٰ نے اپنے کلام پاک کا آغاز اپنی حمد سے کیا۔ پھر اسی کلام پاک میں متعدد مقامات پر مطالبہ کیا کہ انسان ہر لمحہ اور ہر گھڑی اپنے خدا کی حمد و ثنا بیان کرتا رہے جیسا کہ بیان فرمایا۔

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (طٰہٰ: ۱۳۰) اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا کی حمد شکر کا سرچشمہ ہے" ایک اور حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے "خدا کی حمد سے عمل کا ترازو بھر جاتا ہے"۔

۲۔ عملی شکر: عملی شکر گزاری کا طریقہ یہ ہے کہ انسان خدا کی عطا کردہ نعمتوں اور قوتوں کو اس کی منشاء اور رضا کے مطابق صحیح و مناسب طور پر استعمال کرے انہیں ضائع و برباد نہ کرے اور نہ ہی غلط جگہوں پر استعمال کرے کیونکہ یہ ناشکر گزاری ہو گی عملی شکر کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اس کی دو اقسام ہیں۔ (ا) جسمانی (ب) مالی

(ا) جسمانی شکر: خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ جسم عطا کیا ہے لہٰذا اس کی صحت و زیبائش کا خیال رکھنا، اسے ہر طرح کی بیماریوں سے بچانا اور اسے لباس پہنانا خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا جو نہایت لاغر ہو چکا تھا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا تم بہت خوش شکل تھے اب یہ صورت کیا ہوئی؟ عرض کیا روزوں نے یہ حال کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تم پر جان کا بھی حق ہے اس کو صحیح طور پر ادا کرو۔ اسی طرح جسم کو خدمت خلق عبادات اور نیک کاموں میں مصروف رکھنا اور اپنی تمام جسمانی قوتوں کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی انجام دہی میں صرف کرنا بھی شکر ہے جسمانی شکر جسم کے ایک ایک عضو سے ادا ہو سکتا ہے۔ دل کا شکر یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا فہم حاصل کرے، زبان کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار کرے اور اس کی حمد و ثنا بیان کرے، آنکھ کا شکر یہ ہے کہ مطالعہ کائنات کرے اور مخلوق خدا سے عبرت حاصل کرے، ہاتھ پاؤں کا شکر یہ ہے کہ خدمت خلق اور جہاد کا فریضہ انجام دے غرضیکہ تمام اعضائے جسمانی کو خدا کی منشاء و رضا کے مطابق مصروف عمل رکھنا جسمانی شکر ہے۔

(ب) مالی شکر: خدا تعالیٰ نے ہمیں جو مال و دولت عطا کیا ہے اسے اہل و عیال عزیز و اقارب، یتیموں و محتاجوں اور غریبوں اور دین و ملت پر خرچ کیا جائے۔ اسلام کی نگاہ میں خدا کی راہ میں خرچ کرنا نہ صرف شکر باری تعالیٰ ہے بلکہ قرض حسنہ بھی ہے۔ جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ کئی گنا دے گا، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث سے واضح ہوتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قیامت کے دن باری تعالیٰ فرمائے گا کہ اے انسان میں بیمار ہوا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔ بندہ کہے گا اے پروردگار تو تو سب جہانوں کا پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا تجھے علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا اور تو نے اس کی عیادت نہ کی۔ اگر تو اس کے پاس جاتا تو مجھے وہاں پاتا۔ پھر خدا تعالیٰ فرمائے گا اے انسان میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے نہ دیا وہ جواب دے گا کہ اے پروردگار تو تو سب جہانوں کا مالک ہے میں تجھے کیسے کھلاتا۔ خدا تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے علم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے نہ دیا۔ اگر تو اس کو کھلاتا تو وہ آج تو میرے پاس پاتا۔ پھر فرمائے گا اے انسان میں نے تجھ سے پانی مانگا اور تو نے نہ دیا۔ بندہ کہے گا کہ اے پروردگار تو تو سب جہانوں کا پروردگار ہے میں تجھے پانی کیسے پلاتا۔ پروردگار فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا اور تو نے نہ دیا اگر تو اس کو پلاتا تو آج وہ میرے پاس دیکھتا۔ (صحیح مسلم)

خدا تعالیٰ کے احسانات و انعامات کے اعتراف کا جہاں یہ تقاضا ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ احسان کیا جائے وہاں یہ بھی ہے کہ اس کے بندوں کے احسانات کا بھی شکریہ ادا کیا جائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ خدا کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔

ثمرات و فوائد

خدا تعالیٰ کی شکر گذاری کے مندرجہ ذیل فوائد و ثمرات ہیں۔

۱۔ رضائے باری تعالیٰ: خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے سے اس کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے جو سب سے قیمتی نعمت ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ — اور اگر تم شکر ادا کرو تو وہ تم سے راضی ہوگا۔

۲۔ دنیوی نعمتوں میں اضافہ: خدا تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے کرنے سے جسمانی و روحانی تمام قسم کی دنیوی و اخروی نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ — اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں زیادہ دونگا۔ (ابراھیم: ۷)

۳۔ آخرت میں درجات: شکر کے ادا کرنے والے کو اللہ تعالیٰ آخرت میں بلند درجوں سے نوازے گا، جیسا کہ فرمایا:

وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ۔ — اور ہم جلد ہی شکر ادا کرنے والوں کو جزا دیں گے۔ (آل عمران: ۱۴۵)

۴۔ کفارہ گناہ: شکر الہٰی کا ایک بڑا فائدہ گناہوں کا کفارہ ہے۔ شکر گذاری سے انسان کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کھانا کھائے اور پھر یہ کہے کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے یہ کھانا دیا بغیر میری تدبیر اور طاقت کے تو اس سے جو گناہ پہلے ہو چکے ہیں معاف ہو جائیں گے۔ (ابوداؤد)

صبر

صبر کے لغوی معنی روکنا، سہارنا اور باندھنا ہیں۔ لیکن اصطلاح شریعت میں صبر سے مراد

مفہوم:۔ مصیبت، سختی اور ایذاء کے وقت استقلال واستقامت اور جرات وبہادری کا ثبوت دینا اور اپنے نفس کو اضطراب وگھبراہٹ سے روکنا ہے۔ چنانچہ امام راغب کے نزدیک صبر کا مفہوم یہ ہے کہ عقل وشرع کے مطابق انسان اپنے نفس کو ان امور سے باز رکھے جن سے روکنے کا شریعت تقاضا کرتی ہے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر صبر کا لفظ مختلف مطالب کے اظہار کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن سب جگہ بنیادی مفہوم ایک ہی ہے یعنی استقلال واستقامت اور ثابت قدمی وپامردی

یہ بات ذہن نشین رہے کہ صبر میں ارادے کی مضبوطی کا ہونا اشد ضروری ہے بے کسی اور لاچاری میں کسی تکلیف ومصیبت کو برداشت کرلینا اور اپنے کو خوگر کرلینا ہرگز صبر نہیں ہے۔

قرآن حکیم میں صبر صحیح مفہوم کو اس طرح واضح کیا گیا ہے۔

"فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ"

(ال عمران: ۱۴۶)

اللہ کے راستے میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ ہوجائے اور انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ اور نہ ہی انہوں نے ہمت ہاری۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔

اس آیت میں صبر کی اصل حقیقت بیان کر دی گئی ہے۔ کہ انسان عملی زندگی میں پیش آنے والی مصیبتوں اور دشواریوں کے سامنے دل شکستہ نہ ہو۔ اور نہ ہی کم ہمتی کا اظہار کرے۔ بلکہ استقلال واستقامت سے برابر بڑھتا چلا جائے۔

قرآن حکیم میں صبر کے مندرجہ ذیل تقاضے بیان ہوئے ہیں۔

صبر کے تقاضے

(۱) مناسب وقت کا انتظار: زندگی میں مقاصد کے حصول کے حصول کے لئے مسلسل و پیہم تگ و دو اور مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی منزل کے حصول کے لئے صبر و استقامت کا اظہار کرے۔ اور مناسب وقت کا انتظار کرتا رہے۔ اس کی بہترین مثال آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہے۔ آپ جب منصب نبوت پر سرفراز ہوئے۔ اور تبلیغ اسلام کا آغاز کیا تو پورا عرب آپ کی مخالفت پر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف سے عداوت و دشمنی کے طوفان اٹھنے لگے اور دشمنان اسلام نے آپ اور آپ کے اصحاب کو طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دینا شروع کیں۔ قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آئیں۔ لیکن آپ اپنے مقصد پر ثابت قدمی سے قائم رہے اور اپنے مشن کو نہایت مستعدی سے جاری رکھا۔ مکی زندگی میں آپ کی کوشش پوری طرح بار آور نہ ہو سکیں اور بر اقتضائے بشریت کچھ اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پریشانی دور کرنے اور تسلی و تشفی دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (طور: ۴۸)

(اے نبی) اپنے پروردگار کے فیصلہ کے لئے ثابت قدمی سے منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ۔ (یونس: ۱۰۹)

(اے نبی) ثابت قدمی سے منتظر رہیئے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔

اسی قسم کی مشکلات و آزمائشیں پہلے انبیاء پر بھی آئیں۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف: ۳۵)

(پس اے نبی! آپ بھی اسی طرح ثابت قدم رہیئے جس طرح پختہ ارادے والے انبیاء ثابت قدم رہے۔

(ب) بے قراری سے اجتناب:- صبر کا ایک مقام یہ ہے کہ مصائب و مشکلات میں بے قراری اور بے چینی کا اظہار نہ کیا جائے۔ بلکہ ان مظالم و مصائب کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے۔ انہیں خدا تعالیٰ کی مصلحت پر محمول کیا جائے اور اسی ذات باری تعالیٰ سے بہتر نتائج کی امید رکھی جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایسے صابرین کی تعریف میں ارشاد ہوتا ہے:-

وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ اور جو مصائب ان پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر صابر ہیں

صبر جمیل جملہ انبیاء کا شیوا رہا۔ حضرت ایوب علیہ اسلام نے جس صبر و رضا کیساتھ مختلف قسم کی مالی و جسمانی مصیبتیں برداشت کیں۔ اس کی تعریف خود خدا تعالیٰ نے فرمائی ہے۔

إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا (ص: ۴۴) بے شک ہم نے ایوبؑ کو صابر پایا (ص: ۴۴)

حضرت یعقوب علیہ اسلام کو جب یہ خبر سنی کہ ان کے چہیتے بیٹے یوسف علیہ اسلام کو بھیڑیئے نے کھا لیا ہے۔ آپ نے صبر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ (یوسف: ۱۸) (میں تو صبر ہی کروں گا اور خدا سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ جو تم بیان کرتے ہو۔ (یوسف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ صبر جمیل کسے کہتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ وہ ایسا صبر ہے جس میں شکایت نہ ہو۔ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جس نے غم کا اظہار کیا اس نے صبر نہ کیا۔

(ج) مشکلات کو خاطر میں نہ لانا:- صبر کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے میں

جو مشکلات و مصائب اور رکاوٹیں درپیش ہوں انہیں خاطر میں نہ لایا جائے۔ دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس نے مشکلات سے گذرے بغیر کوئی بلند مقام حاصل کر لیا ہو۔ اس طرح کوئی بھی مصلح پیغمبر، حکمران اور سیاستدان ایسا نہیں جسے بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی ہو۔ اس لئے ان مشکلات کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے اور نہایت ہی صبر استقامت اور استقلال و پامردی سے مخالفین کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ (احقاف: ۳۵) (اے نبیؐ) آپ بھی اسی طرح ثابت قدم رہے جس طرح پختہ ارادے والے پیغمبر ثابت قدم رہے

تبلیغ اسلام کے راستے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کو جادوگر، شاعر اور کاہن کہا گیا۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، اور آپ پر پتھر پھینکے گئے، یہاں تک کہ آپ کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کی سازشیں کی گئیں، لیکن آپ ان سب مصائب و آلام کی پرواہ کئے بغیر تبلیغ حق پر گامزن رہے۔ اور آپ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیابی و کامرانی عطا کی۔

(د) عفو و درگذر:- صبر کا ایک تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کی زیادتی، غلطی اور برائی کو نظر انداز کر دیا جائے اور عفو و درگذر سے کام لیا جائے۔ یہ عفو و درگذر محض خدا تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے پیش نظر ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (شوریٰ: ۴۳) جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو یہ ایک پختہ عزم کی بات ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ (اور اگر تم سزا دو۔ تو اسی قدر جس قدر تمہیں تکلیف دی گئی۔ اور اگر صبر کرو۔ تو صبر کرنے

صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ۔ والوں کے لئے یہ بہتر ہے۔)
(نحل ۱۲۶)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں صبر کا یہ پہلو نہایت نمایاں ہے۔ یہود مدینہ نے بارہا آپ کی شان میں گستاخیاں کیں۔ لیکن آپ ہمیشہ صبر و تحمل سے کام لیتے رہے۔ اور درگزر کرتے رہے۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کیا، لیکن سب کو معاف کر دیا۔

(۵) استقلال و استقامت:۔ صبر کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ میدان جنگ میں دشمن کا نہایت جرأت مندی و بہادری سے مقابلہ کیا جائے اور استقامت اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا جائے۔ جو لوگ اس صفت سے متصف ہیں خدا تعالیٰ انہیں صادق القول اور متقین قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۲:۱۷۷) (اور مومن مصیبت تکلیف اور جنگ کے موقع پر صبر کرنے والے ہیں یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین عرب سے کئی معرکے پیش آئے جن میں وہ ہمیشہ مسلمانوں کے مقابلہ پر زیادہ مضبوط اور مسلح ہوتے تھے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور ہر معرکہ میں کامیاب ہوئے۔

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے "کہ جنگ کی تمنا نہ کرو۔ اور امن کے متمنی رہو لیکن اگر جنگ آپڑے تو ثابت قدم رہو۔ اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے"۔

اہمیت

صبر کی اہمیت مندرجہ ذیل دلائل سے واضح ہوتی ہے۔

۱۔ انسان کی تخلیق کا مقصد:۔ زندگی رنج و راحت اور غم و مسرت کا مجموعہ ہے۔ انسان پر حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ کبھی تنگی ہے تو

کبھی فراخی۔ کبھی غریب ہے تو کبھی امارت۔ کبھی بیماری ہے تو کبھی صحت۔ حالات کی اس گردش کا مقصد انسان کے صبر کا امتحان لینا ہے۔ تاکہ دیکھا جائے کہ کون تنگی، غربت، بیماری وغیرہ برے دنوں میں خدا تعالیٰ کو یاد رکھتا ہے اور اس کے احکام کو بجا لاتا ہے اور کون اس سے روگردانی اختیار کرتا ہے کون فراخی، امارت اور صحت کے موقع پر آپے سے باہر ہو کر فخر و غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور کون صبر و ثبات دکھاتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق ہی آزمائش کے لئے ہوئی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ (جانوں اور مالوں میں تمہاری آزمائش ہو گی) (النساء:)

چنانچہ اسلام نے اس آزمائش میں کامیابی کے حصول کا طریقہ صبر و ثبات اور ضبطِ نفس بتایا ہے۔ دراصل خدا تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کو بجا طور پر ادا کرنے اور اس کی نعمتوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے صبر کا دامن تھامے رکھنا اشد ضروری ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (صبر اور نماز سے استعانت حاصل کرو (۲: ۱۵۳)

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ صبر کا ایمان کے ساتھ وہی تعلق ہے جو سر کا جسم سے جس طرح سر کے بغیر جسم کا وجود ممکن نہیں اسی طرح صبر کے بغیر ایمان کا وجود بھی محال ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کی تمام زندگی صبر و آزمائش کا مرقع ہوتی ہے۔

صبر کی جس قدر اہمیت و ضرورت انفرادی زندگی میں ہے، اس سے کہیں زیادہ صبر اجتماعی زندگی میں اہم ہے، کوئی معاشرہ اس وقت تک نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اس کے افراد صبر و استقامت کے خوگر نہ ہوں۔

۲۔ قرآن پاک میں تاکید:۔ صبر ان فضائل اخلاق میں سے ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ تعریف کی ہے اور قرآن پاک میں متعدد مقامات

پر مین کی تلقین کی گئی ہے۔ صبر کا ذکر ستر سے زائد مقامات پر ہوا ہے اور مختلف انداز میں اس کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے انعامات و اکرامات کو صبر کی طرف منسوب کی ہے اور صبر کرنے والوں کو بلند مدارج و اعلیٰ مراتب کی خوشخبری دی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (یوسف: ۹۰)

(بے شک جو کوئی تقویٰ اختیار کرے اور صبر سے کام لے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرے گا)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا۔

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (نحل ۹۶)

(اور ہم ضرور صبر کرنے والوں کو ان کے اعمال کا بہترین اجر دیں گے۔)

علاوہ ازیں دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے صبر کی تاکید فرمائی جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۲: ۱۵۳)

(اور صبر اور نماز سے استقامت حاصل کرو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

۳۔ اسوۂ انبیاء:۔ جملہ انبیائے کرام صبر کی صفت سے متصف تھے۔ ان پر بڑی بڑی سخت آزمائشیں آئیں لیکن ان کی زبانوں سے کبھی بھی شکایت کا لفظ نہ نکلا بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے تمام مشکلات و مصائب کو برداشت کیا اور صبر ہی کی بدولت اپنے مقاصد و عزائم میں کامیاب ہوئے دراصل جتنا بھی کوئی عظیم پیغمبر ہوا اسے اتنا ہی صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑا۔

حضرت ایوب علیہ السلام اپنے مال و دولت، حشمت اور اولاد سے محروم کر دیئے گئے حتیٰ کہ صحت جیسی نعمت بھی ان سے چھین گئی مگر زبان پر شکوہ تک نہ آیا بلکہ یہی کہا "اے پروردگار! مجھے نقصان ضرور پہنچا ہے اور تو ہی سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

خود ایوبؑ کی مدح بیان فرمائی:۔

إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا (ص ۴۴) بیشک ہم نے ایوبؑ کو صابر پایا۔ (ص ۴۴)

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا۔ وطن اور خاندان کو خیرباد کہنا پڑا حتیٰ کہ بیٹے کی قربانی طلب کی گئی لیکن قطعاً گھبراہٹ اور جزع وفزع کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے جب اپنی قربانی کا حکم سنا تو فوراً کہا۔ اے ابا جان جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے وہ کر ڈالیے انشاءاللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے

حضرت یعقوبؑ کو جب خبر دی گئی کہ ان کے چہیتے بیٹے یوسف کو بھیڑیئے نے کھالیا ہے تو آپ نے "صبر جمیل" کا اظہار کیا جس کی شہادت خود قرآن پاک نے دی ہے۔

خود ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ہر پہلو صبر سے لبریز ہے۔ آپؐ نے یتیمی میں پرورش پائی۔ چالیس برس کی عمر میں منصب نبوت پر سرفراز ہوئے تو مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سوائے چند اصحاب کے جنہوں نے آپ کی آواز پر لبیک کہا سب دشمن ہو گئے آپ کے راستوں میں کانٹے بچھائے گئے۔ سر پر مٹی ڈالی گئی۔ طائف تشریف لے گئے تو پتھروں سے لہولہان کر دیا گیا لیکن آپؐ نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور کسی کے لئے بد دعا تک نہ کی۔ آپ کے خاندان والوں نے آپ سے معاشرتی مقاطعہ کیا اور شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہنا پڑا مگر زبان پر حرف شکایت نہ آیا۔ یہیں تک نہیں بلکہ آپؐ کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کی سازشیں کی گئیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود آپؐ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ اور آپ انتہائی صبر و استقامت اور استقلال و پامردی سے مصروف عمل رہے بالآخر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپؐ کو شاندار کامیابی عطا کی۔

صبر کے ثمرات وفوائد

صبر کے بیشمار فوائد ہیں جن میں سے چند اہم یہ ہیں:۔

۱۔ مصائب کے وقت قوت برداشت:

صبر سے انسان مشکلات و مصائب کا عادی ہو جاتا ہے تکلیف کا احساس نہیں

دیتا اور انسان ناساعد حالات کا دل جمعی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔

۲۔ گناہوں کا کفارہ:۔ صبر انسان کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اور صبر اختیار کرنے سے انسان کے پچھلے گناہ ختم کر دیئے جاتے ہیں اور اس کی خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن پر جب بھی سختی یا بیماری یا پریشانی یا رنج یا تکلیف یا غم آئے یہاں تک کہ اسے کانٹا بھی چبھے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کی کچھ خطائیں معاف کر دیتا ہے (بخاری و مسلم)

۳۔ خدا تعالیٰ کی معیت و محبت:۔ صبر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ صبر کرنے والا خدا تعالیٰ کے ہاں بڑی قدر و منزلت حاصل کر لیتا ہے۔ خدا تعالیٰ اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اسے باری تعالیٰ کی معیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (بقرہ ۱۵۳) بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

۴۔ اجر بے حساب:۔ اجر کے اعتبار سے کوئی بھی اخلاقی فضیلت صبر کے پلّہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کا اجر قطعاً ضائع نہیں کرتا بلکہ انہیں بے حد و حساب عطا کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (یوسف: ۹۰)	(بے شک جو کوئی تقویٰ اختیار کرے اور صبر سے کام لے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔)
وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا	(ہم صبر سے کام لینے والوں کا اجر ضرور

أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (النحل ۹۶)

ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے ۔

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ (زمر ۱۰)

صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا ۔

عفو

مفہوم: عفو کے معنی معاف کرنا، درگذر، نظر انداز کرنا اور انتقام نہ لینا ہے قرآن مجید میں اسے مغفرت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کریم کا بندے کے گناہ کی پردہ پوشی کرنا اور بخش دینا عفو کہلاتا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں عفو سے مراد دوسرں کی لغزش، زیادتی اور برائی کے بدلے میں قدرت اور اختیار رکھنے کے باوجود انتقام نہ لینا اور درگذر کرنا ہے۔

عفو کی حد: شریعت نے عفو کی ایک حد مقرر کی ہے اگر اس حد سے تجاوز کیا جائے تو یہ سخت نقصان دہ ہے اور عزتِ نفس اور خودی کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے اسلام دینِ اعتدال ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں میانہ روی کو پسند کرتا ہے اس لئے عفو میں اعتدال ہی کا حکم دیتا ہے چنانچہ اگر ایک طرف اسلام معافی اور چشم پوشی کی تعلیم دیتا ہے تو دوسری طرف عزت نفس اور خودداری کو برقرار رکھنے کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ اسلام عیسائیت کی اسس تعلیم کو کہ "اگر کوئی شخص تمہارے ایک رخسار پر تھپیڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کے سامنے پیش کر دو" قطعاً پسند نہیں کرتا ہے کیونکہ یہ غیر فطری ہے اور غلو پر مبنی ہے۔ بلکہ اگر عفو میں طاقت اور قوت کا جزو شامل نہ ہو وہ اسلام کے نزدیک محض بے بسی اور کمزوری ہے۔ کیونکہ آنحضور نے فرمایا "عفو صرف قادر ہونے کی صورت میں ہے"، اسلام نے عفو و درگذر کی ایسی تعلیم دی ہے۔ جس کے ساتھ انسانی خودداری کی شان بھی قائم رہے۔

عفو میں یہ امر مد نظر رہے کہ ایک آدمی کی عام لغزشیں اور خطائیں تو نظر انداز کی جا سکتی ہیں لیکن جب معاشرے میں فساد اور بگاڑ کا امکان ہو تو اس وقت کسی کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً قتل، ڈاکہ، زنا اور چوری وغیرہ کے مرتکب آدمی کو معاف نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس پر حد شرعی جاری ہو گی اور عدل و انصاف کو قائم کیا جائے گا کیونکہ انسانی حقوق کے تحفظ اور انسانی معاشرے سے فتنہ و فساد کے انسداد کے لئے ایسے افراد کو سزا دینا لازمی ہے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! "اچھی سیرت اور خصلت کے مسلمان سے اگر کبھی کوئی لغزش ہو جائے تو اس کو معاف کر دو سوائے حدود اللہ کے۔"

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آنحضور صلعم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کسی سے انتقام لیا ہو۔ لیکن جب لوگ حقوق اللہ میں دست درازی کرتے تو آپ انتہائی غضبناک ہو جاتے۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غضب اور غصہ شریعت کے تابع رہنا چاہیئے اور اگر عفو و درگذر سے دینی، اخلاقی یا معاشرتی اور اجتماعی حدود پہ ضرب لگتی ہو تو وہاں عفو سے کام لینا ہرگز درست نہیں بلکہ اسلام نے قصاص کو سرچشمہ حیات قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ" تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔ (بقرہ ۱۷۹)

عفو کا اصل مقصد مجرم کے دل میں ندامت کا شعور اور پشیمانی کا احساس پیدا کرنا ہے تاکہ وہ جذبہ عفو سے متاثر ہو کر آئندہ جرم نہ کرے۔ لیکن اگر عفو سے یہ غائیت حاصل نہ ہو بلکہ ایسا آدمی معاف کرنیوالے کو کمزور و بزدل خیال کرتے ہوئے سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مزید دلیر ہو جائے تو ایسے افراد کو معاف نہیں کرنا چاہیئے۔ مثلاً یہود مدینہ نبی کریم سے شدید دشمنی اور کینہ رکھتے تھے مگر آپ آخر وقت تک ان کے ساتھ درگذر اور رواداری سے پیش آتے رہے لیکن جب اس حسن سلوک اور مروت کے باوجود اہل یہود اپنے شر اور فساد میں بڑھتے ہی گئے تو آپ نے مجبور ہو کر انہیں ایسی سزائیں دیں جن کے وہ واقعی مستحق تھے۔

الغرض جہاں خودداری اور عزت نفس مجروح ہوتا ہو یا دینی و اخلاقی حدود پامال ہوتی ہوں یا معاشرتی اور اجتماعی زندگی پر زد پڑتی ہو۔ وہاں عفو جائز نہیں بصورت دیگر عفو کو اپنانے سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔

اہمیت وضرورت

عفو کی اہمیت و ضرورت کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں:۔

۱۔ **معاشرے کا امن واستحکام:۔** عفو معاشرے کے امن واستحکام کا ضامن ہے

اتحاد واتفاق، تعاون واشتراک اور الفت ومحبت کے جذبات ہر معاشرہ کی بنیاد اور جان ہوتے ہیں لیکن انسان خطا کا پتلا ہے ہر انسان سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور کون ہے جو خطاؤں سے مبرا ہے؟ اس لئے اگر ایک انسان دوسرے انسان کی خطاؤں اور لغزشوں سے چشم پوشی نہ کرے اور ہر چھوٹی بڑی غلطی پر انتقام لینے کے درپے ہو تو انتقام در انتقام کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے اور تمام دنیا کا امن وسکون ختم ہو کر فتنہ وفساد پھیل جائے۔ اسلام کے معنی امن کا پیغام ہے اس لئے دین اسلام اپنے پیرد کاروں سے تقاضا کرتا ہے وہ باہم عفو اور رواداری سے کام لیں تاکہ دنیا میں امن وامان کی فضا قائم رہے۔ چنانچہ آنحضور صلعم نے ارشاد فرمایا کہ "ایک دوسرے کو معاف کرو تمہارے باہمی کینے دور ہو جائیں گے"۔ عفو کی بدولت نہ صرف باہمی بغض وکینہ ہی دور ہوتا ہے بلکہ آپس میں باہمی ایثار اور قربانی کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔ باہمی الفت ومحبت کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ دشمن دوست بن جاتے ہیں اور معاشرے کو استحکام اور پائیداری نصیب ہوتی ہے۔

انسان کمزور وناتواں ہے کوئی شخص بھی حقوق اللہ تو درکنار، حقوق العباد بھی صحیح معنوں میں ادا نہیں کر سکتا۔ پوری کوشش کے باوجود اس کی ادائیگی میں کچھ نہ کچھ کوتاہی ضرور باقی رہ جاتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چھوٹے چھوٹے جرم اور معمولی خطاؤں کا مواخذہ کرے تو کوئی بھی سزا سے نہیں بچ سکتا اور اگر ہمارے اعمال کے بارے میں وہ کما حقہ، عدل وانصاف کرے اور جزا وسزا دے تو کوئی شخص بھی جنت کا امیدوار نہیں ہو سکتا، انسان کی اس کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے خداوند رحیم بندوں کی خطائیں معاف کرتا رہتا ہے اور چونکہ انسان اس کائنات

میں نائب خدا ہے۔ اور خدا نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاق ربانی میں رنگ لیں۔ لہٰذا ایک انسان کو اس دنیا میں دوسرے انسانوں سے عفو و بخشش سے کام لینا چاہیئے تاکہ آخرت میں خدا کی مغفرت کے مستحق ہو سکیں اسی بات کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔

"اور چاہیئے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے"

(نور۔ ۲۲)

درحقیقت عفو اور رواداری سے ہی کائنات میں رنگ و روپ ہے۔ اور معاشرے کے امن و امان، استحکام اور خوشحالی کا انحصار اس عفو پر ہے۔

۲۔ وسعت قلبی کا ذریعہ:- کینہ اور بغض انسانی زندگی کا منفی پہلو ہے انتقام لینے کے جذبہ سے انسان میں تنگ نظری اور تعصب پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ایک ایسا منفی جذبہ ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ بھلائی اور خیر سے روکتا ہے اس کے برعکس عفو اور رواداری مثبت پہلو ہے اور اس سے وسعت قلبی پیدا ہوتی ہے۔ ایثار و قربانی کا احساس انسان کے دل میں موجزن ہوتا ہے گویا۔ عفو فیاضانہ رویے کا سرچشمہ ہے جو حسن معاشرت کی جان ہے اس سے انسان میں بلند حوصلگی اور عالی ظرفی پیدا ہوتی ہے تنگ نظری اور تعصب کا خاتمہ ہوتا ہے جو ہمت کے بڑے کاموں میں سے ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۔ (شوریٰ ۴۳) جس نے صبر کیا اور معاف کیا تو بیشک یہ ہمت کے بڑے کاموں میں سے ہے۔"

۳۔ تبلیغ میں سہولت:- ایک مبلغ اور مصلح کو مخالفین سے طعن و تشنیع اور ناگوار باتیں سننی پڑتی ہیں غلط اور بے بنیاد الزامات اس پر لگائے جاتے ہیں زہریلا پروپیگنڈا اس کے خلاف کیا جاتا ہے۔ اس طرح اسے دعوت حق

میں بڑے ناخوشگوار اور ناساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لئے قوت برداشت تحمل اور عفو و درگذر کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ اگر اس میں عفو اور تحمل کی صفت نہ ہو تو وہ اپنے تبلیغی مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا، انبیاء کا عملی نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کی زندگی اس کی تصویر ہے۔ آپ کے کریمانہ اخلاق سے متاثر ہو کر کفار کی اکثریت حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔ اصل میں اسلام کی اشاعت میں مسلمانوں کے کردار کو بڑا دخل ہے اگر وہ اخلاق کریمانہ سے متصف ہوں تو دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں اور اسلام فوراً قبول کر لیتے ہیں جیسا کہ قرن اول میں جب کوئی ملک فتح ہوتا تو عفو عام کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور سب کو امان دیدی جاتی۔ غیر مسلم اس شان رحمت سے بہت متاثر ہوتے اور جوق در جوق اسلام میں داخل ہو جاتے تھے۔ تبلیغ اور اصلاح میں عفو تیر بہدف نسخہ ہے اور عفو کے ذریعہ تبدیلی اور انقلاب دلوں کا انقلاب ہو جاتا ہے جو دیرپا اور برقرار ہوتا ہے۔ اسی حکیمانہ تبلیغ کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ کیا ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ۔ (مومنون ۹۶)	"برائی کا دفاع ایسے طریق سے کریں جو بہترین ہو اور مخالفین جو کچھ تمہاری نسبت کہا کرتے ہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے"۔

۴۔ **صفت الٰہی :** عفو خدا تعالیٰ کی خصوصی اور امتیازی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے اختیار کرنے کی بار بار تاکید فرماتی ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ غَافِرٌ (بخشنے والا) غَفُوْرٌ (بخشنے والا) اور عَفُوٌّ (معاف کرنیوالا) کا قرآن حکیم میں ستر سے زائد مقامات پر ذکر ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ بالتکرار مختلف انداز میں اپنی عفو و بخشش کا اعلان کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا

(النساء: ۴۳) اور بخشنے والا ہے۔

۲- فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا بے شک خدا تعالیٰ معاف کرنے والا اور (النساء: ۱۴۹) قدرت رکھنے والا ہے۔

خدا تعالیٰ اپنی بندوں کی برائیوں سے صرف نظر کرتا ہے اور ان کی توبہ قبول کرتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّئَاتِ (شوریٰ ۲۵) اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ کا عفو و مغفرت بے حد و کنار ہے اگر کوئی شخص شدید برائی کا مرتکب ہو یہاں تک کہ [redacted] اپنے آپ پر بھی ظلم کر بیٹھے تو پھر بھی، اگر وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ اور بخشش مانگتا ہے تو خدا تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے جیسا کہ فرمایا:

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُورًا رَحِيمًا (النساء: ۱۱۰) "اور جو کوئی برائی کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا مہربان پائے گا"

اسی کی تاکید میں آنحضورؐ کا فرمان ہے "اگر کوئی شخص تمام روئے زمین کو اپنے گناہوں سے بھر کر بھی خدا سے معافی کا خواستگار ہو تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے"

قانون قصاص کی رو سے قاتل کی سزا موت ہے لیکن اس میں بھی ایک شق یہ موجود ہے کہ اگر مقتولین کے وارث قاتل کو معاف کر دیں یا خون بہا لے کر اس کی جان بخشی کر دیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ کسی جان پر ہاتھ صاف کرنے سے بڑا جرم اور کونسا ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں پر عفو کی اجازت دیدی ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

"جسے معاف کر دیا جائے کچھ بھی اپنے بھائی کی جانب سے تو مطالبہ کرنا چاہیئے اچھے انداز میں، یہ ایک رعایت اور رحمت ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے"

یہاں ایک اور نکتہ توجہ کے قابل ہے۔ قاتل اور مقتول کے ورثاء کو شدید دشمنی کے باوجود رشتہ اخوت سے جدا نہیں کیا شاید معاف کرنے والا۔ اسی اخوت کے تحت معاف کر دے۔

۵ **اسوۂ رسولؐ :-** حضرت نبی کریمؐ عفو و کرم کا مجسمہ تھے اور آپ کی پاک ذات عفو و بردباری کا اعلیٰ نمونہ ہے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے حبیب کبریا صلعم کو اس امر کی تلقین کی۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (الاعراف : ۱۹۹) "اے نبی! عفو کو اپنایئے اور نیکی کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کیجئے۔"

ایک دوسری جگہ فرمایا :۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (اے نبیؐ) لوگوں سے درگذر کیجئے اور ان کے لئے بخشش مانگئے۔

ان آیات مبارکہ میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ آنحضورؐ کو دعوت حق میں جاہل گنواروں سے واسطہ پڑے گا۔ اسی لئے آپ صلعم کو ان لوگوں کی جہالت اور گنوارپن سے درگذر کرتے ہوئے انہیں نیکی کی تلقین کرنا ہو گی۔ چنانچہ آپؐ نے اپنی زندگی سے اس کا عملی نمونہ پیش کر دیا۔

جب آنحضورؐ نے اپنے مشن کا آغاز کیا اور لوگوں کو دین اسلام کی طرف بلایا تو مشرکین مکہ نے آپ پر شدید مظالم ڈھائے اور آپ کو طرح طرح کی اذیتیں دیں لیکن رحمت دو عالمؐ نے نہ صرف دشمنان اسلام کے لیے بددعا کرنے سے احتراز کیا بلکہ کمال عفو سے بارگاہ الٰہی میں ان کی ہدایت و فلاح کی دعا فرمائی :۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ وہ نہیں جانتی۔

دعوت و ارشاد کے ابتدائی دور میں جب آپ اہل مکہ کی ہٹ دھرمی سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا چاہی تو انہوں نے آپ کی شدید مخالفت کی، آپ کو ایذا دینے کے لئے بدمعاش غنڈے پیچھے لگا دیئے جو آپ پر پتھر پھینکتے تھے چنانچہ آپ لہولہان ہو کر وہاں سے جان بچا کر نکلے۔ اس موقع پر حضرت جبرائیلؑ حاضر

خدمت ہوئے اور عرض کی۔ اگر آپ حکم دیں تو طائف کی بستی کو تہ و بالا کر دوں۔ آپ نے کمال عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے فرمایا "نہیں، ہو سکتا ہے کہ ان کی نسل سے اہل ایمان اٹھیں" اور ایسا ہی ہوا۔

مدنی زندگی میں اہل یہود نے آپؐ کے خلاف بہت سازشیں کیں اور بارہا آپؐ کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کے ناپاک منصوبے بنائے۔ یہودی قبیلہ بنو نضیر نے آپؐ پر پتھر گرا کر شہید کرنے کی سازش کی، اور خیبر کی ایک یہودیہ نے آپ کو کھانے میں زہر ملا کر کھلا دیا لیکن آپ ہر بار انہیں معاف کرتے رہے اور صرف اس وقت انہیں قرار واقعی سزائیں دیں جب ان کی ریشہ دوانیاں حد سے بڑھ گئیں اور پانی سر سے گزر گیا۔

صلح حدیبیہ کے موقعہ پر ایک روز رسول اللہ صلعم مسلمانوں کے ساتھ صبح کی نماز ادا فرما رہے تھے کہ دشمن کے ستر آدمی اچانک حملہ آور ہوئے لیکن سب گرفتار کر لئے گئے اور آنحضور صلعم نے بغیر کسی جزیہ یا سزا کے سب کو از راہ عفو و کرم رہا کر دیا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر تو آپؐ نے عفو کی ایک ایسی تابناک مثال قائم کر دی جس کی نظیر پوری تاریخ انسانی میں ملنا ناممکن ہے ہے آپؐ مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور آپؐ کو اپنے جانی اور دیرینہ دشمنوں اور مخالفین اسلام پر مکمل غلبہ حاصل ہوا دنیا کا کوئی قانون، کوئی ضابطہ اخلاق آپ کو ان لوگوں سے اپنی اذیتوں اور تکلیفوں کا پورا پورا بدلہ لینے سے مانع نہیں تھا۔ لیکن آپ نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور فرمایا!

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ جاؤ تم آزاد ہو۔ آج کے دن تم پر کوئی سرزنش نہیں اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے۔

حتیٰ کہ ابو سفیان جو اسلام کا دشمن نمبر ایک تھا نہ صرف معاف کر دیا گیا بلکہ اس کے گھر کو دارالامان قرار دیا گیا، اسی طرح اس کی بیوی ہندہ جس نے غزوہ اُحد میں آپ کے محبوب چچا حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا کو بھی کچھ نہ کہا گیا۔

آپؐ کی ذاتی زندگی میں عفو و درگزر کی مثالیں بے شمار ہیں لیکن ایک واقعہ کا تذکرہ ضروری ہے

ایک مرتبہ حضور صلعم اپنی تلوار درخت پر لٹکائے وہیں سو رہے تھے کہ ایک کافر آیا، تلوار سونت کر آپ کو جگایا اور کہنے لگا۔ "اے محمدؐ! بتاؤ اب میرے ہاتھ سے آپ کو کون بچائیگا" آپ نے بلا خوف فرمایا "اللہ" یہ سنتے ہی تلوار اس کافر کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آنحضور صلعم نے تلوار اٹھائی اور فرمایا بتاؤ اب تجھے کون بچائیگا، وہ حیران رہ گیا تاہم آپ نے اس سے انتقام نہ لیا اور معاف کر دیا۔

الغرض آپ کی سیرتؐ کا یہ پہلو بڑا نمایاں اور تابناک ہے کہ آپؐ نے اپنے بدترین دشمنوں اور شدید ترین مخالفوں کو بھی معاف کر دیا جس کی نظیر دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا فاتح اور عظیم سے عظیم رہنما بھی پیش نہیں کر سکتا حتیٰ کہ قریش آپ کو (نعوذ باللہ) گالیاں دیتے اور برُا بھلا کہتے تھے ضد کی بنا پر آپ کو محمدؐ (تعریف کیا گیا) کی بجائے "مذمم" (مذمت کیا گیا) کہتے تھے لیکن آنحضورؐ اپنے دوستوں کو فرماتے کہ "تمہیں تعجب نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیسے پھیرتا ہے! وہ مذمم کو گالیاں دیتے اور مذمم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمد ہوں" (مشکوٰۃ) واقعی رحمتہ للعالمین ہی ایسا کر سکتے ہیں۔

۶۔ ارشادات نبویؐ: رحم دلی کی جڑ سے جو شاخیں پھوٹتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنے مجرم اور قصور وار کو معاف کر دیا جائے، اور اس سے انتقام نہ لیا جائے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف خود ہی عفو پر عمل کیا بلکہ صحابہ کرامؓ کو اس کے اختیار کرنے کی تلقین فرمائی اور اپنی امت کو اس کی خاص ترغیب دی ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ عفو و درگذر کرنے والوں کی عزت میں اضافہ کرتا ہے (صحیح بخاری)

۲۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا "پہلوان وہ نہیں جو دوسروں کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔ (مسلم)

۳۔ ایک شخص نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں اپنے خادم کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں۔ آپ نے فرمایا ہر روز ستر مرتبہ (ترمذی)

حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ معاف کرنا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی حد مقرر کی جائے، بلکہ حسن اخلاق اور رحم کا تقاضا یہ ہے کہ اگر بالفرض وہ روزانہ ستر دفعہ بھی قصور کرے تو اس کو معاف ہی کر دیا جائے۔ ستر کا عدد ایسے موقعوں پر تحدید کے لئے نہیں ہوتا بلکہ صرف تکثیر کے لئے ہوتا ہے اور خاص کر اس حدیث میں یہ ثابت بہت واضح ہے۔

۴۔ "مجھے میرے رب نے نو باتوں کا خاص طور سے حکم فرمایا ہے۔ اور اُن میں ایک بات آپؐ نے یہ فرمائی کہ مجھے حکم ہے کہ جو کوئی مجھ پر ظلم و زیادتی کرے میں اس کو معاف کر دیا کروں"

(صحیح بخاری)

۵۔ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا "پروردگارا! آپ کے بندوں میں کون آپ کی بارگاہ میں زیادہ باعزت ہے! ارشاد فرمایا! وہ بندہ جو (قصوروار پر) قابو پانے کے بعد (اور سزا دینے کی قدرت کے باوجود) اس کو معاف کر دے"

(شعب الایمان للبیہقی)

یہاں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ قصوروار کو معاف کرنے کی اس فضیلت کا تعلق افراد واشخاص اور ان کے ذاتی اور نجی حقوق و معاملات سے ہے لیکن جو جرائم اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر سزائیں مقرر ہیں، اس سزا کو معاف کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے ــــ خود رسول اللہؐ جو دنیا میں سب سے زیادہ رحم دل تھے، آپ کا طرز عمل بھی یہی تھا کہ اپنا قصور کرنے والوں کو ہمیشہ معاف فرما دیتے تھے لیکن اللہ کی حدود کو توڑنے والوں کو اللہ کے حکم کے مطابق سزا دیتے تھے۔

۶۔ ایک شخص نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ "مجھ کو کچھ وصیت فرمائیے۔ آپ صلعم نے فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ اس شخص نے بار بار دہرایا مگر آپ نے پھر فرمایا "غصہ نہ کیا کر" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "مسلمانوں کا افضل ترین اخلاق عفو ہے"

۷۔ **صفت مومنین :** خدا تعالیٰ خود اپنے بندوں کی خطائیں معاف کرتا ہے لغزشوں سے درگذر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ

اس کے بندے بھی آپس میں عفو و درگذر سے کام لیں چنانچہ قرآن پاک میں حکم ہے۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا (البقرہ ۲) ۱۵۹) پس معاف کر دیا کرو اور درگذر کرتے رہا کرو

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:۔

قُلْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (جاثیہ ۱۴) (اے نبی ؐ) اہل ایمان سے کہہ دو کہ ان لوگوں کو جو خدا کے جزا و سزا کے دنوں کے امیدوار نہیں معاف کر دیا کریں۔

خدا تعالیٰ نے عفو و درگذر اختیار کرنے والے کی بہت تعریف فرمائی ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۔ اور جو صبر کرے اور معاف کر دے تو یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

غصہ کی حالت میں اپنے جذبات پر قابو پانا اور قوت و طاقت کے باوجود دوسرے کو معاف کر دینا بہت بڑی اخلاقی جرأت ہے اس لئے قرآن پاک میں جہاں مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں وہاں عفو کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (شوریٰ ۳۷) جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران ۱۳۴) ۔ وہ غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔

امام غزالی ؒ نے اس آیت کی تفسیر میں ایک لطیف نکتہ یہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غصہ کو مٹانے والے کی تعریف نہیں کی ہے بلکہ غصہ کو پی جانے والے اور دبانے والے کی تعریف فرمائی ہے اس آیت کی تشریح میں ذیل کا واقعہ بڑا اموزوں ہے۔

سید الشہدا حضرت امام حسین ؓ کا ایک غلام تھا۔ ایک دن وہ وضو کے لئے پانی لایا جب آپ وضو کر چکے اور غلام نے کوزہ اٹھایا تو اتفاق سے کوزہ حضرت امام حسین ؓ کے چہرہ مبارک سے ٹکرا گیا جس سے آپ کے ایک دانت کو تکلیف پہنچی آپ نے غلام پر نگاہ ڈالی اس پر غلام نے

کہا ــــ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (اور غصہ پی جانے والے) حضرت امام حسین رضؓ نے فرمایا "میں نے اپنا غصہ فرو کر دیا" غلام نے کہا۔ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (لوگوں سے درگذر کرنے والے) اس پر حضرت امام حسین رضؓ نے فرمایا "میں نے تجھے معاف کر دیا" غلام نے پھر کہا ــــــــ
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) اس پر حضرت امام حسین رضؓ نے فرمایا "تم آزاد ہو جا سکتے ہو" اس پر غلام نے عرض کیا "میری آزادی کا پروانہ؟" امام حسین رضؓ نے فرمایا "تلوار اور ڈھال دیتا ہوں اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں"

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اپنے خالہ زاد بھائی مسطح کی مالی امداد کیا کرتے تھے جب مسطح نے آپ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت عائشہ پر تہمت لگانے میں حصہ لیا تو آپ نے اس کی مالی امداد بند کر دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت نازل ہوئی۔

"اور چاہیئے اور وہ معاف کر دیں اور درگذر کر دیں۔ (اے مسلمانو!) کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے" (النور۔ ۳)

یہ آیت سنتے ہی صدیق اکبر رضؓ نے بے ساختہ کہا "ہاں میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت کرے" اس کے بعد انہوں نے پھر مالی امداد شروع کر دی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کی خلافت کے زمانے میں کوفہ کے عامل عبدالحمید بن عبدالرحمان نے انہیں لکھا کہ میرے اجلاس میں ایک شخص اس جرم میں پیش کیا گیا ہے کہ وہ آپ کو گالیاں دیتا ہے۔ میں نے اس کی گردن اڑا دینی چاہی لیکن اس خیال سے قید کر دیا کہ اس بارے میں میں آپ کی رائے لے لوں۔ آپ نے جواب لکھا!

اگر تم اس کو قتل کر دیتے تو میں تم سے قصاص لیتا کیونکہ رسول اللہ کے سوا کسی اور کو گالی دینے پر کوئی شخص واجب القتل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر تمہارا دل چاہے تو اس کو گالی دے دو ورنہ رہا کر دو"

اصحاب رسولؐ اور غلامان محمدؐ نے دنیا کے سامنے عفو و درگذر کی درخشاں مثالیں قائم کیں ہیں۔

ثمرات و فوائد

عفو و درگذر اپنانے سے متعدد فوائد حاصل ہوتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ معاشرہ کی سالمیت: عفو سے معاشرہ کی سالمیت اور استحکام برقرار رہتا ہے۔ انسانی معاشرے میں امن و سکون پیدا ہوتا ہے۔ باہمی حسد و عناد اور بغض و عداوت کی فضا ختم ہو جاتی ہے اور باہمی خلوص و محبت اور الفت و یگانگت کے جذبات نشو و نما پاتے ہیں قومی اتحاد استوار ہوتا ہے اور معاشرے کا ماحول پر امن اور خوشگوار ہو جاتا ہے۔ آنحضورؐ کا ارشاد گرامی ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کو معاف کر دیا کرو تمہارے باہمی کینے دور ہو جائیں گے۔"

۲۔ اشاعت اسلام: اسلام کی اشاعت اور توسیع میں عفو کو نمایاں اہمیت حاصل ہے کیونکہ دشمنان اسلام جس قدر اس صفت سے متاثر ہوتے ہیں کسی اور چیز سے نہیں ہوتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انبیاء کے مشن کو سب سے زیادہ عفو ہی کی بدولت کامیابی نصیب ہوئی۔ خود آنحضورؐ کی نمایاں کامیابی اور اسلام کی اشاعت کا ایک راز یہ بھی تھا چنانچہ تمام غزوات نبویؐ سے اتنے مسلمان حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے جتنے صرف فتح مکہ پر آپ کے عفو عام کی بدولت ہوئے صرف ایک دن میں تمام مکہ جو سالہا سال سے اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی کوئی ملک مسلمان فتح کرتے تو عفو کا اعلان کر دیتے جس کا فوری نتیجہ یہ ہوتا کہ اکثر غیر مسلم اسلام قبول کر لیتے۔ اس طرح عفو کی بدولت اسلام کو بہت فروغ ہوا اور اب بھی یہ وصف تبلیغ اسلام میں مدد ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عفو کے ہتھیار سے بڑے جابر اور سرکش مطیع ہو جاتے ہیں اور عفو کا اثر

براہ راست انسانوں کے دلوں پر ہوتا ہے اور دل کی تبدیلی انقلاب عظیم کا باعث ہوتی ہے۔

۳۔ خدا کی رضا و مغفرت :۔ عفو و بخشش خدا تعالیٰ کی پسندیدہ صفت ہے۔ عفو کے اپنانے والوں کو بھی محبوب رکھتا ہے۔ اور ان کے گناہوں کو مٹا کر عفو و مغفرت عطا کرتا ہے چنانچہ عفو و درگزر سے کام لینے والے خدا کی رضا و مغفرت حاصل کر لیتے ہیں۔

۴۔ غم و غصہ کا علاج :۔ سکون کی حالت میں معاف کر دینا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہوتا لیکن غیظ و غضب کی حالت میں عفو کو اپنانا بہت مشکل ہے غصہ سے مغلوب ہونا ایک اعصابی مرض ہے آج کل ماہر نفسیات، غیظ و غضب کے مقابلہ میں نرمی اور سکون کی تلقین کرتے ہیں لیکن نبی اکرم نے آج سے چودہ سو سال قبل اس کا علاج بتا دیا تھا۔ فرمایا "غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے اس لئے جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کر لے۔"

ایک دفعہ ایک اعرابی نے دربار رسالت میں آ کر عرض کیا "یا رسول اللہ مجھے وہ بات بتائیے جس کے کرنے سے مجھے جنت مل جائے حضورؐ نے اسے چند باتوں کی تلقین کی منجملہ ان کے فرمایا ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایت و بخشش کی بارش کرو۔"

۵۔ دیگر فضائل اخلاق :۔

عفو اور بخشش سے، انسان میں عزم و حوصلہ، شرف و کمال، تحمل و بردباری اور ایثار و قربانی جیسے دیگر فضائل اخلاق تربیت پاتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری ہے "اور جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔"

مختصر یہ کہ عفو قلبی عبادات میں اعلیٰ ترین عبادت ہے جسے اپنانے کا خدا تعالےٰ نے حکم دیا ہے۔ یہ وصف رسولِ اکرم ؐ میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ صحابہ کرام رضؓ اور بزرگانِ دین کا بھی یہ شعار رہا ہے۔ اس سے دین و دنیا کے متعدد فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اسلام جن اوصافِ حمیدہ کو اپنے پیروکاروں میں نمایاں دیکھنا چاہتا ہے۔ ان میں ایک وصف عفو بھی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی کچھ حدود ہیں جن کے اندر رہی اس کا استعمال ہو تو انسان کی شخصیت نکھرتی اور اس میں حسن و کشش پیدا ہوتی ہے۔

عدل

مفہوم: عدل کے لغوی معنی سیدھا کرنا، برابر تقسیم کرنا، مساوات قائم کرنا اور توازن تناسب پیدا کرنا ہیں۔ قرآن حکیم میں عدل کیلئے لفظ قسط بھی استعمال ہوا ہے جس کے معنی انصاف اور برابر کا کے ہیں۔ لیکن اصطلاح شریعت میں عدل سے مراد ہر چیز کو اس کے صحیح موقع و محل میں رکھنا اور زندگی کے ہر شعبہ میں توازن و تناسب قائم کرنا ہے۔ چنانچہ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ عدل کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔ "وہ کسی چیز کو اس کے صحیح موقع و محل میں رکھنا عدل ہے۔ اور اس کی ضد ظلم ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا ہے۔ جو اس کے لائق نہ ہو"۔ اس تعریف کے لحاظ سے اچھائی یا برائی دونوں کا برابر کا بدلہ عدل کہلائیگا لیکن اچھائی کا زیادہ بدلہ "احسان" اور برائی کا زیادہ بدلہ "ظلم" ہوگا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ عدل سے مراد محض انصاف اور مساوات نہیں اگرچہ بعض حیثیتوں سے تو عدل مساوات کا ہی دوسرا نام ہے۔ مثلاً حقوق شہریت مگر بعض حیثیتوں سے مساوات عدل کے بالکل منافی ہے۔ مثلاً اعلیٰ درجہ اور کمتر درجہ کی خدمات انجام دینے والوں کے معاوضے۔ جن میں مساوات کو مدنظر رکھا جائے تو عدل کو نقصان پہنچتا ہے۔ حقیقت عدل سے مراد زندگی کے تمام شعبوں انفرادی، اجتماعی، معاشرتی، معاشی، عدالتی و سیاسی وغیرہ میں حقوق کی متوازن و متناسب تقسیم ہے۔

اہمیت

عدل کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جاتا ہے:۔

۱۔ تقاضائے فطرت:۔ عدل فطرت کا تقاضا ہے اور کائنات کا سارا نظام اسی پر قائم ہے۔ کارخانہ کائنات کے تمام اجزا متوازن و متناسب ہیں۔ اگر ان میں ذرا سا بھی عدم توازن پیدا ہو جائے تو نظام عالم کا شیرازہ منتشر ہو جائے۔ مثلاً نظام شمسی عدل کے اصول پر قائم ہے۔ اجرام فلکی معلق اپنے دائروں میں خاص رفتار سے گردش کر رہے ہیں اگر ایک سیارہ دوسرے کے دائرہ عمل میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اسی طرح انسانی جسم بھی عدل ہی کا مرہون منت ہے۔ کیونکہ جب انسانی اعضا و قویٰ میں توازن و تناسب نہیں رہتا۔ تو صحت بگڑ جاتی ہے اور انسان بیمار ہو جاتا ہے۔

دراصل عدل کا مقصد انسان کو افراط و تفریط سے بچا کر زندگی کے صحیح و معتدل راستے پر گامزن کرنا ہے۔ عدل

کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے اپنے دین پر چلنے والوں کو "امت وسط" یعنی اعتدال کی امت قرار دیا ہے۔

۲۔ قرآن پاک میں تاکید:۔ عدل سب سے پہلے خود خدا تعالیٰ کی صفت ہے۔ اور اس کے اسماء الحسنیٰ میں ایک نام عادل بھی ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو بھی عدل اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل: ۹۰) بیشک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

عدل صرف انتظام سلطنت کیلئے ہی درکار نہیں، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسکا اختیار کرنا لازمی ہے۔ اس لیئے قرآن پاک میں زندگی کے ہر پہلو میں اسے اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے

۳۔ اسوۂ رسولؐ:۔ خدا تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عدل اختیار کرنے کی تاکید کی ہے جیسا کہ فرمایا۔

وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ (اے نبیؐ کہہ دیجئے کہ) مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔ (شوریٰ: ۱۵)

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اس ارشاد خداوندی پر عمل کیا۔ اور امیر و غریب، عربی و عجمی، غلام و آزاد اور مسلم و کافر کسی قسم کا امتیاز کبھی ملحوظ نہ رکھا۔ بلکہ ہر شخص کو اس کا صحیح حق دلوایا۔

آپؐ نے منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد ہی صفت اختیار نہیں کی بلکہ ابتدا سے آپؐ پیکر عدل و انصاف تھے۔ اور آپؐ کے دشمنوں کو بھی ہمیشہ آپؐ کے عدل پر اعتماد رہا۔ چنانچہ مشرکین مکہ اپنے جھگڑے آپؐ کے پاس فیصلہ کیلئے لاتے تھے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر نو میں حجر اسود کے نصب کرنے پر قبائل قریش میں نزاع پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ تلواریں سونت لی گئیں۔ بالآخر معاملہ آپؐ کے پاس لایا گیا۔ اور آپؐ نے نہایت خوش اسلوبی سے یہ جھگڑا طے کرا دیا۔

ہجرت کے بعد یہود مدینہ نے میثاق مدینہ قبول کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختلافی معاملات کیلئے "حکم" تسلیم کیا اور آپؐ کے عدل پر پورا پورا اعتماد ظاہر کیا۔ یہود اگرچہ آپؐ کے سخت ترین دشمن تھے۔ لیکن اپنے مقدمات آپؐ ہی کے پاس فیصلہ کیلئے لاتے تھے۔ آپؐ بھی ہمیشہ حق بات پر فیصلہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مسلمان اور ایک یہودی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے دونوں کی باتیں سن کر فیصلہ یہودی کے حق میں دیا۔

غرض، [illegible] میں عدل و انصاف کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ جن میں سے بعض درج ذیل ہیں۔

ایک مرتبہ بنی مخزوم کے معزز گھرانے کی ایک عورت نے چوری کی۔ مقدمہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا۔ قریش نے محسوس کیا کہ اگر اس عورت کو سزا مل گئی تو ان پر حرف آئیگا۔ چنانچہ انہوں نے آپؐ کے غلام زادے حضرت اسامہ بن زیدؓ کے ذریعہ سفارش کرائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو اسامہؓ پر سخت خفا ہوئے۔ اور فرمایا۔ تم سے قبل بنی اسرائیل اسی وجہ سے برباد ہوئے کہ وہ بارسوخ آدمیوں کے معاملات میں نرمی برتتے تھے۔ اور غرباء کے معاملوں میں سختی کرکے انہیں سزا دیتے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا خدا کی قسم! اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا۔ چنانچہ آپؐ کے حکم کے مطابق اس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

غزوہ بدر میں کفار مکہ کے بہت سے قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں آپؐ کے چچا حضرت عباس بھی تھے۔ آپؐ نے سب قیدیوں کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھنے کا حکم دیا۔ عدل و انصاف کے پیش نظر اپنے چچا سے بھی کوئی رعایت نہ کی۔ اسی طرح جب ان قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کرنے کا فیصلہ ہوا تو مسلمانوں نے حضرت عباس کے فدیہ میں کمی کرنا چاہی مگر آپؐ نے انکار کر دیا۔ اور ایک درہم بھی کم نہ کیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بھی قیام عدل پر بہت زور دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ قیامت کے دن امام عادل پر خدا کا سایہ ہوگا۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا۔ کہ قیامت کے دن امام عادل کا درجہ سب سے بلند ہوگا۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے روز جب خدا کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ اس روز سات اشخاص کو خدا تعالیٰ اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا۔ ان میں ایک امام عادل ہوگا۔ نیز آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ حاکم عادل کی دعا قبول ہوتی ہے۔ ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ کہ مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے۔ کہ رضا اور ناراضگی دونوں حالتوں میں کلمۂ عدل کہوں۔ ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ ایزدی میں دعا کیا کرتے تھے۔ کہ اے اللہ! مجھے فقر و غنا دونوں حالتوں میں اعتدال عطا کر۔

عدل کے شعبے:

عدل کے دو بڑے شعبے ہیں۔ انفرادی عدل اور اجتماعی عدل

۱۔ انفرادی عدل یا اپنے نفس کیساتھ عدل:

اپنے نفس سے اعتدال کے ساتھ کام لینا اور اسے غیر معمولی سہل انگاری یا تکلیف میں مبتلا نہ کرنا انفرادی عدل کہلاتا ہے۔ روزمرہ کے امور، کھانا، پینا، پہننا اوڑھنا، سونا اور عبادات و معاملات وغیرہ میں اعتدال قائم رکھنا زندگی میں حصول کامیابی کیلئے لازمی ہے۔ اس کے بغیر نہ تو جسمانی صحت برقرار رہ سکتی ہے۔ نہ روحانی ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی زندگی کے کسی شعبے میں

کامرانی حاصل ہو سکتی ہے ، بلکہ اعتدال کے بغیر انسان روحانی و جسمانی امراض میں مبتلا ہو کر ہر لحظہ تنزل کی طرف مائل ہوتا رہتا ہے۔

اسلام دین اعتدال ہے ۔ اور دین و دنیا میں مکمل توازن و تناسب قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے ۔ اسلام نہ تو یہ پسند کرتا ہے ۔ کہ انسان دنیا کے سب کام کاج چھوڑ کر ہر وقت عبادت الٰہی میں مصروف ہو جائے اور رہبانیت اختیار کرلے اور نہ ہی اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ انسان خدا کو بالکل ہی بھلا کر دنیا و ما فیہا میں کھو کر اسی کو ہی مقصد زندگی سمجھ لے بلکہ اسلام روح و مادہ میں مکمل اعتدال و توازن کا تقاضا کرتا ہے ۔

انفرادی عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اپنی تمام عادات و اخلاق میں اعتدال کا راستہ اختیار کرے تاکہ صحیح معنوں میں فضائل اخلاق کو اپنا سکے ۔ کیونکہ اخلاق کے کسی شعبہ میں بھی اعتدال کے بغیر کمال حاصل نہیں ہو سکتا ۔ گزران کے معاملہ میں بے جا خرچ کرنا اسراف ہے ۔ اور ضرورت سے کم خرچ کرنا بخل ہے ۔ اور ان دونوں کے درمیان اعتدال سے رہنا خوبی ہے ۔ جسے سخاوت کہتے ہیں ۔ اسی وجہ سے اسلام نے خورد و نوش اور لباس و رہائش میں اعتدال ہی پسند کیا ہے ۔ لوگوں کے ساتھ میل جول میں غرور اختیار کرنا تکبر کہلاتا ہے ۔ اور احساس کمتری دکھانا ذلت ہے ۔ اور یہ دونوں ہی پسندیدہ نہیں ، بلکہ انہیں میانہ روی یعنی حلم ہی عمدہ صفت ہے ۔ اسی طرح دشمن سے مقابلہ کے وقت بھاگ نکلنا بزدلی ہے ، اور جان کو عمداً ہلاک کرنا دیوانگی ہے بلکہ ان کے درمیان فضائل اخلاق شجاعت ہے ۔

ب ۔ اجتماعی یا جماعتی عدل : اجتماعی یا جماعتی عدل کو مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

(۱) عائلی زندگی میں عدل : ۔ عدل و انصاف کی ابتدا عائلی زندگی سے ہوتی ہے ۔ وہ گھر انہ جنت کا نمونہ ہوتا ہے ۔ جس میں خاوند و بیوی اور والدین و اولاد ایک دوسرے کے باہمی حقوق عدل و انصاف سے ادا کرتے ہوں ۔ عدل کی سب سے زیادہ ضرورت اس شخص کو ہوتی ہے ۔ جس کی ایک سے زائد بیویاں ہوں ، کیونکہ جب وہ ایک بیوی اور اس کے بچوں کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ دے گا ۔ تو لازماً دوسری بیوی اور اس کے بچوں کے حقوق کی نگہداشت نہ ہو سکے گی ۔ اس طرح خاندان میں انتشار پیدا ہو گا جس سے اس کی بیویاں ، بچے اور بالآخر وہ خود بھی متاثر ہو گا ۔ تمام گھرانے کا امن و سکون مفقود ہو جائیگا ۔ بیویوں اور بچوں کی زندگی تباہ ہو کر رہ جائے گی اور اس شخص کا اپنا ذہنی و قلبی اطمینان چھن جائیگا ۔ یہی وجہ ہے ۔ کہ اسلام نے جب بعض

خصوصی حالات کے تحت ایک سے زائد بیویوں کی اجازت دی ہے تو اس صورت میں عدل جیسی کڑی شرط کو بھی عائد کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء:۳) پس اگر تمہیں ڈر ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک (بیوی کافی ہے)

اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اپنی سب بیویوں میں عدل قائم کرنے کی قوت نہ رکھتا ہو تو اسے فقط ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ عدل سے یہاں پر مراد نان ونفقہ اور جنسی تعلقات میں مساوات وبرابری قائم کرنا ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام ازواج مطہرات رضؓ میں حد سے زیادہ اس امر کا اہتمام فرماتے کہ ان کے ساتھ یکساں سلوک ہو اور کسی قسم کا امتیاز قائم نہ ہو لیکن اس احتیاط کے باوجود آپؐ بار بار بارگاہ ایزدی میں دعا فرماتے کہ "اے اللہ! جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے ان کے درمیان انصاف کو ملحوظ رکھا لیکن اگر کہیں ناانصافی کا مظاہرہ ہوا ہو تو مجھے معاف فرما"۔ اس طرح آپؐ نے ازواج میں عدل کا بہترین وکامل نمونہ پیش کیا۔

عائلی زندگی کو خوشگوار بنانے کیلئے اولاد میں بھی عدل وانصاف قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح نہ دی جائے اور سب اولاد کے درمیان بڑے چھوٹے کے حقوق میں تفاوت نہ کرنا چاہیئے کیونکہ تمام اولاد کو والدین کے ساتھ یکساں نسبت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس امر کی تاکید فرمائی کہ بیٹوں اور بیٹیوں میں فرق نہ کیا کرو۔ اور ہر معاملہ میں ان سے یکساں سلوک کیا کرو۔

(۲) معاشرتی زندگی میں عدل:۔ عائلی زندگی کے بعد معاشرتی زندگی میں بھی عدل نہایت اہم ہے۔ باہمی تعلقات، لین دین، ناپ تول اور دیگر معاملات میں اگر عدل کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ تو معاشرہ میں اخلاقی پستی رونما ہو جاتی ہے۔

اسلام اس حد تک معاشرتی مساوات کا درس دیتا ہے۔ کہ تمام ابن آدم انسانی شرف وعزت میں برابر ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ کسی کے حق میں ادب واحترام کا پہلو زیادہ ہے۔ اور کسی کے حق میں شفقت اور محبت کا۔ عمر میں بزرگانہ حیثیت رکھنے والے عزت واحترام کے زیادہ حقدار ہیں، اور کم عمر والے شفقت کے لائق ہیں۔ بلند مرتبہ پر فائز لوگ احترام کا حق رکھتے ہیں۔ اور علمی حیثیت پر کام کرنے والے شفقت چاہتے ہیں۔ اسی طرح معاشی اعتبار سے اسلامی معاشرے میں امیر ہو یا غریب، آقا ہو یا نوکر، تاجر ہو یا ملازم

سرمایہ دار ہو یا مزدور سب افراد کے حقوق برابر ہیں۔ سب کیلئے علم کاج کے مواقع برابر مہیا ہوتے ہیں۔ اور اہلیت وخدمات کی بنا پر ترقی دی جاتی ہے۔ اسلام معاشرے میں اعتدال پیدا کرنے کیلئے تمام افراد کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ امراء سے تقاضا کیا گیا ہے۔ کہ وہ اپنی بچت میں سے بصورت زکوٰۃ غرباء کی مدد کریں اور غرباء کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ امراء کے خلاف حسد وبغض پیدا کرنے کی بجائے مادی ترقی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

معاشرتی حقوق میں سب سے نازک پہلو یتیموں کے حقوق کا ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ یتیموں کو کفالت اور پرورش کے بہانے ان کا مال غضب کو جاتے ہیں۔ جو اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ عدل کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (النساء: ۱۲۷)

اور یہ کہ تم یتیموں کے بارے میں عدل والصاف کو ملحوظ رکھو۔

تجارت اور روزمرہ کی خرید وفروخت میں بھی اسلام نے عدل والصاف کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ کاروبار میں وزن وپیمانہ کی اہمیت واضح ہے۔ اگر ناپ تول میں کمی کی جائے۔ یا اشیاء میں آمیزش وملاوٹ کی جائے۔ یا مال کے نرخ کو چھپایا جائے یا اس کے نقص پر پردہ ڈالا جائے۔ تو معاشرے میں ناالصافی اور بددیانتی کی فضا جنم لیتی ہے۔ جس سے بالآخر پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ باہمی رنجشیں اور جھگڑے سارے معاشرے کو پراگندہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اس بے راہ روی پر خاص توجہ دیتے ہوئے عدل اور الصاف کا حکم دیا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (الانعام ۱۵۲) اور ناپ تول الصاف کے ساتھ پورا کرو۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:۔

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (الرحمٰن: ۹)

اور وزن الصاف کے ساتھ پورا کرو۔ اور تولنے میں کمی نہ کرو۔

اسلامی معاشرے میں اگر دو شخصوں میں تعلقات بگڑ جائیں اور جھگڑا ہو جائے تو تیسرے مسلمان کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ وہ عدل والصاف سے کام لیتے ہوئے دونوں میں مصالحت کرا دے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا:۔

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الحجرات ۹)

تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو، اور انصاف کرو بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(۳) عدالتی معاملات میں عدل:

عدل و انصاف کی خاص طور پر ضرورت عدالتی معاملات میں ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہیں حق و باطل جائز و ناجائز اور صحیح اور غلط میں فرق کیا جاتا ہے۔ اسی لیئے اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور قرآن حکیم میں ہر ضابطے سے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

عدالتی معاملات کا آغاز دستاویز کی کتابت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے کاتب یا عرضی نویس ہی کو حکم ہوتا ہے کہ وہ باہمی معاملات و معاہدات عدل و انصاف سے قلمبند کرے اور ان میں کمی بیشی نہ کرے۔ جیسا کہ فرمایا۔

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (البقرۃ: ۲۸۲)

اور کاتب کو چاہیئے کہ تمہارے درمیان عدل کے ساتھ لکھے۔

اگر معاہدہ کرنیوالا شخص کم عمر یا مجنون ہو، وہ خود قانونی دستاویز نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کے سرپرست یا کارمختار کو چاہیئے کہ وہ عدل و انصاف سے لکھوائے۔ جیساکہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۔ (البقرۃ ۲۸۲)

اور اگر وہ شخص جس کے ذمے دینا ہے۔ ناسمجھ یا کمزور ہو یا وہ خود لکھوا نہ سکتا ہو۔ تو جو اس کا سرپرست عدل سے لکھوا دے۔

دستاویز کے بعد مقدمات کے فیصلہ میں شہادت یا گواہی کو بُنیادی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن شہادت دینے ہوئے، ان کے راستے میں ذاتی مفادات اور دنیاوی تعلقات حائل ہوتے ہیں۔ اسلیئے اسلام نے اس بات پر زور دیا ہے۔ کہ گواہ بغیر کسی رو رعایت ہمیشہ سچی گواہی دیں۔ اس میں دوستی، قرابتداری یا دوسرے تعلقات کا قطعاً لحاظ نہ رکھیں بلکہ محض خدا تعالیٰ کی خوشنودی و رضامندی کے طلبگار ہوں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ

اور جب تم (گواہی کی) بات کہو تو عدل کو ملحوظ

رکھو چاہے کوئی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ ذَا قُرْبٰی (الانعام ۱۵۲)

اور فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدۃ ۸) اے ایمان والو! خدا کیلئے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کیلئے تیار ہو جاؤ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی گواہی میں سچ کہنے کی تلقین فرمائی اور آپ نے فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا کبیرہ گناہ ہے (بخاری) پھر اسلام نے حاکم یا امام وقت اور قاضی کیلئے عادل ہونا ضروری قرار دیا۔ حاکم وقت کیلئے ضروری ہے۔ کہ جب اس کے سامنے مقدمات پیش ہوں تو امیر و غریب، آقا و خادم، دوست دشمن رشتہ دار و غیر رشتہ دار میں کوئی فرق نہ کرے۔ نہ ہی کسی کے منصب یا مرتبہ سے متاثر ہو اور نہ ہی رشوت قبول کرے۔ بلکہ غاصب سے دوسرے کے حقوق چھینے اور حقدار کو دلائے۔ مظلوم کی دادرسی کرے اور ظالم کو سزا دے۔ غرضیکہ سب میں پورا پورا عدل و انصاف کرے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۔ (النساء: ۵۸) بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے۔ کہ امانتیں ان کے مالکوں کو پہنچاؤ اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل کرنے میں اس حد تک احتیاط کی تاکید فرمائی، کہ آپ نے فرمایا کہ کوئی حاکم دو شخصوں کے درمیان اس وقت تک فیصلہ نہ کرے جب تک کہ وہ غصہ کی حالت میں ہو۔ آپ نے یہ اس وجہ سے فرمایا کہ غصہ کی حالت میں عدل و انصاف کے خلاف فیصلہ کرنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے

(۴) **غیر مسلموں سے عدل:۔** اسلام صرف اپنوں ہی کے ساتھ عدل و انصاف کرنے کی ہدایت نہیں کرتا بلکہ غیر مسلموں اور دشمنوں کے ساتھ بھی عدل ہی کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے اور عدل و انصاف کے وقت ہر قسم کے تعصب و عناد، اخوت و قرابت اور کینہ و دشمنی کو نظر انداز کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدۃ ۸) اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے۔ کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو۔ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

یہود و نصاریٰ اسلام کے کھلے دشمن تھے۔ اس پر بھی خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا:۔

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (الشوریٰ: ۲) اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہود مدینہ اکثر اپنے مقدمات لاتے تھے خدا تعالیٰ نے آپ کو ان کے متعلق ارشاد فرمایا:۔

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (شوریٰ ۱۵) اور جب آپ فیصلہ کریں تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کریں۔

ثمرات و فوائد: عدل کے مندرجہ ذیل ثمرات و فوائد ہیں۔

(۱) **استحکام معاشرہ:**۔ عدل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے معاشرے کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ حقدار کو اس کا حق مل جاتا ہے۔ اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا مل جاتی ہے اور آئندہ وہ کسی پر ظلم کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ غریب و کمزور لوگوں کی زندگی محفوظ ہو جاتی ہے اور وہ امن سکون حاصل کرتے ہیں، مختصراً ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

(۲) **اجر آخرت:**۔ عدل ایک بہت بڑی اخلاقی فضیلت ہے جس کا آخرت میں بہت بڑا اجر ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص مقام حاصل ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اپنے گھر والوں میں یا ان میں جن کی حکومت ان کے ذمہ کی گئی ہے انصاف کرتے ہیں وہ خدا کے پاس نور کے میناروں پر رہیں گے۔ (ریاض الصالحین) ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا: کہ قیامت کے دن امام عادل پر خدا [redacted] سایہ ہوگا۔

احسان

مفہوم :- احسان کا مادہ حُسن ہے جس کے معنی کسی کام کو خوبی و عمدگی سے سرانجام دینا ہے۔ قرآن مجید میں احسان کے لئے حسن کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی نیکی اور بھلائی کے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں احسان سے مراد وہ عمل ہے جو اس خوبی و رعنائی سے انجام دیا جائے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے بندوں کو محبوب ہو۔

احسان دراصل ہر اس نیکی کو کہتے ہیں جسے خوب تر طریقہ پر انجام دیا گیا ہو مثلاً دوسروں سے عمدہ سلوک کرنا، مروت و خوش خلقی سے پیش آنا، انعام و اکرام دینا، فیاضی و سخاوت کا برتاؤ کرنا، دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کم لینا سب احسان میں شامل ہیں۔ اسلام جہاں یہ تقاضا کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ نیکی کی جائے وہاں یہ بھی چاہتا ہے کہ ہر نیکی خوب تر طریقہ پر کی جائے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تو اپنے ہر عمل کے بارے میں یہ سمجھ کہ یہ آخری عمل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان ہر نیک کام کو اپنی استطاعت کے مطابق زیادہ سے زیادہ بہتر طور پر انجام دے تاکہ "احسان" میں شمار کیا جائے۔

احسان کا مفہوم عدل و انصاف سے زیادہ وسیع ہے۔ عدل سے مراد کسی کو اس کا پورا پورا حق دینا ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دیا جائے اور خود اپنے حق سے کم لیا جائے۔ زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کسی معاملہ میں برابر کا بدلہ لینا یا دینا عدل ہے لیکن سزا دینے کی بجائے معاف کر دینا اور عمدہ سلوک سے پیش آنا احسان کہلاتا ہے۔

اہمیت

احسان کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ حُسنِ معاشرہ:۔ معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں احسان کو عدل سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک صالح معاشرہ کے قیام و بقا کا انحصار عدل پر ہوتا ہے لیکن اس میں حسن و جمال اور خوبصورتی و نکھار احسان ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ عدل اگر معاشرے کو تلخیوں اور ناگواریوں سے محفوظ کرتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریوں اور شیرینیوں کو جنم دیتا ہے۔

درحقیقت معاشرتی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ہر شخص ناپ تول کر اپنا حق پہچانتا رہے اور اسے لے کر ہی رہے اور اسی طرح دوسرے کا حق ناپ تول کر اسے فقط اتنا ہی دے۔ اس قسم کے ماحول میں یہ تو ممکن ہے کہ کوئی تنازعہ یا کشمکش نہ رہے، لیکن افراد میں باہمی خلوص و یگانگت الفت و محبت۔ ایثار و قربانی، رواداری و ہمدردی اور فیاضی و عالی ظرفی جیسے اعلیٰ جذبات مفقود ہوں گے جو دراصل زندگی کی روح ہیں۔ ان صفات کا وجود اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب انسان دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دے اور خود اپنے حق سے کم لے اور اسی چیز کا نام احسان ہے۔

اسی کی بدولت احسان مند کے دل میں محسن کے لئے محبت و عقیدت پیدا ہوتی ہے اور خود محسن کے دل میں ایثار و سخاوت کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔ نیز اسی سے نیکی اور بھلائی کرنے میں مسابقت کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کے حالات میں محض عدل پر قناعت کر لینا ہی کافی نہیں۔ بلکہ ایک بہتر اور صالح معاشرے کے قیام کیلئے احسان پر عمل کرنا ازبس ضروری ہے۔

۲۔ قرآن پاک میں تاکید:۔ قرآن مجید میں جابجا احسان کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ والدین و اقارب یتیم و محتاج اور ہمسایہ و مسافر سے عام لوگوں تک سب کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل: ۹۰)

بیشک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔ (النحل: ۹۰)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ

اور احسان کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ (البقرۃ: ۱۹۵)

خدا تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں ایک نام محسن بھی ہے۔ ظاہر ہے خدا تعالیٰ سے بڑھ کر کون محسن ہو سکتا ہے جس کے بنی نوع انسان پر احسانات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ زمین سے آسمان تک اور فرش سے عرش تک جو کچھ بھی ہے سب اسی کے احسانات کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ خود اپنی مثال دے کر بندوں کو آپس میں احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

وَاَحْسِنْ کَمَا اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (القصص: ۷۷)

اور احسان کر جیسا کہ خدا نے تجھ پر احسان کیا

خدا تعالیٰ عادل بھی ہے اور محسن بھی۔ اس کا عدل یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص بدی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اس کے نامہ اعمال میں بدی درج نہیں ہوتی۔ اور بعد از ارتکاب صرف برابر کی بدی لکھی جاتی ہے۔ لیکن نیکی کی صرف نیت بھی کی جائے تو ایک نیکی اس کے حساب میں درج ہو جاتی ہے۔ اور اگر عمل کیا جائے تو ۱۰ تا ۷۰۰ نیکیاں اس کے حساب میں لکھ دی جاتی ہیں۔

۳۔ آنحضورؐ کا قول و عمل:۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ احسان کا کامل نمونہ تھی آپؐ نے نہ صرف اپنوں سے بلکہ دشمنوں سے بھی ہمیشہ احسان کا سلوک کیا۔

غزوہ بدر میں مشرکین مکہ کے قیدی آپؐ کے ہاتھ آئے۔ ان سے بڑھ کر آپؐ کا اور کوئی دشمن نہ تھا۔ اور باوجودیکہ صحابہ کرامؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا۔ آپؐ نے نہ صرف انہیں رہا کر دیا بلکہ جتنی دیر یہ لوگ لوگ حضورؐ کی قید میں رہے آپؐ نے ان سے مہمانوں کی طرح سلوک کیا اور ان کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھا۔

ابوسفیان جو قبول اسلام سے پیشتر اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف انہیں معاف کر دیا بلکہ یہ بھی اعلان فرمایا کہ جو شخص بھی ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا دہ امن میں ہوگا اس کے علاوہ ابوسفیان اور اس کے بیٹوں کو ہوازن کے مال غنیمت میں سب سے زیادہ حصہ دیا۔

غزوہ حنین میں چھ ہزار مرد و عورت قیدی ہاتھ گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہ صرف بغیر فدیہ کے رہا کر دیا۔ بلکہ بعض کے ساتھ اس قدر احسان کا سلوک کیا کہ۔ ان کا فدیہ اپنے پاس سے ادا کیا۔ اور اکثر کو مزید انعام و اکرام بھی دیا مثلاً مالک بن عوف جو دشمنوں کا سپہ سالار تھا۔ اسکے اہل و عیال اور اونٹ واپس کر دینے کے علاوہ اسے ایک سو اونٹنیاں اپنے پاس سے عطا کیں۔

مکہ میں ایک مرتبہ قحط پڑا۔ تو باوجودیکہ کفار مکہ نے آپ پر بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ آپ نے ان سے احسان کا رویہ اختیار کیا۔ اور ان کے لئے کھجوریں بھیجی۔ اور مالی امداد فرمائی۔ نیز یہ قحط آپ ہی کی دعا سے ختم ہوا۔

ایک روز ایک بدو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے آپؐ کی چادر کو اتنے زور سے کھینچا کہ آپؐ کی گردن پر نشان پڑ گیا پھر بولا اے محمدؐ خدا کا یہ مال جو آپؐ کے پاس ہے اس میں سے ایک بار شتر مجھے بھی دیجئے۔" آپؐ نے کچھ دیر تامل کیا پھر فرمایا" مال بیشک اللہ کا ہے" پھر فرمایا کہ" اسے ایک اونٹ پر کھجوریں اور ایک پر جو دیئے جائیں"!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو احسان کرنا اس قدر محبوب تھا کہ آپؐ ہمیشہ بارگاہ ایزدی میں دعا فرمایا کرتے تھے۔ کہ اے اللہ مجھے ان میں شریک رکھ جنہیں احسان کرتے

ہوتے خوشی ہوتی ہے۔

آنحضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خود احسان پر عمل کرتے تھے بلکہ صحابہؓ کو بھی آپؐ نے ہمیشہ احسان کرنے کی تاکید فرمائی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ نہ کہو کہ لوگ ہمارے ساتھ احسان کریں۔ تو ہم بھی احسان کریں گے۔ اور وہ زیادتی کریں، تو ہم بھی زیادتی کریں گے بلکہ اسی بات پہ پختہ ہو جاؤ کہ احسان کرنے والوں کے ساتھ احسان کرو گے اور برائی کرنے والوں کا جواب بھی احسان سے ہی دو گے" (ترمذی)

آپؐ کا یہ ارشاد ہے کہ "ساری مخلوق عیال اللہ ہے۔ اور مخلوق میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے عیال کے ساتھ بھلائی سے پیش آئے"

احسان کی اقسام:

احسان کی دو قسمیں ہیں (ا) حقوق اللہ میں احسان اور (ب) حقوق العباد میں احسان۔

(ا) حقوق اللہ میں احسان: خدا تعالیٰ کے ہم پر بیشمار احسانات و اکرامات ہیں۔ اس نے ہمیں یہ زندگی دی اور اس زندگی کی تمام ضروریات مہیا کیں ان احسانات کے عوض خدا تعالیٰ کے لئے جو عبادات ہم پر لازم آتی ہیں انہیں حقوق اللہ کہا جاتا ہے

عدل کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے ہم پر بے پایاں انعامات کئے ہم عبادات کے ذریعہ اس کا شکر بجا لائیں لیکن اگر ہم انتہائی خلوص و عقیدت اور عاجزی و انکساری کے ساتھ اس کی عبادت کریں تو یہ احسان کا درجہ رکھے گی۔ جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "احسان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے"۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ ہمارے احسان کا محتاج نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی عبادت نہایت عقیدت و رضامندی اور خشوع و خضوع سے ادا کرے تاکہ عبادت کی صحیح افادیت حاصل ہو۔ اسی طرح اگر انسان اللہ تعالیٰ کی

اطاعت میں اپنا مال، اولاد اور حتیٰ کہ جان قربان کرنے سے دریغ نہ کرے تو بھی احسان میں شمار ہوگا۔

(ب) حقوق العباد میں احسان:۔ بندوں پر آپس میں ایک دوسرے کے لئے کچھ باتیں لازم آتی ہیں جنھیں حقوق العباد کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ دوسروں کے سلوک اور نیکیوں کا برابر بدلہ دینے سے حقوق العباد ادا ہو جاتے ہیں لیکن حقوق العباد میں احسان کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ نیکی سے پیش آیا جائے اور ہر شخص کی بھلائی کا اس سے بڑھ کر بدلہ دیا جائے۔

حقوق العباد میں احسان کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔

۱۔ اہل خانہ سے سلوک:۔ احسان کی سب سے اولین صورت یہ ہے کہ گھر والوں کے ساتھ احسان کیا جائے تاکہ گھریلو زندگی کی فضا خوشگوار رہے گھر میں سب سے اہم مقام والدین کو حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر والدین کے ساتھ احسان کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (الانعام ۱۵۱) اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔

گھریلو زندگی میں خاوند اور بیوی کے تعلقات بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ گھر کے دیگر افراد پر ان کے باہمی تعلقات کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن ازدواجی زندگی ایک نہایت نازک مسئلہ ہے اور اس کو خوشگوار رکھنے کے لئے بڑی سمجھ بوجھ اور حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لئے ضرورت ہے کہ خاوند بیوی دونوں ایک دوسرے میں ہم آہنگی و یک جہتی پیدا کریں۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے احسان کی روش اختیار کرنا ہی بہترین حل ہے۔ کیونکہ اگر ایک فریق احسان کرے تو دوسرا خواہ انتہائی غصہ میں ہو بالآخر سدھر ہی جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے بھی گھریلو زندگی کو پرسکون بنانے کے لئے عورتوں کے ساتھ احسان سے پیش آنے کی ہدایت کی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

وَعَاشِرُوهُنَّ اور اپنی عورتوں کے ساتھ بھلائی سے زندگی

بِالْمَعْرُوْفِ (نساء:١٩) گذارو۔

امن و سکون کی حالت میں احسان کی روش اختیار کرنا تو بہرحال مشکل نہیں لیکن غصہ و اضطراب کی حالت میں احسان تو درکنار، انسان عدل سے بھی ہٹ کر ظلم و زیادتی پر اتر آتا ہے۔ اسلام نے ایسے نازک موقعوں پر بھی احسان پر ہی عمل کرنے کی تاکید کی ہے چنانچہ خاوند بیوی کا تنازعہ اگر انتہائی صورت اختیار کرے اور علیحدگی کے سوا چارہ نہ ہو تو اس صورت میں بھی قرآن مجید نے احسان کرنے کا ہی حکم دیا ہے جیسا کہ فرمایا۔

فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ "پھر یا تو بھلے طریقے سے ان کو روک لینا ہے
بِاِحْسَانٍ (البقرہ:٢٢٩) یا احسان کے ساتھ رخصت کر دینا ہے (البقرہ:٢٢٩)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ "پھر یا تو بھلے طریقے سے ان کو روک لو یا
فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (الطلاق:٢) بھلے طریقے سے ان سے الگ ہو جاؤ

حاجتمندوں کی مالی امداد:- احسان کی ایک نہایت پسندیدہ صورت حاجتمندوں کی مالی امداد کرنا ہے۔ اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ معاشرے میں جو افراد غریب و ضرورت مند ہوں ان کو قرض حسنہ دیا جائے۔ خدا تعالیٰ کو قرض حسنہ اس قدر پسندیدہ ہے کہ وہ قرض حسنہ دینے والوں کو کئی گنا بڑھا کر اجر دیتا ہے جیسا کہ فرمایا:۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا "کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے؟"

مقروض کے ساتھ بھی اسلام نے احسان کی روش اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ اگر مقروض تنگدست ہو تو اس کی مالی حالت بہتر ہونے تک مہلت دی جائے اور اگر وہ تہی دست ہو تو قرض معاف کر دینا نیکی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى "اور اگر کوئی تنگدست ہو تو فراخی تک مہلت

مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوْا دو۔ اور اگر خیرات کر دو۔ تو تمہارے لئے
خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرۃ: ۲۸۰) زیادہ بہتر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا تعالیٰ اس کو قیامت کی تکلیف سے نجات دے وہ تنگدست کو مہلت دے۔ یا اس کا قرضہ معاف کر دے (بخاری) مسلم۔

میثاق مدینہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ مسلمان اپنے قرض تلے دبے ہوئے بھائیوں کی مدد کریں گے۔

اسلام نہ صرف حاجت مندوں کو قرض حسنہ دینے کی تلقین کرتا ہے بلکہ یہ بھی تقاضا کرتا ہے کہ رشتہ داروں، مسافروں اور معاشرہ کے دیگر ضرورت مند افراد کی فی سبیل اللہ مالی امداد کی جائے۔ اور ان کی غربت و مفلسی کو دور کیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (بے شک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کرنے
وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى (نحل ۹) اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

مسافروں کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ حاضر ہوئے۔ اور ان کی حالت بڑی قابل رحم تھی۔ کسی کے بدن پر کپڑا نہ تھا۔ آپ انہیں دیکھ کر سخت مضطرب ہوئے، اسی حالت میں کبھی اندر جاتے اور کبھی باہر آتے پھر آپ نے حضرت بلال سے فرمایا کہ اذان دو۔ اذان سن کر جب لوگ جمع ہوئے تو آپؐ نے ان مسافروں کی امداد کے لئے کہا۔

اسلام نے اس سلسلے میں یہ بھی حکم دیا ہے کہ ان صدقات و خیرات کو جتلایا نہ جائے کیونکہ اس طرح خود پسندی و ریاکاری شامل ہو جاتی ہے۔ اور

ایسے صدقات ضائع ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ (البقرة ۲۶۴)

اے ایمان والو! تم اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع نہ کرو۔

۳۔ مصیبت سے نجات دلانا:۔ احسان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی کو مصیبت و دکھ یا تکلیف و پریشانی سے نجات دلائی جائے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو قید خانے سے رہائی دلائی تو انہوں نے خدا تعالیٰ کے احسان کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:۔

وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ (یوسف ۱۰۰)

اور تحقیق خدا تعالیٰ نے مجھ پر احسان کیا جب اس نے مجھے قید خانہ سے رہائی دی۔ (یوسف)

۴۔ قصور وار سے درگذر:۔ احسان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی کی غلطی خطا یا قصور سے درگذر کرتے ہوئے اس سے حسن سلوک سے پیش آیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں محسنین کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ غصہ پی جانے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:۔

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (آل عمران ۱۳۴)

اور وہ غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے محسنین کو پسند کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کو نہ صرف معاف کیا بلکہ اس کی مزید عزت افزائی اس کے گھر کو جائے امن قرار دیا اور اس کے بیٹوں کو ہوازن کے مال غنیمت میں سے سب سے زیادہ حصہ دیا۔ آپؐ کی سیرت طیبہ میں ایسی بیشمار مثالیں موجود ہیں۔

اسلام صرف یہی تقاضا نہیں کرتا کہ قصوروار سے درگزر کیا جائے۔ اور اس کے

ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جائے ۔ بلکہ اس امر کی بھی تاکید کرتا ہے کہ کسی شخص کی غلطی، خطا یا لغزش یا اس سے ناراضگی کی وجہ سے اس پر احسانات کے دروازے بند نہ کئے جائیں ۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے یتیم رشتہ دار مسطح کی مدد فرمایا کرتے تھے ۔ مسطح نے جب آپؓ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں حصہ لیا ۔ تو آپؓ نے اس کی امداد بند کر دی اس پر خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ۔

" اور تم میں سے جو لوگ بزرگی اور وسعت والے ہیں ۔ وہ رشتہ داروں ، مسکینوں اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھائیں انہیں چاہئے کہ وہ ان کی غلطیوں کو معاف کر دیں " ۔

۵ ۔ غیر مسلموں اور دشمنوں سے سلوک :- احسان صرف اپنوں تک ہی محدود نہیں بلکہ غیر مسلموں اور دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا بھی احسان شمار ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک نے حکم دیا ہے برائی کو احسن چیز سے دور کیا جائے ۔ کہ فرمایا :-

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ — برائی کو احسن چیز سے دور کر

اسی طرح اگر کسی کے ساتھ بحث و مناظرہ پیش آ جائے ۔ اور مدمقابل گھٹیا ہتھیاروں پر اُتر آئے ۔ تو اس کا جواب حسن کلام سے دیا جائے ، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ — اور ان سے احسن طریقہ پر بحث کر ۔

غرضیکہ غیر مسلموں اور دشمنوں کے ساتھ ہر حالت میں حسن سلوک سے پیش آنا چاہیئے ۔ اگرچہ [illegible] وہ بے مروتی سے پیش آئیں اور نقصان پہنچانے کی کوشش کریں ۔ تو بھی مسلمان کو احسان کی روش کا اختیار کرنا چاہیئے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عداوت ، محبت میں تبدیل ہو جائے گی ۔ اور دشمن

دلی دوست بن جائے گا۔

۶۔ سنگدلی سے اجتناب احسان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی کو سزا دیتے ہوئے یا قتل یا ذبح کرتے ہوئے سنگدلی اور بے رحمی سے اجتناب کیا جائے۔ اسلام سے قبل عربوں میں رواج تھا کہ اپنے دشمنوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کرتے تھے۔ ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء باری باری کاٹ دیتے تھے۔ جس کو مثلہ کرنا کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دشمن کو درخت سے باندھ کر تیراندازی کی مشق کرتے تھے۔ اسلام نے قتل و سزا کے ان بے رحمانہ طریقوں کو ممنوع قرار دیا۔ جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ قریش کے فلاں دو کافر ملیں۔ تو انہیں جلا دینا۔ پھر فرمایا نہیں۔ بلکہ صرف قتل کر دینا کیونکہ آگ کا عذاب فقط اللہ کا حق ہے۔ البتہ عبرت دلانے کے لئے کسی کو سنگین سزا دے۔

اسی طرح جانوروں کو مارنے یا ذبح کرنے میں بھی رحم کو مدنظر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ موذی جانور مثلاً سانپ بچھو وغیرہ کو جلانے اور ظالمانہ طریقہ سے ہلاک کرنے کی اجازت نہیں بلکہ انہیں لاٹھی سے مارنا چاہیئے۔ حلال جانور کو ایسے طریقے پر ذبح کیا جائے کہ اسے کم سے کم تکلیف پہنچے مثلاً گھسیٹ کر ذبح کی طرف نہ لے جایا جائے۔ پیاسا ہو تو پانی پلایا جائے چھری خوب تیز ہو لیکن اس کے سامنے تیز نہ کی جائے۔ ایک جانور کے سامنے دوسرا جانور ذبح نہ کیا جائے وغیرہ۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کر دیا ہے۔ اگر کسی کو مارنا بھی پڑے تو بھلائی کے ساتھ مارو اور اگر کسی جانور کو ذبح کرنا ہو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور چھری کو خوب تیز کر لو تاکہ ذبیحہ کو زیادہ تکلیف نہ ہو (مسلم)

۷۔ محسن سے حسن سلوک:۔ اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ ہم دوسروں کے احسان مند بن کر زندگی گذاریں بلکہ اس امر کا متقاضی ہے کہ جب بھی موقع ملے دوسرے کے احسان کا بدلہ اتارا جائے بلکہ بڑھ چڑھ کر ادا کیا جائے۔ جیسا کہ

قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (رحمٰن ۶۰) کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ اور ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی سے قرض لیتے تو واپسی کے وقت اس پر کچھ بڑھا کر دیتے۔ اگر جنس کا قرض ہوتا تو کوشش فرماتے کہ بہتر جنس سے قرض چکائیں۔

ثمرات و فوائد

احسان کے مندرجہ ذیل ثمرات و فوائد ہیں:۔

۱۔ تعمیر معاشرہ:۔ احسان سے افراد معاشرہ میں باہمی خلوص و محبت، الفت و یگانگت اور اخوت و بھائی چارے کی فضا پروان چڑھتی ہے۔ آپس کے کینے تنازعے بغض اور حسد ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے ایثار و قربانی اور ہمدردی و جاں نثاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ دشمن دوست بن جاتے ہیں۔

دل ایک دوسرے کے لئے مسخر ہو جاتے ہیں۔ اور معاشرہ ترقی و تعمیر کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ کیونکہ احسان کرنے سے احسان کو فروغ ہوتا ہے۔

۲۔ خدا تعالیٰ کی رضا و رحمت:۔ خدا تعالیٰ خود محسن حقیقی ہے۔ اس لئے وہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے ان پر اپنی رحمت خاص کرتا ہے اور انہیں مزید نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے

(ا) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (بقرہ ۱۹۵) بیشک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ (البقرہ: ۱۹۵)

(ب) وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

اور جن لوگوں نے احسان کے ساتھ پیروی کی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا:

اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (الاعراف: ۵۶)

بے شک خدا تعالیٰ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے۔

وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ (البقرہ: ۵۸)

اور عنقریب ہم احسان کرنے والوں کو زیادہ دیں گے۔

۳۔ اجرِ آخرت :- احسان کرنے والے کو آخرت میں بہت بڑا اجر ملے گا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے :-

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ

ان لوگوں کے لئے جنہوں نے احسان کیا اور تقویٰ اختیار کیا اجر عظیم ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا :-

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (ہود: ۱۱۵)

اور بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

خدمتِ خلق

مفہوم: خدمت خلق کے معنی مخلوق باری تعالیٰ کے کام آنا ہے لیکن اصطلاح میں اس سے مراد خدا تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لئے بغیر کسی اجرت وصلہ یا معاوضہ اس کی مخلوق کے کام آنا اور امداد و اعانت کرنا ہے۔

اگرچہ بنیادی طور پر خدمت خلق سے مراد بغیر کسی اجرت و معاوضہ اور طمع و لالچ بنی نوع انسان کی خدمت کرنا ہے لیکن انسان چاہے تو اپنے کاروبار اور ملازمت بلکہ زندگی کے کسی بھی پہلو میں بھی اس روح کو شامل کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک تاجر یا کاروباری شخص اپنے کاروبار اور لین دین میں اگر دھوکہ دہی، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری سے کام نہیں لیتا بلکہ دیانتداری سے صحیح ماپ تول کرتا ہے تو وہ بھی خدمت خلق کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اسی طرح ایک ملازم اگر اپنی ملازمت کے فرائض نیک نیتی اور دیانتداری سے انجام دیتا ہے تو یہ بھی خدمت خلق ہے۔ والدین اور اقارب وغیرہ کی خدمت اور ان کی امداد اگرچہ ایک دنیوی فریضہ ہے لیکن اگر یہ فرض خدا کی خوشنودی کے پیش نظر ادا کیا جائے تو یہ بھی خدمت خلق میں شمار ہوگا۔

دراصل خدمت خلق کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اس میں اپنے پرائے مسلم غیر مسلم سب شامل ہیں حتیٰ کہ جانوروں سے شفقت کا سلوک کرنا بھی خدمت خلق ہے۔ الغرض تمام امور جن سے انفرادی یا اجتماعی لحاظ سے قوم و ملت کی اخلاقی معاشی، معاشرتی اور روحانی زندگی میں مدد مل سکے خدمت خلق میں شامل ہیں۔ بلکہ اگر کوئی شخص اپنی کسی معذوری کی بنا پر خود خدمت خلق کا کوئی کام انجام نہ دے سکتا ہو تو وہ کسی اور سے سفارش کر دے تو یہ بھی نیکی ہے۔

اہمیت: خدمت خلق کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ **معاشرتی فلاح و کامرانی:** انسان مدنی الطبع ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے۔ خلوت نشینی اور تنہائی کی زندگی گزارنا اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی لئے اسلام رہبانیت اور تیاگ جیسے خلاف فطرت نظریات کا مخالف ہے بلکہ تمام انسانوں کو باہم مل کر زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ مل جل کر زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور امداد کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح ہر انسان پر دوسروں کے لئے کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور ہر ایک کو دوسروں کی طرف سے کچھ حقوق بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ان حقوق و فرائض کی ادائیگی خدمت خلق کی صورت اختیار کرتی ہے۔

خدمت خلق کا جذبہ بہت بڑی نیکی ہونے کے علاوہ معاشرے کی بہت اہم ضرورت بھی ہے کیونکہ یہی جذبہ کسی قوم کی کامرانی و کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے اگر کسی قوم کے افراد میں خدمت خلق کا جذبہ نہ پایا جائے، ہر شخص نفسا نفسی کے عالم میں ہو اور لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک نہ ہوں تو کمزور و نادار اور غریب و مفلس دم توڑنے لگیں اور پوری قوم تباہی و بربادی کی طرف گامزن ہو جائے یہی وجہ ہے کہ اسلام خدمت خلق کو ایک مقصد کی حیثیت سے پیش کرتا ہے تاکہ اسلامی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن سکے اور امت مسلمہ دنیا کی بہترین امت قرار پا سکے۔

۲: **قرآن پاک میں تلقین:** قرآن پاک میں مختلف انداز میں خدمت خلق کی ترغیب دی گئی ہے۔ ایک مقام پر نیک لوگوں کا وصف خدمت خلق ٹھہرایا گیا ہے جیساکہ فرمایا:۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا — اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کیلئے مسکین، یتیم اور

وَيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر خدمت خلق کی ایک صورت یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی یوں ترغیب دی گئی ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا اور کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دے اور یہ فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ (الحدید ۱۱) اس کیلئے کئی گنا بڑھا کر دیا جائیگا اور اس کیلئے پسندیدہ اجر ہے

پھر راہ خدا میں مال خرچ کرنے والوں کو قرآن پاک میں یہ خوشخبری دی گئی ہے۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُؕ (البقرہ ۲۶۱)

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانے سے سات بالیں اگیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے کئی گنا بڑھا کر دیتا ہے

قرآن پاک میں جا بجا لوگوں میں اصلاح کرانے کی تلقین کی گئی ہے جس سے خدمت خلق کی اہمیت و فضیلت واضح ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔

(ا) وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِؕ اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرو

(ب) وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ۪ اور آپس میں مصالحت سے رہو۔

۲: اسوۂ نبوی: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی خدمت خلق کا بہترین نمونہ ہے۔ بنی نوع انسان کی ہمدردی و خیر خواہی آپ کی فطرت تھی اور ہر واقف اور ناواقف کی خدمت آپ کا شعار تھا:

آپ اپنے گھر کے تمام کام کاج خود کرتے تھے۔ پھٹا ہوا کپڑا سی لیتے، جوتا مرمت کر لیتے، گھر کی صفائی کر دیتے اور اونٹ، بکری وغیرہ پالتو جانوروں کو خود کھول باندھ لیتے تھے۔ اپنا کام تو درکنار آپ نے کبھی دوسروں کے کام کرنے کو بھی عار نہیں سمجھا بلکہ خوشی محسوس کی آپ ہمیشہ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر بے چین

ہو جاتے۔ بیماروں کی عیادت کرتے، محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرتے اور بھوکوں اور مسافروں کو کھانا کھلاتے، غلاموں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرتے اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت و نگہداشت کرتے۔ غرضیکہ آپؐ کی زندگی کا ہر پہلو خدمت خلق کا مظہر ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ مشہور صحابی حضرت خبابؓ کے گھر میں دودھ دوہنے والا کوئی مرد نہ تھا اور عورتیں بھی دودھ دوہنا نہ جانتی تھیں۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز ان کے گھر دودھ دوہنے جایا کرتے تھے۔

۲۔ مدینہ منورہ کی لونڈیاں آپؐ کی خدمت میں آتیں اور کسی کام کے لئے درخواست کرتیں تو آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک پاگل لونڈی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپؐ کا دست مبارک پکڑ لیا۔ آپؐ نے فرمایا اے عورت! مدینہ کی جس گلی میں تو چاہے چلوں اور تیرا کام کر دوں۔ پھر آپؐ اس کے ہمراہ گئے۔ اور اس کا کام کر دیا۔

۳۔ ایک روز آپؐ نماز کے لئے کھڑے ہوئے کہ ایک بدو آیا اور آپؐ کا دامن پکڑ کر بولا میرا کچھ کام رہ گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بھول جاؤں پہلے اسے کر دیں۔ حضورؐ فوراً اس کے ساتھ نکلے اور اس کا کام پورا کر کے نماز ادا کی۔

۴۔ حبشہ کے نجاشی بادشاہ کی طرف سے دربار نبویؐ میں کچھ مہمان آئے۔ آپؐ خود ان کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم خدمت کے لئے حاضر ہیں آپؐ تکلیف نہ فرمائیں۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں یعنی مہاجرین حبشہ کی خدمت کی تھی اس لئے میں خود ہی ان کی خدمت کروں گا۔ اسی طرح جب ۹ھ میں طائف کا وفد حاضر ہوا تو آپؐ نے خود اپنے ہاتھوں اسے مسجد نبوی میں اتارا اور خدمت کی حالانکہ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے آپؐ کو طائف کے بازار میں پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا تھا۔

۴۔ **ارشادات نبویؐ:** حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث مروی ہیں جس میں آپؐ نے خدمت خلق کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ چند احادیث درج ذیل ہیں:۔

۱۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے رمضان بھر کے روزے رکھنے اور اس مہینے مسجد حرام میں اعتکاف بیٹھنے سے یہ زیادہ عزیز ہے کہ میں اپنے بھائی کی بوقت ضرورت مدد کر دوں (کنز العمال)

۲۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو دوسرے کے درد کا احساس نہیں اور جس کا دل دوسرے کی مصیبت دیکھ کر نہیں پسیجتا وہ ہرگز خدا کی رحمت کا مستحق نہیں تمہیں مخلوق پر مہربانی کرنی چاہیئے تاکہ خالق اکبر تم پر مہربان ہو۔

۳۔ آپؐ نے فرمایا کہ بھولے بھٹکے یا اندھے کو راستہ بتانا بھی کار ثواب ہے۔

۴۔ ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ راستے سے کانٹے یا دوسری ایذا رساں چیز کو ہٹا دینا بھی کار خیر ہے۔

۵۔ حضورؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مخلوق خدا کا کنبہ ہے پس بہترین شخص مخلوق میں وہ ہے جو خدا کے کنبے کے ساتھ احسان کی روش اختیار کرے (بیہقی)

۶۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی مدد نہیں کرتا اس موقع پر کہ جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو یا اس کی آبروریزی کی جاتی ہو خدا تعالیٰ بھی اس کی مدد اس موقع پر نہ کرے گا جہاں کہ وہ اس کی مدد پسند کرتا ہو اور جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی ایسے موقع پر مدد کرے جہاں کہ اس کی بے حرمتی یا آبروریزی کی جاتی ہو تو خدا تعالیٰ اس کی مدد ایسی موقع پر کرے گا جہاں کہ وہ اس کی مدد پسند کرتا ہے۔ (ابوداؤد)

۷۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس

پر ظلم کرتا ہے اور نہ مشکل کے وقت بے یار و مددگار چھوڑتا ہے ۔ نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔

۸ ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس چٹیل میدان میں فالتو پانی ہو اور وہ مسافر کو نہ دے تو خدا تعالیٰ قیامت کے دن اس سے کلام نہ کرے گا ۔ نہ اس پر رحم کی نظر ڈالے گا اور نہ اسے گناہوں سے پاک کرے گا ۔

۹ ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا ۔ تو خدا تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرے گا ۔ اور جو کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اس کے بدلہ قیامت میں اس کی تنگی کو دور فرمائے گا (ابوداؤد)

۱۰ ۔ ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو خدا تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا اور جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا تو خدا تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس پر آسانی کرے گا ۔ خدا تعالیٰ اپنے بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک کہ وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے ۔ (ابوداؤد)

۱۱ ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں خدمت خلق کو صدقہ قرار دیا جیسا کہ فرمایا تمہارا اپنے بھائی سے ملاقات کے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے ۔ کسی بھٹکے ہوئے کو را[ستہ] دکھانا بھی صدقہ ہے کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیلنا بھی صدقہ ہے ۔

۱۲ ۔ خدمت خلق کی اہمیت آپؐ کے اس ارشاد سے واضح ہوتی ہے کہ اگر انسان کسی مجبوری سے حاجت مند کی حاجت روائی نہ کر سکے تو اسے چاہیے کہ کسی اور شخص سے اس کی سفارش کرے ۔ (بخاری)

۴۔ خدمت خلق کی اہمیت و فضیلت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث قدسی سے بھی واضح ہوتی ہے جس میں خدا تعالیٰ نے خدمت خلق کو خود اپنی خدمت سے تعبیر کیا جیسا کہ آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے روز خدا تعالیٰ اپنے ایک بندے سے فرمائے گا۔ کہ اے میرے بندے میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہ پلایا میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہ کی میں حاجت مند تھا تو نے میری حاجت روائی نہ کی۔ بندہ عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار تجھے بھوک پیاس کی کیا حاجت؟ اور تجھے بیماری اور حاجت روائی کی کیا ضرورت؟ تو تو سب کا آقا و مولا ہے۔ خدا تعالیٰ فرمائے گا میرا فلاں بندہ بھوکا تھا تو نے اسے کھانا نہ کھلایا تو گویا مجھے کھانا نہ کھلایا میرا فلاں بندہ پیاسا تھا تو نے اسے پانی نہ دیا تو گویا مجھے پانی نہ دیا میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی تو گویا میری عیادت نہ کی میرا فلاں بندہ محتاج تھا تو نے اس کی حاجت روائی نہ کی تو گویا میری حاجت روائی نہ کی۔ تب خدا تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا اور وہ اسے کھینچتے ہوئے دوزخ میں لے جائیں گے۔ (بخاری)

۵ : امثلہ صحابہؓ: تاریخ اسلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر صحابیؓ بالخصوص خلفائے راشدینؓ خدمت خلق کو نہایت اہم سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خدمت خلق کا جذبہ ان کی زندگیوں میں پوری آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ خلافت سے قبل اپنے محلے کے لوگوں کی بکریوں کا دودھ دوہا کرتے تھے۔ چنانچہ جب آپ خلیفہ ہوئے تو ایک بچی کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اب ان کی بکریاں کون دوہے گا؟ آپ کو جب یہ بات پہنچی تو فرمایا امید ہے کہ خلافت مجھے مخلوق خدا کی خدمت سے باز نہ رکھے گی۔ خلافت سنبھالنے کے بعد بھی آپ نے یہ سلسلہ

جاری رکھا۔ علاوہ ازیں اہل خلق کے دیگر کام بھی کرتے اور بیماروں کی تیمار داری اور ضعیفوں کی خدمت میں خوشی محسوس کرتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت خلق کے بارے میں ایسی روایات ملتی ہیں جن کی تاریخ عالم میں مثال نظر نہیں آتی۔ آپ راتوں کو مدینہ کا پہرہ دیتے گلیوں میں گشت لگاتے اور ضرورت مندوں کی دیکھ بھال کرتے۔ بیوہ عورتوں کے لئے پانی بھر کر لاتے اور سودا خرید کر لا دیتے۔ مجاہدین کے خطوط ان کے گھروں میں تقسیم کرتے اور ان کے دروازوں پر بیٹھ کر جواب لکھ دیتے۔ حتیٰ کہ بیت المال کے اونٹوں کی خود دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بیت المال کے اونٹوں کو تیل مل رہے تھے۔ کسی نے عرض کی اے امیرالمومنینؓ یہ کام کسی غلام سے لیا ہوتا آپؓ نے فرمایا کہ مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے! نیز عمر فاروقؓ اپنے آپ کو اجیر المسلمین (مسلمانوں کا مزدور کہا کرتے تھے)

حضرت عثمان غنی رضؓ نے اپنی ساری دولت خدمت خلق کے کاموں کے لئے وقف کر دی تھی۔ مدینہ میں میٹھے پانی کا کنواں بئر رومہ خرید کر اللہ کی راہ میں وقف کر دیا بے شمار غلام خرید کر آزاد کئے اور ہمیشہ یتیموں اور بیواؤں کی دستگیری کی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کی زندگی خدمت خلق کے جذبے سے سرشار تھی۔ آپ کبھی کسی سائل کو دروازے سے خالی نہ جانے دیتے تھے۔

اس طرح کے لاتعداد واقعات دیگر صحابہؓ سے بھی منقول ہیں۔ کیونکہ ان کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا کہ "سید القوم خادمھم"، (قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے) اور اسی بنا پر خدمت خلق کا جذبہ ان کی زندگیوں میں سرایت کر گیا تھا۔

خدمت خلق کی شرائط: خدمت خلق کے جذبہ کو ابھارنے کے لئے مندرجہ ذیل اخلاقی صفات کا ہونا لازمی ہے:-

۱۔ ایثار: خدمت خلق کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے سب سے بنیادی شرط ایثار ہے۔ کیونکہ جو شخص اپنے آرام وسکون اور اپنی حاجات اور ضروریات کو دوسروں کے لئے قربان نہیں کر سکتا وہ خدمت خلق صحیح طور پر بجا نہیں لاسکتا۔ کیونکہ خدمت خلق انجام دیتے ہوئے انسان کو بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اپنی ضروریات سے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور مال ودولت خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ وقت بھی صرف کرنا پڑتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن پاک نے نیکی کے حصول کے لئے ایثار کو شرط قرار دیا جیسا کہ فرمایا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ — تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ تم اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کروگے۔

ال عمران ۹۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے پیش نظر فرمایا کہ پانی پلانے والا خود سب سے آخر میں پیئے۔

۲۔ احساس ہمدردی: جذبہ خدمت خلق ابھارنے کے لئے دوسری اہم شرط احساس ہمدردی ہے یعنی دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا اس قدر احساس ہو کہ ان کی ضروریات کو اپنی ضرورت سمجھا جائے اور ان کی تکالیف کو اپنی تکلیف خیال کیا جائے یہی وہ جذبہ ہے جس کی بناپر دور اولی کے مسلمان ایک دوسرے کی مدد کے لئے بے قرار نظر آتے تھے۔ اور معاشرہ میں کوئی بھی اپنے آپ کو بے یار و مددگار نہ سمجھتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص میں دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ نہ ہو وہ دوسروں کی مدد پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا اور خدا تعالیٰ بھی اس پر رحم نہیں کرتا جیسا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ ؕ — جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

۳۔ خلوص: تیسری شرط خلوص ہے یعنی خدمت خلق محض خدمت کے جذبہ سے کی جائے اور اس کا مقصد خدا تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی

حاصل کرنا ہو۔ کوئی ذاتی غرض، شہرت، نمائش یا داد و تحسین وغیرہ کوئی بھی مقصد پیش نظر نہ ہو اور نہ ہی اس کا کسی پر احسان جتلایا جائے کیونکہ جو شخص نیکی کر کے احسان جتلاتا ہے وہ اس کا اجر نہیں پاتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (بقرہ ۲۶۴)

اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع نہ کرو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ مدد دے کر احسان جتلانے والا خسارہ مند ہوتا ہے۔ (مسلم)

خدمت خلق کی صورتیں : خدمت خلق انجام دینے کی مندرجہ ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں :۔

۱۔ **حقوق العباد کی ادائیگی :۔** خدمت خلق کی سب سے اولین صورت حقوق العباد کی ادائیگی ہے۔ اگرچہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی ہر انسان پر واجب ہے لیکن اگر اس واجب کو بطریق احسن ادا کیا جائے تو یہ بہت بڑی خدمت خلق ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ حقوق العباد اور خدمت خلق کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔

حقوق العباد میں سرفہرست والدین کے حقوق ہیں۔ اسی لئے قرآن پاک میں توحید باری تعالیٰ کے بعد اطاعت والدین کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن پاک نے حکم دیا ہے :۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (انعام ۱۵۲) (اور والدین کے ساتھ احسان کرو)

یعنی والدین کو ہر طرح کا آرام پہنچایا جائے ان کی تکالیف کو دور کیا جائے اور خورد و نوش اور لباس کا اہتمام کیا جائے اور حسن سلوک سے پیش آیا جائے۔ اسی طرح والدین پر بھی لازم ہے کہ اولاد کی اچھی تربیت کریں اور حسب حیثیت معقول تعلیم

دلانیں۔ ان سب امور کا بطریق احسن انجام دینا خدمت خلق ہے۔

والدین اور اہل وعیال کی خدمت کے بعد رشتہ دار خدمت کے مستحق ہیں چنانچہ قرآن پاک میں بار بار تاکید کی گئی ہے۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی (اور خدا رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے) وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی (اور مومن خدا کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں کو دیتے ہیں) اسلام نے رشتہ داروں سے سلوک کو صلہ رحمی کا نام دیا ہے اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صلہ رحمی کی بہت تاکید فرمائی ہے۔

ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک بھی خدمت خلق میں شمار ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں خدا تعالیٰ نے اس کی یوں تاکید فرمائی ہے۔ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ (اور خدا نے ہمسایہ قریب اور ہمسایہ اجنبی اور پہلو کے ہمسایہ کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ہمسایہ کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے اور اس کی ہر ممکن امداد کی جائے۔

۲- حاجت مندوں کی امداد: خدمت خلق کی دوسری اہم صورت معاشرہ کے حاجت مند افراد کی مدد و اعانت کرنا ہے۔ یتیم، بیوہ، مسکین، مسافر، بیمار، سوالی، غلام اور حتیٰ کہ مہمان وغیرہ سبھی خدمت کے مستحق ہیں اور اسلام نے سبھی کی خدمت کرنے کی تلقین کی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ (اور وہ خدا کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں، مانگنے والوں اور گردنیں چھڑانے میں خرچ کرتے ہیں۔

یتیم وہ کمسن و بے کس ہے جو باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہے لہٰذا اس کی پرورش کرنا تعلیم و تربیت دلانا اور اس کے مال کی حفاظت کرنا بہت بڑی خدمت خلق ہے قرآن پاک نے اس بارے میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا۔

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ (پس تو یتیم پر غصہ نہ کر) اسی طرح بیوہ بھی معاشرے کی وہ بے یار و مددگار رکن ہے جس کا شریک حیات اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہو۔ اسلام نے اس کے شریک زندگی کی معیت کا انتظام کرنا بھی خدمت خلق ٹھہرایا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے :-

وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ اپنے میں سے بیواؤں کے نکاح کرا دو

معاشرے کے محتاج و ضرورت مند افراد کی مدد کرنا بھی خدمت خلق ہے مثلاً" بھوکے کو کھانا کھلانا۔ ننگے کو کپڑا پہنانا اور ضرورت مند کی مالی امداد کرنا خدمت خلق کے کام ہیں۔ اسلام نے اس ضمن میں اس قدر تاکید کی ہے کہ صاحب ثروت و کشائش کی دولت میں حاجت مند کا حق ٹھہرایا اور سائل کو جھڑکنے سے منع کر دیا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :- وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والے اور محروم کا حق ہے) ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (اور سائل کو نہ جھڑک)

اسی طرح بیمار کی عیادت کرنا دوا مہیا کرنا اور اسے مالی امداد دینا اور مصیبت زدہ کو مصیبت سے نجات دلانا بھی خدمت خلق کے کام ہیں۔

مسافروں اور مہمانوں سے حسن سلوک سے پیش آنا ان کی ضروریات پوری کرنا اور انہیں مکمل آرام پہنچانا خدمت خلق میں شامل ہے۔ اسی طرح غلاموں اور اسیروں سے شفقت کا سلوک کرنا اور انہیں آزادی دلانا بھی خدمت خلق ہے۔ اسلام نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی یہاں تک تاکید کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو تم خود پہنو انہیں بھی وہی پہناؤ اور جو خود کھاؤ انہیں بھی

دہی کھلاؤ۔

غرضیکہ ہر مسلمان کا دوسرے کی کسی بھی قسم کی حاجت پوری کرنا خدمت خلق ہے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک قابل ثواب ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ تو وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرے گا۔ (بخاری)

۳۔ رفاہ عامہ کے کام: خدمت خلق کی ایک وسیع صورت رفاہ عامہ کے کام انجام دینا ہے۔ مثلاً مساجد کی تعمیر، شفاخانوں کا قیام، سرائیں، کنوئیں، سڑکیں بنوانا، مکتب مدارس اور لائبریریوں کا اہتمام وغیرہ سب خدمت خلق کے کام ہیں۔ اور یہ سب امور صدقہ جاریہ ہیں یعنی جب تک یہ کام جاری رہتے ہیں ان کا ثواب ان کو کرنے والے کو ہمیشہ پہنچتا رہتا ہے۔

۴۔ تبلیغ: خدمت خلق کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ لوگوں کو برائی و بدی کے راستے سے روکا جائے اور اچھائی اور نیکی کی تلقین کی جائے درحقیقت بنی نوع انسان کی اس سے بڑھ کر اور کیا خدمت ہو سکتی ہے کہ انہیں گمراہی اور تباہی سے بچایا جائے اور فلاح و کامرانی کے صحیح راستے پر گامزن کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یہ کام مسلمانوں پر فرض ٹھہرا دیا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۱۰) تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہو تاکہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔

اسلام نیکی کی اس حد تک تاکید کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص خود نیکی نہ کر سکے تو اسے چاہیئے کہ کسی دوسرے کو اس کی تلقین کر دے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والا نیکوکار کی مانند ہے۔ آپ نے ایک حدیث میں

واضح طور پر فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ ہاتھ سے روکے اور اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے منع کرے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

۵۔ **جانوروں پر شفقت:** اسلام نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں کے ساتھ بھی شفقت و نرمی کا برتاؤ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کے ساتھ نہایت مشفقانہ سلوک کیا کرتے تھے۔ اور آپ نے مسلمانوں کو بھی اس امر کی تاکید فرمائی کہ جانوروں کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھا جائے جیسا کہ آپ نے فرمایا "جب تم سواریوں پر سوار ہوا کرو تو انہیں منزلوں پر آرام کرنے کا موقع بھی دیا کرو اور ان کی پیٹھ پر شیطان بن کر مت بیٹھا کرو" ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جب تم خوش حالی کے زمانے میں سفر کرو تو اونٹوں کو ان کا حصہ زمین میں سے دو اور جب تم قحط کے زمانے میں سفر کرو تو ان کو تیز چلاؤ (مسلم) آپ کی مراد یہ تھی کہ سرسبزی کے زمانہ میں انہیں دوران سفر گھاس و چارہ کھانے کا موقع دو لیکن قحط کے زمانہ میں تیز چلا کر جلد منزل مقصود تک پہنچاؤ تاکہ راستے میں بھوک سے نڈھال نہ ہوں۔ جانوروں کو بلا ضرورت ذبح کرنے باندھ کر مارنے۔ اور ان کے ساتھ برا سلوک کرنے سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ ایک عورت محض اس جرم کی پاداش میں عذاب جہنم کی سزاوار ٹھہری کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا۔ نہ اسے کھلاتی تھی نہ پلاتی تھی ونہ اسے چھوڑتی تھی کہ از خود اپنے لئے رزق تلاش کرے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کو لڑانے سے بھی منع فرمایا ہے۔

جانوروں کو کسی مشکل یا مصیبت سے نجات دلانا اور بھوکے پیاسے کو کھلانا پلانا بھی بہت بڑی نیکی اور ثواب کا کام ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص سفر پر تھا کہ راستے میں پیاس لگ گئی۔ ادھر ادھر دیکھا ایک کنواں

نظر آیا۔ اس میں پیاس بجھا کر اوپر آیا تو ایک کتا پیاس کی وجہ سے کنویں کے کنارے نم آلود مٹی چبا رہا تھا اس شخص کو رحم آیا اور دوبارہ کنویں میں اتر گیا۔ اس کے پاس ڈول نہ تھا اپنے موزہ پانی سے بھرا منہ میں تھام کر باہر نکلا اور کتے کی پیاس بجھائی۔ خدا تعالیٰ کو اس کا یہ فعل پسند آیا اور اس کی بخشش کر دی۔ صحابہؓ نے یہ سن کر پوچھا کہ حضورؐ کیا جانوروں سے سلوک کا بھی ثواب ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں ہر ذی روح چیز کی خدمت میں ثواب ہے۔

فوائد و ثمرات: خدمت خلق کے دنیا و آخرت ہر دو جگہ بے شمار فوائد ہیں:۔

۱. اس سے انسانوں میں باہمی ہمدردی و تعاون کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کو مشکلات و مصائب سے نجات ملتی ہے اور خوشحال زندگی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔

۲. آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ لوگوں کے دکھ و مصائب دور کرے گا ان کے گناہوں میں کمی کر دے گا اور ان کی مغفرت کر دے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک شخص نے راستہ سے شاخ ہٹا دی تو اللہ نے اسے بخش دیا (مسلم)

تدبّر

مفہوم تدبر کا لفظ "دبر" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں آخری حصہ، پچھا اور انجام گویا تدبر کے لغوی معنی کسی چیز کے انجام و نتیجہ کو سوچنا اور غور و فکر کرنا ہے تدبّر دراصل کسی معاملے کے آغاز و انجام پہ انتہائی غور و فکر کر کے اس کی اصلیت و حقیقت اور اثرات جاننے کا نام ہے امام غزالیؒ نے تدبر کو تامل (یعنی سوچ بچار کرنا) اور تفکر (یعنی انتہائی غور و فکر کرنا) کے مترادف قرار دیا ہے۔ قرآن پاک میں حکمت کا لفظ بھی تدبّر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اصطلاح شریعت میں تدبر سے مراد ذات اور نظام کائنات پر انتہائی غور و خوض کر کے معرفت ربانی حاصل کرنا ہے تاکہ اس کی رضا و خوشنودی کے مطابق زندگی بسر ہو۔

تدبر کی حقیقت تدبر ہر وقت اور ہر لحہ ہر بات کے بارے میں بے مقصد سوچتے رہنے کا نام نہیں اور نہ ہی اس سے مراد یہ ہے کہ انسان فضول و بیکار اور لایعنی باتوں میں وہم کرتا رہے بلکہ تدبر اس غور و فکر کا نام ہے جو بامقصد ہو تدبر کا مقصود یہ ہے کہ انسان اپنی ذات، کائنات اور قدرت خداوندی پر غور و خوض کر کے اپنی حقیقت جاننے اور معرفت الٰہی حاصل کرے۔

تدبر دراصل تعقل (یعنی عقل کو استعمال کرنا) اور تفکر (یعنی انتہائی غور و فکر) کی اعلیٰ ترین صورت کا نام ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

لَا عَقْلَ عَالتَّدْبِيْرِہ (تدبیر کی طرح کوئی عقل نہیں)

تدبر کے مدارج حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تدبر کے دو درجات بیان کئے ہیں ایک ادنیٰ اور دوسرے اعلیٰ

ا۔ ادنیٰ تدبر: یہ عوام کا تدبر ہے جو اپنی معمولی علم اور سرسری معلومات کے ذریعہ زمین و آسمان اور نظام کائنات پر غور و فکر کر کے خالق و مالک کائنات کو پہچان لیتے ہیں ہر شخص کا علم ایک سا نہیں ہوتا اس لئے ہر شخص سے اس کے علم کے مطابق غور و تدبر کی توقع کی جاتی ہے۔

کہ وہ علم و حکمت کے اسرار کو سمجھتا ہو۔ سائنسی و تحقیقی نگاہ رکھتا ہو۔ اور کائنات کے پوشیدہ رازوں اور حقائق کو جان سکتا ہو یہ مقام صرف اہل علم کا ہے لہذا عوام سے یہی امید رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے عام علم سے ہی معمولی حد تک غور و فکر کریں جیسے ادنیٰ تدبر کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں اس سلسلے میں عامۃ الناس کو یوں دعوت دی گئی ہے۔

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝

وہ کیوں غور کی نگاہ نہیں ڈالتے اونٹوں پر کہ وہ کیسے پیدا کئے گئے ہیں اور آسمان پر کہ وہ کیسے بلند کیا گیا ہے، اور پہاڑوں پر کہ وہ کیسے گاڑے گئے ہیں اور زمین پر کہ وہ کیسے بچھائی گئی ہے۔ (الغاشیہ ۲۰)

ب۔ اعلیٰ تدبر: یہ علماء کا تدبر ہے جو اپنے علم اور بصیرت سے کائنات کے اسرار و رموز اور حقائق کا سراغ لگا کر معرفتِ الٰہی کے دلائل مہیا کرتے ہیں یا قرآن و احادیث پر غور و فکر کر کے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں اعلیٰ تدبر محض علم اور سرسری معلومات سے نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کے لئے بعض شرائط کا ہونا لازمی ہے وہ شرائط یہ ہیں:۔

ا۔ تقویٰ:۔ اعلیٰ تدبر کرنے والے کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ متقی ہو اس کے دل میں خوف خدا ہو تاکہ اس کی سوچ اور تفکر صحیح راہ پر رہے۔

• (۲) علم:۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عالم ہو۔ اسے قرآن و سنت کے علاوہ سابقہ

علما کے افکار اور ان کی تحقیقات سے پوری واقفیت ہو۔

(iii) فنی مہارت: علم کے علاوہ اسے تدبر کے لئے فنی مہارت بھی ہونا چاہیئے۔ مثلاً تدبر فی القرآن کے لئے عربی زبان و قواعد میں بھی مہارت ضروری ہے۔

(iv) تحمل: یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مسئلہ تحمل سے غور و خوض کیا جائے کیونکہ جلد بازی میں اکثر غلط نتیجہ اخذ کرنے کا خدشہ ہوتا ہے۔

تدبر کی حد اسلام نے جہاں تدبر پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور قرآن و سنت میں اس کی بار بار تاکید کی گئی ہے وہاں اس کی بعض حدود بھی مقرر کی گئی ہیں۔ تدبر کی حدود حسب ذیل ہیں۔

۱۔ قرآن و سنت کے تابع ہونا تدبر عقل سے کیا جاتا ہے۔ اور عقل اگرچہ بہت مفید شے ہے لیکن اگر اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور گمراہی کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ لہٰذا عقل کو قرآن و سنت کے تابع رکھنا اشد ضروری ہے، عقل کو نصب العین نہ بنانا چاہیئے، بلکہ اس سے مشعل راہ کے طور پر کام لینا چاہیئے۔

۲۔ ممنوع اشیاء میں کرید سے اجتناب قرآن و سنت نے جن اشیاء میں کرید کرنے اور ضرورت سے زیادہ تفکر کرنے کی ممانعت کی ہے ان سے بچنا چاہیئے، کیونکہ ان میں بھی گمراہی کا اندیشہ ہے۔ مثلاً ذات و صفات باری میں تدبر نہ کرنا چاہیئے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مخلوق میں غور و فکر کرو مگر خالق کی ذات میں تفکر نہ کرو۔ اسی طرح تقدیر کے مسئلہ میں بھی بہت زیادہ تفکر کرنا درست نہیں کیونکہ اس میں بھی بھٹکنے کا اندیشہ ہے۔

اہمیت

اسلام میں تدبر کی اہمیت مندرجہ ذیل دلائل سے واضح ہوتی ہے:۔

۱۔ ایک اہم ضرورت تدبر صرف مذہبی نقطہ نظر سے ہی اہم نہیں بلکہ معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی حیثیت سے بھی یہ ضروری ہے۔ انسان زندگی کے بیشتر معاملات و مسائل

اور الجنوں کا حل تدبر ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، قرآن و سنت پر تدبر کے ذریعہ انسان معاملات کی تہہ تک پہنچتا ہے، حقائق کو پہچانتا ہے، اور بہت سی لغزشوں اور خطاؤں سے بچ جاتا ہے انسان بعض اوقات کسی معاملے کو سطحی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور ظاہریت کے فریب میں آکر بھٹک جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ تدبر و تفکر سے کام لے تو گمراہی کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا مسلمانوں کے تدبر و تفکر کا ہی نتیجہ ہے کہ علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ اور دیگر علوم عقلیہ وجود میں آئے حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمان تدبر کی راہ پر گامزن رہے انہوں نے ترقی کے مدارج طے کئے اور اقوام عالم میں انہیں برتری حاصل رہی۔

۲۔ فضیلت انسانی کا باعث تدبر انسان کی امتیازی صفت اور جملہ مخلوقات پر اس کی برتری و شرف کا باعث ہے انسان کو جو چیز دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی عقل ہے اسی عقل کی بنا پر وہ معرفت الٰہی حاصل کرتا ہے۔ اور اسی کی بدولت وہ کائنات کے جملہ اسرار و رموز کو پہچان کر اسے مسخر و مطیع بناتا ہے اس طرح انسان کو تدبر و تفکر کی بنا پر اشرف المخلوقات کا مقام حاصل ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر عقل سے کام نہ لے۔ اور تفکر و تدبر نہ کرے تو اس کی حیثیت محض حیوانات کی سی رہ جاتی ہے، بلکہ دیکھا جائے تو جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ حیوانات سے بھی بدتر ہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت کو استعمال نہ کر کے ناشکری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کرام نے تدبر کو عبادت قرار دیا ہے۔

۳۔ قرآن پاک میں تاکید قرآن پاک میں متعدد مقامات پر تدبر کی تاکید آئی ہے اور بنی نوع انسان کو تدبر کی دعوت دی گئی ہے ارشاد فرمایا

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا - (محمد ۲۴)

«لوگ کیوں قرآن میں غور نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر قفل پڑ گئے ہیں»

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ

بے شک آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے آنے جانے میں عقلمندوں کے لئے

لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (آل عمران ۹) نشانیاں ہیں

قرآن حکیم نے تدبر سے کام نہ لینے والوں کو حیوانات سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۝ (اعراف ۱۷۹)

(اور ہم نے جن اور انسانوں میں بہت سے ایسے افراد پیدا کئے جن کی عاقبت جہنم ہے ان کے دل ہیں لیکن غور و فکر نہیں کرتے ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں ہیں ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے تک نہیں۔ وہ چوپائیوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر یہی لوگ حقیقت میں گمراہ ہیں۔

۴۔ ارشاداتِ نبوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تدبر کی بہت ہی تاکید فرمائی ہے آپ کے بعض ارشادات درج ذیل ہیں۔

(i) آپ نے فرمایا کاموں میں (غور و فکر کر کے) تاخیر کرنا اللہ کی طرف سے ہے اور کاموں میں جلد بازی کرنا شیطان کی طرف سے ہے۔

(ii) آپ نے فرمایا ایک گھڑی کا تفکرات بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ ایک گھڑی کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

(iii)۔ آپ نے فرمایا تباہی ہے اس شخص کے لئے جس نے آیۃ کریمہ ان فی خلق السموات والارض۔ ۔ ۔ پڑھی اور پھر اس پر تفکر نہ کیا۔

(iv) ایک صحابیؓ کو نصیحت کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا کہ ہر کام کو تدبر کے تحت رکھ اور اگر تو سمجھے کہ اس کام میں بھلائی ہوگی۔ تو انجام دے اور اگر گمراہی کا ڈر ہو تو اسے انجام نہ دے۔

(v) حضورؐ نے ایک اور صحابیؓ سے فرمایا کہ دو باتیں ہیں جنہیں خدا تعالیٰ پسند کرتا ہے ایک تحمل اور دوسرا تدبر۔

(vi) ایک مرتبہ صحابہؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور نہ کیا کرو۔ ہاں اسی کی مخلوق کے

متعلق خوب غور و فکر کیا کرو۔

(vii) حضرت معاذ بن جبلؓ کو حاکم یمن بنا کر روانہ کیا تو پوچھا اے معاذ بتاؤ لوگوں کے مقدمات کس طرح فیصلے کرو گے۔ معاذؓ نے جواب دیا پہلے قرآن سے۔ پھر سنت رسول سے۔ اور جب حل نہ ملے تو تدبر و فکر سے۔ حضورؐ نے فرمایا خدا کا شکر ہے جس نے ہدایت دی ہے۔

۵۔ اسوۂ رسولؐ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف مسلمانوں کو تفکر و تدبر کی تاکید فرمائی ہے بلکہ خود بھی اس کی عملی مثال پیش کی ہے۔ آپؐ سراپا حکمت و دانش اور تدبر تھے آپ کی زندگی میں بے شمار ایسے مواقع پیش آئے۔ آپ نے تدبر سے کام لیتے ہوئے بڑی کٹھن الجھنوں کو حل فرما دیا۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

(i) زمانہ قبل از نبوت میں خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے سلسلے میں حجر اسود کے نصب کرنے پر سرداران قریش میں زبردست انتشار پیدا ہوا۔ تلواریں سونت لی گئیں، حضورؐ نے اپنی فراست اور تدبر سے اسی جھگڑے کو اس خوش اسلوبی سے نمٹایا کہ حجر اسود کو ایک چادر پر رکھا اور سب سردار اس چادر کو پکڑ کر خانہ کعبہ کی دیوار تک لے گئے۔ اسی طرح ایک خون ریز جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

(ii) ہجرت کے موقع پر دشمنوں کے نرغے سے صاف بچ نکلنا آپؐ کے تدبر کی اعلیٰ مثال ہے

(iii) ہجرت کے بعد جب آپؐ مدینہ تشریف لے گئے، تو ہر شخص کی خواہش تھی کہ حضورؐ اس کے ہاں قیام فرمائیں۔ لیکن اگر آپ کسی کی میزبانی قبول فرما لیتے تو دوسروں کو اعتراض ہوتا لہذا آپؐ نے فرمایا کہ اس اونٹنی کو جہاں خدا کا حکم ہوگا بیٹھ جائے گی اور وہیں ہمارا قیام ہوگا۔ اس طرح آپ نے تدبر و تعقل سے ہر طرح کی چہ میگوئیاں کا خاتمہ کر دیا۔

(iv) مدینہ پہنچتے ہی آپؐ کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف مہاجرین کا مسئلہ کا گروہ بے سروسامانی کے عالم میں پہنچے تھے۔ دوسری طرف یہود مدینہ کی سازشوں اور کفار مکہ کی یلغاروں کا اندیشہ تھا۔ حضورؐ نے اپنے حسن تدبر سے یہ سارے مسائل حل کر دیئے۔ مہاجرین اور انصار کے مابین مواخات قائم کر دیں۔ اور یہود کے ساتھ ایک

دفاع کا معاہدہ کیا جسے میثاق مدینہ کہتے ہیں۔

(۷) صلح نامہ حدیبیہ آپؐ کے تدبر و فراست کی نہائیت اعلیٰ مثال ہے اس سے نہ صرف مکہ فتح ہوا۔ بلکہ اسلام کی نشر و اشاعت کے لئے راہیں ہموار ہو گئیں۔ اور جلد ہی اسلام تمام حدود عرب میں پھیلنے لگا۔

(۸) فتح مکہ کے وقت اپنے سنگین ترین دشمنوں کے لئے عفو عام کا اعلان آپؐ کے تدبر و فراست کی ایک اور مثال ہے، اس نے دشمنان اسلام کے دل موہ لئے اور وہ دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

۴۔ اقوال و آثار

"تدبر" کی اہمیت میں صحابہؓ تابعین اور علمائے امت کے بھی متعدد اقوال ہیں جن میں سے بعض درج ذیل ہیں۔

(۱) حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک لحہ سوچ بچار کرنا ایک شب قیام کرنے سے بہتر ہے۔

(۲) حضرت سفیان بن عینیہ فرمایا کرتے تھے، کہ جب آدمی غور و فکر کی عادت ہو تو ہر چیز میں اس کے لئے سامان عبرت ہے۔

(۳) حضرت فضیل بن عیاض کہتے ہیں کہ تدبر ایک آئینہ ہے جس میں تم اپنے اعمال کا عکس دیکھ سکتے ہو۔

(۴) حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے، کہ اللہ کی نعمتوں میں غور و فکر بہت بڑی عبادت ہے۔

(۵) حضرت حسن بن ابوالحسن فرماتے ہیں کہ تفکر مومن کا آئینہ ہے، جس میں وہ اپنی خوبیاں اور خرابیاں دیکھتا ہے۔

تدبّر کی صورتیں

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر تدبر و تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ ان آیات کی روشنی میں تدبر کی مندرجہ ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں:۔

۱۔ **اپنی ذات میں تدبر:** تدبر کی اولین صورت یہ ہے کہ انسان اپنی ذات پر تفکر و تدبر کرے کیونکہ انسان سب سے زیادہ دھوکا اپنی ذات کے بارے میں کھاتا ہے۔ وہ اکثر اپنی ذات منفعت اور دنیاوی جاہ و حشمت میں کھو کر اپنے انجام کو بھول جاتا ہے۔ اور اس طرح ذات باری تعالیٰ سے بھی غافل رہتا ہے کلام خداوندی کو فراموش کر کے اپنی پسند اور خواہش کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ گمراہی اور آخرت میں رسوائی ہے۔

اسلام اسی لئے انسان کو اپنی ذات میں تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی ذات کی تخلیق اور انجام پر غور کر کے خدا کو پہچانے اور اسی کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے تاکہ اس کی رضا و خوشنودی حاصل ہو۔ اور اسے جنت کی ابدی زندگی حاصل ہو سکے۔ چنانچہ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ (الروم ۸) (وہ کیوں اپنی ذات پر غور و فکر نہیں کرتے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ (جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا)

اپنی ذات پر تفکر کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان اپنی پیدائش کی غرض و غایت کو پہچانے اور یہ جانے کہ اس نے کہاں رجوع کرنا ہے اور اس کی فلاح کا انحصار کن باتوں پر ہے۔

۲۔ **قرآن حکیم میں تدبر:** تدبر کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان قرآن حکیم پر غور و خوض کرے اور مطالب آیات کو جاننے کی کوشش کرے تاکہ اسے ذات ربانی اور احکامات ربانی کی معرفت حاصل ہو۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (یہ لوگ کیوں قرآن میں غور نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔ (محمد ۲۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ (ہم نے اس کتاب کو آپ کی طرف اتارا تاکہ اس کی

آئینہ د ص ۹۲۹ آیات پر تفکر و تدبر کیا جائے۔

قرآن پاک میں عبادات سے معاملات تک اور معیشت سے سیاست تک ہر شعبہ زندگی کے لئے رہنمائی موجود ہے، یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، لیکن یہ رہنمائی صرف اسے ہی مل سکتی ہے جو قرآن پاک پر تدبر و تفکر کرے۔ قرآن حکیم کو ترتیل کے ساتھ یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا اسی لئے حکم ہے۔ کہ اس کی آیات پر تدبر کیا جا سکے۔ اور صحیح مطالب کا فہم حاصل ہو حضور اکرمؐ تمام رات ایک ہی آیت بار بار پڑھتے رہے۔ جس کا مقصد تدبر کرکے فہم حاصل کرنا تھا۔ حالانکہ آپؐ صاحب قرآن تھے، صحابہؓ کی زندگیوں میں بھی ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں۔

قرآن پاک سے آنکھیں بند کرنا کفار و منافقین کا شیوہ ہے۔ مسلمان کیلئے لازم ہے کہ وہ قرآن حکیم پر تدبر کرتا رہے۔

۲۔ کائنات میں تدبر: تدبر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان کائنات کے نظام اور کارخانہ قدرت پر غور و خوض کرے۔ کیونکہ اس سے معرفت ربانی حاصل ہوتی ہے۔

انسان اگر نظام عالم پر نظر ڈالے اور جوں جوں تفکر و تدبر کرتا چلا جائے اس پر یہ حقیقت عیاں ہوگی یہ نظام خود بخود نہیں چل رہا۔ بلکہ اس کے پیچھے کوئی غیر قانونی قوت و طاقت کارفرما ہے۔ زمین و اجرام۔ فلکی کی گردش۔ سورج کا مشرق سے طلوع ہونا اور مغرب میں غروب ہونا۔ رات اور دن کا بدلنا۔ موسموں کا تغیر و تبدل سمندروں میں کشتیوں کا چلنا اور ہوا میں جہازوں کا اڑنا۔ اس سارے نظام میں باقاعدگی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس کا کوئی خدا ہے۔ پھر زمین و آسمان کی تخلیق اور کائنات کا ہر ذرہ ذات ربانی کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن پاک نے متعدد بار کائنات میں تفکر کی دعوت دی ہے۔

فرمایا:۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ	بیشک آسمان و زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں

لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۔ (آل عمران ۱۹۰ ہیں)

یہ تدبر کائنات کا ہی نتیجہ تھا ۔ کہ مسلمانوں نے اشیائے کائنات کے تحقیق اور تجرباتی مطالعہ کی طرح ڈالی اور اہل عالم کے لئے سائنسی علوم کی راہ ہموار کی ۔

۴- تاریخی حقائق میں تدبر: تدبر کی ایک صورت تاریخی حقائق اور آثارِ قدیمہ میں غور و فکر کرنا ہے کیونکہ اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے اور انسان قدرت خداوندی کو پہچانتا ہے ۔ قرآن حکیم میں محض تاریخی واقعات اور گذشتہ اقوام کے عبرت ناک واقعات کا ذکر صرف اسی لئے ہوا ہے کہ ان پر انسان غور و فکر کرکے عبرت حاصل کرے قرآن حکیم نے آثارِ قدیمہ، اجڑی ہوئی بستیوں اور کھنڈرات کی طرف بار بار انسان کی توجہ بھی اسی لئے دلائی ہے ۔ تاکہ وہ غور کرکے ان سے عبرت و موعظت حاصل کرے ۔ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے ۔

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

کیا انہوں نے سیر نہیں کی زمین کی ۔ وہ دیکھیں ان لوگوں کا انجام کیا ہوا ۔ جو ان سے پہلے تھے ۔ (سورۃ روم ۹)

۵- آخرت میں تدبر: تدبر کی ایک صورت آخرت یعنی موت اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات پر غور و خوض ہے ۔ اس میں جزا و سزا، حشر و نشر، جنت و جہنم سب امور شامل ہیں ۔ ان پر تفکر و تدبر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دنیا داری اور مادیت سے ہٹ کر خدا تعالیٰ کی طرف توجہ مبذول کرتا ہے ۔ اور اس میں اطاعت خداوندی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص دنیوی مشاغل سے فارغ ہو کر تنہائی میں امورِ آخرت پر غور کرے گا ۔ تو اس کی نفسانی خواہشات پر روحانی قوت غالب آجائے گی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا اس کی عبادات میں خشوع و خضوع پیدا ہو گا۔"

تدبر کے ثمرات و فوائد: تدبر کے ثمرات و فوائد بے شمار ہیں۔ جس میں سے زیادہ اہم یہ ہیں
(۱) معرفت ربانی حاصل ہوتی ہے ۔ اور ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے ۔

(۲) اطاعتِ خداوندی کا جذبہ بڑھتا ہے اور انسان کی عبادات میں خشوع وخضوع پیدا ہوتا ہے۔

(۳) علم و فن اور حکمت و دانش کی راہیں کھلتی ہیں۔ اور انسان تسخیر کائنات کی طرف مزید قدم بڑھاتا ہے۔

(۴) انسان کو اشرف المخلوقات کا بلند مقام حاصل ہوتا ہے۔

(۵) آخرت میں فلاح و کامرانی حاصل ہوتی ہے۔

تحمل

مفہوم

تحمل کا لفظ "حمل" سے ماخوذ ہے جس کے معنی "اٹھانا" ہیں۔ تحمل کے لغوی معنی اٹھانا، برداشت کرنا، حلم و بردباری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اصطلاح شریعت میں تحمل کا مفہوم یہ ہے کہ مخالفت، تکلیف اور ناگوار بات کو صبر و حوصلہ سے بخوشی برداشت کرنا اور قدرت کے باوجود انتقام نہ لینا ہے۔ غصہ سے مغلوب ہو کر یا جذبات سے مشتعل ہو کر جلد بازی نہ کرنا اور زیادتی کرنے والے شخص کو نہایت فراخدلی اور عالی حوصلگی سے معاف کر دینا اور اس سے نرمی و بردباری اور تواضع اور خندہ پیشانی سے پیش آنا ہے دراصل تحمل اور حلم دونوں ہم معنی اور ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔

اہمیت

اسلام میں تحمل کی اہمیت کے مندرجہ ذیل پہلو ہیں۔

۱۔ معاشرہ میں قیام امن کا باعث

انسان کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں سینکڑوں افراد سے واسطہ پڑتا ہے، بعض لوگ تو ایسے ملتے ہیں جو اس کی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہوتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا مزاج اس سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ وہ اس کی طبیعت کے خلاف باتیں کر دیتے ہیں۔ جو اس کے لئے ناگوار ہوتی ہیں۔ اس اختلاف طبیعت سے بگاڑ اور انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ایسے حالات میں جو چیز اس انتشار کو روک سکتی ہے اور معاشرہ کا امن و سکون برقرار رکھ سکتی ہے۔ وہ صفت تحمل ہے اگر انسان میں یہ صفت موجود ہو تو وہ اپنے مخالفین کو برداشت کر سکتا ہے۔ ان کی باتیں سن کر ان کا مدلل جواب دے سکتا ہے۔ اور جہاں دوسرا فریق بات سننے پر آمادہ نہ ہو اس کی ناگوار باتیں سن کر نظر انداز کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تحمل انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں برداشت و بردباری کا سبق دیتا ہے اور اگر افراد معاشرہ میں یہ صفت موجود نہ ہو تو ایسے معاشرہ میں کبھی امن و سکون پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر وقت بگاڑ اور خرابی پیدا ہوتی رہے۔ اسی طرح انفرادی زندگی میں بھی صرف وہی شخص کامیابی و کامرانی حاصل کر سکتا ہے جس میں تحمل کی صفت موجود ہو کیونکہ وہ اس وصف کی بدولت ہر ناگوار اور گراں بات کو برداشت کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

لہٰذا ایک خوشگوار معاشرتی زندگی کے قیام کے لئے تحمل ایک لازمی عنصر ہے۔

تحمل کی حقیقت

تحمل کسی مجبوری و بے بسی اور کمزوری کا نام نہیں اور نہ ہی تحمل سے یہ مقصود ہے کہ انسان اپنی غیرت و حمیت، عزت نفس اور خودداری کو ختم کر کے بے عزت و بے غیرت بن جائے۔ اور دوسروں کی زیادتیوں کو برداشت کرتا چلا جائے بلکہ تحمل کا اصل مفہوم یہ ہے کہ کسی مصلحت یا ضرورت کے تحت حلم و بردباری سے کام نہ لیا جائے بلکہ قدرت و طاقت رکھنے کے باوجود ناگوار بات کو برداشت کرنا غصہ کو پی جانے اور دوسرے کو معاف کر دینا ہے۔

تحمل اور صبر میں فرق

تحمل اور صبر میں مندرجہ ذیل فرق ہے۔

(۱) تحمل کے معنی حلم و بردباری کے ہیں اور یہ صبر کا ایک جزو اور حصہ ہے۔ جبکہ صبر کے معنی برداشت کرنا اور سہارنا ہیں اور یہ ساری زندگی پر محیط و حاوی ہے۔ تحمل کے معنی محدود ہیں، جبکہ صبر کے معنوں میں بہت زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔

۲۔ تحمل کا تقاضا ہے کہ انسان ہمیشہ برداشت ہی کرتا چلا جائے لیکن اس کے برعکس صبر ضرورت پڑنے پر مقابلہ اور غلبہ کا بھی تقاضا کرتا ہے۔

۳۔ تحمل میں ثابت قدمی صرف ایک شرط کی حیثیت رکھتی ہے جبکہ صبر میں اثبات و استقامت ایک رکن ہے۔

۴۔ تحمل صبر کی جانب پہلا قدم ہے۔ اور تحمل کے بغیر صبر کی توقع نہیں کی جا سکتی یا یوں کہیئے کہ جس شخص میں تحمل نہیں اس میں صبر ہونا ممکن نہیں۔

تحمل کے مدارج علماء نے تحمل کے دو درجے یا مرتبے بیان کئے ہیں۔ ایک ادنیٰ، اور دوسرے اعلیٰ۔

ا۔ ادنیٰ درجہ: تحمل کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان کوشش اور جدوجہد سے اپنے نفس کو برداشت کا عادی بنائے۔ اپنے جذبات و احساسات پر دباؤ ڈال کر طبیعت کو غصہ پی جانے کا خوگر کرے۔

ب۔ اعلیٰ درجہ:۔ تحمل کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ علم و بردباری کا ملکہ انسان میں ایسا راسخ و مستحکم ہو جائے کہ وہ بڑی سے بڑی مصیبت، تکلیف اور پریشانی کو بغیر کسی جبر یا تکلیف سے برداشت کرے۔ رنج و غم اور دکھ و تکلیف کے آثار اس کے چہرے سے عیاں نہ ہوں۔ بلکہ یہ برداشت اس کی طبیعت کا جزو بن جائے۔

تحمل کی حد تحمل ایک نہایت عمدہ وصف ہے جہاں تحمل کمزوری و لاچاری کا نام نہیں۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ تحمل کو اس حد تک نہ بڑھنے دیا جائے کہ بے غیرتی میں بدل جائے۔ دراصل ذاتی معاملات میں حتی الامکان تحمل اختیار کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر انسان کی عزت اور اس کے دین پر حملہ ہو رہا ہو تو وہاں تحمل درست نہیں بلکہ بلا ڈر کے ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔

چنانچہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے اپنے ہاتھ سے کبھی کسی کو نہیں مارا۔ اور نہ ہی کبھی ایسا ہوا کہ کسی نے آپ کو تکلیف یا ایذا پہنچائی ہو۔ اور آپ نے اس سے انتقام لیا ہو۔ لیکن جب خدا تعالیٰ کے دین متین کے اصولوں کی ہتک اور رسوائی ہوئی تھی۔ تو آپ صرف خدا کی خاطر بدلہ لیتے تھے۔ یہی صفت خلفائے راشدین میں بھی

تھی۔ کہ ذاتی معاملات میں تحمل سے کام لیتے تھے۔ مگر دینی معاملات میں انتقام کے لئے تیار رہتے تھے۔

اسی طرح اپنی عزت اور اپنے مال و متاع کی حفاظت کی خاطر بھی ڈٹ کر مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ حضور نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنی عزت کی خاطر جان دے وہ شہید ہے۔ اور جو اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے، وہ بھی شہید ہے۔ قرآن پاک نے مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے جہاں یہ فرمایا کہ وہ آپس میں مہربان ہوتے ہیں وہاں یہ بھی فرمایا۔ کہ وہ کفار سے مقابلہ میں بہت سخت ہوتے ہیں۔

۲۔ صفت الٰہی

تحمل اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات میں سے ایک ہے اور اس کے صفاتی ناموں میں ایک نام حلیم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ حلیم ہے اور اپنے بندوں پہ بردباری کرتا ہے۔ اور یہی صفت اپنے بندوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پہ حلیم نہ ہو۔ اور ہر بات پر پکڑ کرنے لگے تو کوئی بھی شخص اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی کما حقہٗ پابندی کرنا، اور کلی طور پر اس کی منشاء و رضا کے مطابق زندگی بسر کرنا انسان کے بس سے باہر ہے انسان سے روزانہ سینکڑوں خطائیں اور گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں جس کا اسے خود بھی علم نہیں ہوتا مگر خدا تعالیٰ اپنی صفت "حلیم" کی بنا پر بندوں سے درگزر کرتا رہتا ہے۔ اور انہیں اصلاح احوال کا موقع دیتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا متعدد بار اعلان ہوا ہے۔ فرمایا۔

وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ	اللہ تعالیٰ بے نیاز تحمل والا ہے (البقرۃ: ۲۶۴)
وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَلِیْمٌ	اللہ تعالیٰ جاننے والا تحمل والا ہے (النساء: ۱۲)
وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ اور	اللہ تعالیٰ قدردان تحمل والا ہے۔
اِنَّہٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا۔ (بنی اسرائیل: ۴۴)	بے شک وہ تحمل والا بخشنے والا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ‏ بے شک اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے۔

(آل عمران: ۱۵۵)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفت حلیمی کے ساتھ دوسری صفت بانی خصوصاً مغفرت کا بھی ذکر ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا حکم معاذ اللہ کسی مجبوری کا یا لاچاری کے باعث نہیں بلکہ اس اساس شان غفاری کا نتیجہ ہے۔

۳۔ صفت انبیاء تمام انبیاء جو بنی نوع انسان کی ہدایت و رہبری کے لئے وقتاً فوقتاً اس دنیا میں آتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی صفت تحمل سے مزین کیا۔ قرآن پاک میں متعدد انبیاء کی اس صفت کا ذکر ہوا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ جنہوں نے راہ حق میں بے شمار مصیبتیں برداشت کیں۔ نمرود نے آپ کو دہکتی آگ میں ڈالا۔ جلاوطن کئے گئے۔ اپنی بیوی اور بیٹے کو بے آب وگیاہ ریگستان میں چھوڑا۔

پھر اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہوئے۔ آپ نے یہ ساری آزمائشیں نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور تحمل و بردباری کا اظہار کیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہوا۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ (بیشک ابراہیمؑ بڑے نرم دل اور تحمل والے تھے)

(التوبہ: ۱۱۴)

حضرت اسماعیلؑ جو راہ حق میں قربان ہونے کے لئے تیار ہو گئے تھے، قرآن حکیم اس کے بارے میں کہتا ہے:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ (والصّٰفّٰت: ۱۰۱) (ہم نے ابراہیمؑ کو ایک حلیم بیٹے (اسماعیل) کی خوشخبری دی)

حضرت موسیٰؑ کو بھی فرعون سے مقابلہ پر بڑی آزمائشوں اور تکلیفوں سے گزرنا پڑا۔ آپ کی قوم بھی آپ کو بہت ستاتی رہی۔ مگر آپ نے ہمیشہ تحمل و بردباری کا ثبوت دیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو یہود کے

ہاتھوں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ حتیٰ کہ آپ کو سولی پر چڑھایا گیا۔ مگر آپ نے ہر موقع پر تحمل و بردباری کا اظہار کیا۔

حضرت شعیبؑ کے متعلق ان کے مخالفین نے ان کے حلم کی گواہی دی جیسا کہ فرمایا۔

إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ (بے شک آپ ہدایت یافتہ اور حلیم ہیں)

(ھود: ۸۷)

۴- **اسوۂ رسول** ؐ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر آئے اس لئے آپ مجسمہ تحمل تھے، آپؐ کی حیات طیبہ ایسے واقعات سے بھرپور ہے کہ آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہ لیا۔ بلکہ اپنے جانی دشمنوں تک کو معاف کر دیا۔

بعثت کے بعد جب آپ نے تبلیغ اسلام کا آغاز کیا تو کفار و مشرکین مکہ نے آپؐ کی سخت مخالفت کی۔ آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ راستے میں کانٹے بچھائے اور اوپر کوڑا کرکٹ پھینکا۔ شعب ابی طالب تین سال تک محصور رہے۔ آپ کو شہید کرنے کے منصوبے بنائے۔ مگر آپؐ نے سب کچھ نہایت تحمل سے برداشت کرتے رہے۔ طائف کی طرف گئے تو وہاں کے غنڈوں نے پتھر برسا کر آپ کو لہو لہان کیا۔ فتح مکہ کے موقع پر جبکہ ان پر غلبہ حاصل ہو تو بھی عفو عام کا اعلان کیا۔ مگر آپ نے ان کے لئے بددعا تک نہ کی بلکہ بے مثال تحمل کا مظاہرہ کیا۔

ہجرت کے بعد مدینہ پہنچے تو یہود نے آپ کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا دوسری طرف منافقین طرح طرح سے زیادتیاں کرتے رہے۔ مگر حضورؐ نہایت تحمل سے سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ اور یہود پر غلبہ حاصل کرنے کے باوجود انتقام نہ لیا۔ غزوات کے موقعوں پر بھی آپ ہمیشہ عورتوں بچوں بوڑھوں، بیماروں اور معذوروں سے انتہائی پیش آتے تھے، قیدیوں سے بھی آپ حلم و بردباری کا سلوک کرتے تھے۔

انفرادی زندگی میں بھی آپ کے تحمل کی مثالیں لاتعداد ہیں۔ عبداللہ بن ابی جو منافقین کا

کا سردار تھا۔ اور آپ کے خلاف ہمیشہ سازشیں کرتا رہا۔ آپ نے اس سے ہمیشہ تحمل و درگذر سے کام لیا، وحشی جس نے غزوہ احد میں آپ کے چچا حضرت حمزہ کو شہید کیا تھا۔ اور ابو سفیان کی بیوی ہندہ جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا آپ نے غلبہ حاصل کرنے پر تحمل و درگزر کا سلوک کیا۔

ایک مرتبہ آپ اپنی تلوار درخت سے لٹکا کر آرام فرما رہے تھے کہ ایک کافر نے آکر تلوار سنبھال لی اور آپ کو جگا کر کہا کہ اب کون بچائے گا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ۔ یہ سن کر کافر کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ اور حضورؐ نے تلوار پکڑ کر اس سے پوچھا کہ اب تجھے کون بچائے گا۔ اس نے عفو و درگزر کی درخواست کی۔ آپ نے حلم و بردباری کا برتاؤ کیا اور معاف کر دیا۔

۵۔ ارشادات نبوی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحمل کی عملی مثال پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اس کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ آپ کے چند ارشادات درج ذیل ہیں۔

(i) فرمایا جو شخص چاہتا ہے کہ قیامت کے روز اس کے درجات بلند ہوں تو جو اس سے ظلم کرتا ہے اس کو معاف کر دے جو اس سے بخل کرتا ہے اس سے سخاوت کرے جو اس سے تعلق توڑتا ہے۔ اس سے تعلق جوڑے اور جو اس سے منہ کرتا ہے اس سے حلم و بردباری کا سلوک کرے۔

(ii) قبیلہ عبدالقیس کے سردار سے فرمایا کہ تجھ میں دو خصلتیں ہیں جنہیں خدا اور اس کا رسولؐ محبوب رکھتے ہیں۔ ایک حلم یعنی بردباری اور دوسرے انق یعنی آہستگی۔

(iii) ایک مرتبہ صحابہ نے فرمایا کہ اللہ کے ہاں بلندی تلاش کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا وہ بلندی ہے؟ فرمایا جو تم سے رشتہ قطع کرے تو تم اس سے جوڑو۔ جو محروم رکھے تو تم اسے دو اور جو نادانی کا رویہ اختیار کرے تو تم اس سے تحمل سے پیش آؤ۔

(iv) ایک شخص کی نصیحت کی بار بار درخواست کرے گا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز سامنے بلا کر اعلیٰ درجہ کا انعام عطا فرمائے گا۔

۶۔ صحابہؓ کی مثالیں صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفائے راشدین کی زندگیوں میں بھی تحمل و بردباری کی لاتعداد مثالیں ملتی ہیں۔ جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو راہ حق میں طرح طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں مگر آپؓ نے خندہ پیشانی سے سب برداشت کیا۔ خلافت سنبھالتے ہی آپ کو کئی ایک فتنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ منکرین زکوٰۃ، مرتدین اور مدعیان نبوت سب فتنوں کو آپؓ نے نہایت تحمل سے فرو کیا۔

حضرت عمر فاروقؓ میں بھی اس درجہ تحمل تھا کہ ممبر پر بھی آپ کو کوئی ٹوک دیتا تو نہایت فراخدلی سے اس کی بات سنتے تھے۔

حضرت عثمان نے سپاہیوں کے ساتھ اس حد تک تحمل و بردباری کا سلوک کیا، کہ آپؓ نے جام شہادت نوش کیا مگر مرکز اسلام مدینہ میں خونریزی نہ ہونے دی۔

حضرت علیؓ ایک مرتبہ ایک کافر پہ غلبہ حاصل کیا اور اسے قتل کرنا چاہتے تھے کہ اس نے آپؓ پر تھوک دیا۔ آپؓ اس کے سینہ سے یہ کہتا اُتر آئے کہ اگر اسے قتل کر دیتا تو میرا ذاتی انتقام ہوتا۔ یہ آپ کا تحمل تھا کہ قدرت کے باوجود اس کی زیادتی برداشت کی امیر معاویہؓ کا تحمل ضرب المثل تھا۔ آپ کے مخالفین بھی آپ کے تحمل کے معترف تھے اور یہ آپ کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا۔

تحمل کی شرائط ۔ تحمل کی مندرجہ ذیل شرائط ہیں۔

(۱) **دل کی قوت**:۔ تحمل جبھی پیدا ہو سکتا ہے کہ دل مضبوط قوی ہو۔ قوی سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کی ایذاؤں کو برداشت کرتے ہوئے ان سے میل جول رکھے۔

۲۔ دل کی رضا:۔ تحمل کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ دل رضامند ہو۔ جبر یا دباؤ کے تحت ناگوار اور گراں بات کو برداشت نہ کرے۔ بلکہ خدا کی رضا کی خاطر بخوشی برداشت کرے۔

۳۔ عجلت سے اجتناب:۔ عجلت و جلدبازی کا مظاہرہ نہ کرے بلکہ وقار و سکون اور ضبط و حوصلہ سے حالات کو سمجھنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرے۔

۴۔ نرمی اور ملائمت: تحمل کے لئے ضروری ہے کہ طبیعت میں انکساری و تواضع کا جذبہ ہو اور دوسروں سے نرمی و ملائمت سے پیش آیا جائے۔ ناگوار حالات برداشت کرنے کی طبیعت خوگر ہو جائے۔

تحمل کی صورتیں

تحمل کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔

۱۔ فرائض کی ادائیگی میں تحمل

اللہ تعالیٰ نے انسان پر کئی ایک ذمہ داریاں عائد کی ہیں۔ خاندان معاشرہ ملک اور ملت اسلامیہ کے تعلق میں اس پر کئی ایک فرائض لازم آتے ہیں۔ ان ذمہ داریوں اور فرائض کی ادائیگی کے وقت بعض اوقات ناگوار حالات اور سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اگر انسان میں تحمل کا مادہ نہ ہو۔ تو وہ مشکلات و مصائب میں گھبرا کر اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو پس پشت ڈال دے اس طرح معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔

اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ بلکہ اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہر شخص اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتا رہے اور راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔

اس سلسلے میں دو باتوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اول یہ کہ عہدہ و اعزاز کی ہوس

نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اسے ایک ذمہ داری سمجھنا چاہیئے۔ دوسری بات یہ کہ کوئی ایسا عہدہ قبول نہ کرنا چاہیئے۔ جس کے فرائض انسان انجام نہ دے سکتا ہو۔ اپنے عہدہ کے تقاضے نہایت تحمل سے پورے کرنا چاہئیں۔

۲۔ مصائب و مشکلات میں تحمل انسان کو اس زندگی میں بے شمار نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی سکھ، کبھی دکھ، کبھی آرام، کبھی تکلیف، کبھی راحت اور کبھی رنج الغرض ہر طرح کے حوادث اسے پیش آتے رہتے ہیں۔ مصائب و مشکلات سے گذرنے کے لئے انسان میں تحمل و بردباری کا ہونا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تحمل کا وصف ہی انسان میں مصائب کو برداشت کرنے کا ملکہ پیدا کرتا ہے۔ اور جس انسان میں تحمل کا جذبہ نہ ہو وہ کبھی بھی مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی حوادثات میں سے گذر کر ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ بلکہ ایسا شخص حوصلہ ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور ترقی کی بجائے تنزل کی طرف اترنے لگتا ہے۔

تاریخ اسلام میں لاتعداد مثالیں ملتی ہیں۔ کہ مشکلات و مصائب کے وقت مسلمانوں نے تحمل کا مظاہرہ کر کے کامیابی حاصل کی۔ ابتدائے اسلام کی داستان اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اور واقعہ کربلا سے تحمل کی جو مثال قائم ہوئی۔ وہ پوری انسانیت کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے۔

۳۔ ارباب اختیار کا تحمل تحمل کی سب سے زیادہ ضرورت اسی شخص کو ہوتی ہے جو صاحب اختیار ہو۔ حاکم۔ لیڈر۔ اور ہر وہ شخص جسے کسی دوسرے پر بالادستی حاصل ہو۔ اس میں شامل ہے۔

ارباب اختیار کو اکثر عوام کی شکایات سننا پڑتی ہیں۔ عوام یا زیردست لوگ ان کے پاس اپنے مطالبات لے کر آتے ہیں۔ عموماً یہ لوگ دکھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اپنے

مطالبات پیش کرتے وقت جوش میں آ جاتے ہیں اور آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسے وقت میں صاحب اختیار شخص تحمل و بردباری سے کام نہ لے تو بگاڑ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ویسے بھی ارباب اختیار کو اپنے ماتحتوں پر سختی کرنا اور بات بات پر مواخذہ اور جواب طلبی کرنا مناسب نہیں۔ اس طرح معاشرے کا کاروبار بھی نہیں چل سکتا۔ بلکہ زیر دستوں میں بغاوت کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اور امن و سکون تباہ ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شاندار کامیابی کا دارومدار آپ کے اسی وصف کی بنا پر تھا۔ حضرت عمرؓ نہایت پر رعب شخصیت کے مالک تھے۔ مگر تحمل کا وصف اس حد تک رکھتے تھے۔ کہ لوگ بر سر منبر آپ کو ٹوک دیا کرتے تھے۔

نوکروں، خادموں، اور غلاموں سے تحمل کا سلوک بھی اسی ضمن میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی نمایاں مثال پیش کی ہے۔ آپ نے تمام زندگی نہ کسی خادم کو ڈانٹا۔ نہ مارا اور نہ برا بھلا کہا۔ آپ کا خادم حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے دس سال تک حضور کی خدمت کی۔ مگر آپ نے کبھی یہ نہ فرمایا۔ کہ تو نے ایسا کیوں کیا۔ اور ایسا کیوں نہ کیا۔

۴۔ عوام کا تحمل عوام کو بھی اسی طرح تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ اگر حاکم یا صاحب اقتدار سے غلطی ہو۔ یا زیادتی ہو جائے تو اسے اصلاح کا موقع دینا چاہیئے۔ بغاوت سے بچنا چاہیئے۔ ورنہ ملک و ملت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔

۵۔ غیر مسلموں سے تحمل اسلام غیر مسلموں سے تحمل و بردباری کا سلوک کرنے کا خصوصی حکم دیتا ہے۔ غیر مسلموں سے حتی الوسع سختی نہ

کرنی چاہئے ۔ بلکہ نرمی و حلیمی سے پیش آنا چاہئے ۔

کفار و مشرکین مکہ، یہود مدینہ اور منافقین وغیرہ، دشمنان اسلام ہمیشہ حضورؐ اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے ۔ مگر حضورؐ نے بر بار ان پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد تحمل و بردباری کا سلوک کیا ۔ یہی جہاد کے موقع پر بھی حضورؐ تحمل کے پیش نظر عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت دیتے تھے اور نہ ہی شب خون مارتے تھے ۔

ثمراتِ و فوائد

تحمل کے مندرجہ ذیل فوائد ہیں:-

۱۔ معاشرتی زندگی میں سکون تحمل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان کی گھریلو اور معاشرتی زندگی پر سکون اور خوشگوار بن جاتی ہے ۔ معاشرہ مستحکم بنیادوں پر استوار ہوتا ہے ۔ اور افراد معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں ۔ دشمن دوست بن جاتے ہیں ۔ اور ایک خوشگوار معاشرہ جنم لیتا ہے ۔

۲۔ اشاعت و تبلیغ اسلام تحمل کی بدولت اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں بہت بڑی مدد ملتی ہے ۔ غیر مسلموں سے جب تحمل کا سلوک کیا جائے ۔ تو ان کے دل میں اسلام کے لئے کشش و محبت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوتے ہیں ۔

۳۔ دنیوی کامیابی تحمل سے انسان مشکلات و مصائب کا خوگر ہو جاتا ہے اور وہ ناگوار و ناسازگار حالات سے گذر کر ترقی و کامیابی کی طرف قدم بڑھاتا ۔ انسان میں عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور حلیمی برداشت جیسے اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں اور زندگی کی کامرانیاں اس کے قدم چومنے لگتی ہیں ۔

تحمل سے خدا اور رسول کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

اخروی کامیابی جو ایک مسلمان کے لئے سب سے بڑی نعمت ہے اس طرح تحمل انسان خدا کی رضا حاصل کر کے اخروی انعامات اور جنت کا حقدار بن جاتا ہے۔

طلباء و طالبات ہسٹری کے علاوہ
عام قاری کے لیے بھی عام فہم اور مفید کتاب

تاریخ اسلام

از

بشیر احمد تمنّا

ہسٹری میں کامیاب ہونے کے لئے
معاون اور مددگار ثابت
ہوگی

ملنے کا پتہ
نیو بک پیلس چوک اُردو بازار لاہور

خاندان

(عائلی زندگی)

خاندان

مفہوم: خاندان، کنبہ یا گھرانہ سے مراد وہ افراد ہیں جو ایک گھر میں مل جل کر زندگی زندگی بسر کرتے ہیں۔ زندگی کے اس دائرے کو عائلی یا اہلی یا خانگی زندگی بھی کہا جاتا ہے۔ خاندان کا مفہوم اگرچہ انتہائی وسیع ہے اور اس میں گھر کے تمام افراد یعنی ماں باپ، اولاد، چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ حتیٰ کہ نوکر چاکر اور لونڈی غلام بھی آجاتے ہیں لیکن بنیادی طور پر خاندان فقط خاوند بیوی (یعنی والدین) اور اولاد پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔

اہمیت وضرورت

اسلام میں عائلی زندگی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جس کے متعلق پہلو درج ذیل ہیں

۱۔ **صحت مند معاشرہ کا قیام:** ایک صالح وصحت مند معاشرہ کے قیام کے لیے عائلی یا خانگی زندگی کا اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ بعض مذاہب کے نزدیک عائلی زندگی انسان کی روحانی ترقی میں حارج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روحانی ارتقاء کے لیے رہبانیت اور ترک دنیا کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

تاہم اسلام کے نقطہ نظر سے تجرد کی زندگی ایک غیر فطری چیز ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور فطرتاً ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اگر دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ زندگی بسر کریں تو نہ صرف یہ کہ نسل انسانی منقطع ہو جائے بلکہ

زندگی کے صحیح مقاصد کبھی حاصل نہ ہو سکیں علاوہ ازیں معاشرے میں طرح طرح کے شر اور فساد پیدا ہونے کا بھی خدشہ رہے۔

عائلی زندگی نہ صرف فطرت کا تقاضا ہے بلکہ قوم و ملت کی تعمیر و ترقی اور خوشحالی و فارغ البالی میں بھی نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ قوم جس کے افراد عائلی الجھنوں میں مبتلا ہوں کبھی ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ قوم مختلف خاندانوں سے تشکیل پاتی ہے اس لئے اگر خاندان پرسکون نہ ہوں تو پوری قوم متاثر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے حسن معاملات کی تربیت خانگی زندگی میں ہی ہوتی ہے اور انسان زندگی کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ لہٰذا معاشرے میں اعتدال و اصلاح پیدا کرنے کے لئے عائلی زندگی کا وجود ناگزیر ہے۔

۲۔ **کتاب و سنت میں تاکید:** عائلی زندگی اختیار کرنے کی تاکید قرآن حکیم اور احادیث نبوی میں بھی موجود ہے۔ قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ کے رسولوں (جو لوگوں کے لئے کامل نمونہ ہوتے ہیں) کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے کہ انہوں نے عائلی زندگی اختیار کی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ۚ — اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ان کو بیویاں اور اولادیں دیں۔

ایک دوسرے مقام پر امت مسلمہ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کنواروں کو عائلی زندگی اختیار کرنے میں اعانت کریں جیسا کہ فرمایا:

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ — اور تم میں سے جن کے نکاح نہیں ہوئے ان کے نکاح کرا دیا کرو اور اپنے غلاموں اور

وَاِمَآئِكُمْ ۔ لونڈیوں کے بھی نکاح کر دیا کرو جن میں اس کی صلاحیت موجود ہو ۔ (النور ۲۴:۳۲)

آنحضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عائلی زندگی اپنانے پر بہت زور دیا ہے آپؐ کا ارشاد ہے کہ "نکاح میری سنت ہے اور جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں" ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ "جو شخص میرے اور داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ابراہیمؑ کے دین پر ہے اگر اس کو توفیق ہو تو نکاح کرے" آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ نکاح نصف ایمان ہے ۔

عائلی زندگی کے مقاصد

قرآن وسنت اور دیگر تعلیمات اسلامی سے عائلی خانگی زندگی اختیار کرنے کے مندرجہ ذیل مقاصد معلوم ہوتے ہیں ۔

۱ **بقائے نسل انسانی** ۔ عائلی زندگی کا سب سے اہم مقصد افزائش وبقائے نسل انسانی ہے اولاد کی خواہش اور اپنی نسل کی بقا کا جذبہ ہر مرد وعورت میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے اور رشتہ مناکحت کا اصل مقصد بھی یہی ہے ۔ اگرچہ بعض مادہ پرست اہل زندگی کو محض نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن جب انسان اس دنیا سے رخصت ہونے لگتا ہے تو اس وقت اسے ضرور احساس ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کا نام لیوا اور وارث بھی ہو ۔

قرآن پاک کے اس فطری جذبے کے پیش نظر ازدواجی تعلق کی یوں تشریح بیان فرمائی ۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں پس اپنی

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۔ (البقرۃ: ۲۲۳)
کھیتی ہیں تم جس طرح چاہو جاؤ اور اپنی جانوں کے لئے آگے بھیجو۔

اس آیت کریمہ میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ خاوند کا بیوی کیساتھ وہی تعلق ہے جو کسان کا اپنی کھیتی سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کسان کھیت میں تفریح کے لئے نہیں جاتا بلکہ اس کا مقصد پیداوار حاصل کرنا ہوتا ہے اسطرح خاوند و بیوی کے تعلق کا مقصد محض نفسانی خواہشات کی تکمیل نہیں بلکہ اصل مدعا افزائش نسل ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے قتل اولاد کو بھی گناہ قرار دیا ہے۔

دیکھا جائے تو ساری کائنات کی رونق اور انسانی آبادی کی کثرت اسی رشتے کی بدولت ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (النساء)
اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دو سے بہت سے مرد اور عورت پھیلائے

بقائے نسل کے پیش نظر ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کی کثرت کی تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ تم اس عورت سے نکاح کرو جو شوہر سے محبت کرنے والی اور زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہو اس لئے کہ میں دوسری امتوں پر تمہاری کثرت کی وجہ سے فخر کرتا ہوں (ابوداؤد، نسائی)

اس میں شک نہیں کہ خدا تعالیٰ چاہتا تو مرد اور عورت کے اختلاط اور ملاپ کے بغیر بھی نسل انسانی کو برقرار رکھتا لیکن چونکہ یہ دنیا دارالاسباب ہے اور یہاں نتائج کا سلسلہ اسباب پر مبنی ہے اس لئے نسل انسانی کی بقا کے لئے رشتہ مناکحت اور اہلی زندگی کو اختیار کرنا ضروری قرار دیا ہے۔

کسی قوم یا ملت کی بقا کا انحصار اس کے افراد کے
۲ **اولین تربیت گاہ:** حسن عمل پر ہے اور افراد کا حسن عمل ان کی اعلیٰ تربیت پر مبنی ہے۔ اگرچہ تربیت سکول اور مدرسہ میں بھی مل سکتی ہے لیکن اگر گھر کا ماحول اخلاق سے خالی ہو تو استاد کی کوئی بھی کوشش سود مند نہیں ہو سکتی اس کے علاوہ بچپن میں انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ عادات ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی میں پختہ ہو جاتی ہیں۔

درحقیقت گھر انسان کی اولین تربیت گاہ ہے۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور بول چال و گفتگو کا جو طریقہ انسان اپنے بچپن میں گھر سے سیکھتا ہے وہ زندگی بھر کے لئے پختہ ہو جاتا ہے اور اس عمر میں جو عادات انسان اپنا لیتا ہے بعد میں ان کا بدلنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر والدین نیک، دیانتدار اور خوش اخلاق ہوں تو اولاد بھی یقیناً انہی اوصاف کی حامل ہوتی ہے اور اگر والدین دین سے بیگانہ اور لڑائی، جھگڑے کے دلدادہ ہوں تو اولاد بھی ایسی ہی برائیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

لہٰذا اولاد کو نیک و خوش اطوار بنانے کے لئے ضروری ہے کہ گھر کا ماحول پاک و صاف اور متدین بنایا جائے۔

عائلی زندگی کا مقصد اخلاق اور
۳ **تحفظ اخلاق و عصمت:** عصمت کی حفاظت بھی ہے۔ عائلی زندگی اختیار کرنے سے مرد و عورت زنا، بد اخلاقی اور کئی دوسرے گناہوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور پاک دامنی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں نکاح کرنے والے مرد اور عورت کو "محصن" اور "محصنہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا مطلب قلعہ میں محفوظ ہونے والے ہیں عقد نکاح کا مقصد بھی باری تعالیٰ نے

پاک دامنی اور تحفظ اخلاق و عصمت ہی بتایا ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔

مُّحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ ۔ پاک دامنی کے لئے نہ کہ شہوت رانی کے لئے

(نساء ۲۴ - المائدہ ۵)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک موقع پر ارشاد فرمایا "اے نوجوانو! تم میں سے جسے نکاح کی طاقت ہو وہ نکاح کرے کیونکہ اس سے نگاہ پاک رہتی ہے اور اخلاق کی حفاظت ہوتی ہے اور جو شخص نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ روزے رکھے (مسلم)

غرض عائلی زندگی اختیار کرنے سے مرد اور عورت ہر قسم کی بد اخلاق اور اور بے حیائی سے محفوظ ہو کر نیک و پرہیز گار بن جاتے ہیں جس کا اثر اولاد پر بھی پڑتا ہے۔

۴: **آرام و آسائش:** آرام و آسائش اس پر سکون زندگی کا نام ہے جس میں انسان کو ذہنی، جسمانی اور مالی لحاظ سے اطمینان حاصل ہو کیونکہ ذہنی سکون کے بغیر جسمانی اور مالی آسائش بے معنی ہوتی ہیں۔ اور صحیح ذہنی سکون مرد اور عورت کو باہم ایک دوسرے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا ۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری نوع سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو

(الروم: ۲۱)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:۔

هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِيَسۡكُنَ اِلَيۡهَا ۔ وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے۔

(الاعراف: ۱۸۹)

مرد، دن بھر کا تھکا ماندہ گھر پہنچتا ہے تو اپنی بیوی بچوں میں سکون محسوس کرتا ہے اور بیوی بھی سارے دن کے کام کاج سے تھکی ہوئی، خاوند کو دیکھ کر اپنی سب تھکاوٹ اور پریشانی بھول جاتی ہے۔ درحقیقت گھر اگر صالح اور منظم ہو اور اس میں خاوند، بیوی اور اولاد سب ایک دوسرے کے ہمدرد و خیر خواہ ہوں تو پھر خواہ روکھی سوکھی روٹی ملتی ہو آرام و آسائش کا گہوارہ ہوتا ہے ایک کا چین دوسرے کا قرار ہوتا ہے اور ایک کا دکھ دوسرے کا رنج ہوتا ہے۔
چنانچہ گھر میں کوئی خوشی یا غمی کا موقع آئے سب مل کر شریک ہوتے ہیں۔ اگر ایک فرد بیمار ہو جائے تو گھر کے تمام افراد اس کی تیمارداری میں مصروف ہو جاتے ہیں۔
غرض گھر ہی ایک ایسی جگہ ہے جو صحیح معنوں میں انسان کیلئے آرام و آسائش کا باعث ہے اور جس کا بدل کوئی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔

۵۔ احساس ذمہ داری:- عائلی زندگی اختیار کرنے سے مرد اور عورت پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کا احساس بھی ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مرد کے ذمہ یہ ہے کہ وہ بیوی اور بچوں کو ضروریات زندگی مہیا کرے ان کے اخلاق و عادات کی نگہداشت کرے۔
عورت پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ خاوند کے مال اور اس کی عزت کی حفاظت کرے بچوں کی پرورش کرے اور گھر کا انتظام چلائے۔ اسی طرح کچھ ذمہ داریاں اولاد پر بھی ہیں۔

عائلی زندگی کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ گھر کا ہر فرد اپنی ان ذمہ داریوں کا احساس کرتا ہے اور زندگی بسر کرنے اور اپنی ذمہ داریوں کو احسن طور پر پورا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تگ و دو کرتا ہے قرآن پاک نے بھی اسی لئے نکاح کی ترغیب دلائی ہے۔ جیسا کہ فرمایا

وَانْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ　　تم میں سے جو بن بیاہے ہیں ان کے نکاح

يٰعِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (النور : ۳۲) — کرادو اور تمہارے غلام اور لونڈیاں اس لائق ہوں ان کا بھی نکاح کرادو۔ اگر وہ لوگ مفلس ہوں گے تو خدا تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کے بعد احساس ذمہ داری کی وجہ سے انسان تلاش رزق کے لئے زیادہ کوشش کرتا ہے اور زیادہ محنت و جانفشانی سے کام کرتا ہے اسی لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نکاح کے ذریعے رزق تلاش کرو۔

۶- **تحفظ مال وجان**: عائلی زندگی کا ایک مقصد مال و جان کا تحفظ بھی ہے خاوند، بیوی اور گھر کے دوسرے افراد باہم ایک دوسرے کے مال، جان اور عزت کی حفاظت کرتے ہیں اور اگر کوئی دشمن، چور یا ڈاکو حملہ آور ہو تو سب مل کر مقابلہ کرتے ہیں۔ جب مرد کام کاج اور کسب معاش کے لئے باہر جاتا ہے تو عورت ہی اس کے مال اور عزت کی محافظ ہوتی ہے اور گھر میں کسی اجنبی اور غیر شخص کو داخل نہیں ہونے دیتی۔ چنانچہ قرآن پاک نے عورت کے اس فرض کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (النساء ۳۴) : نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں اور خاوند کے پیچھے اس کے مال و عزت کی محافظ ہوتی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عورت کے اس فریضہ کو بہت اہم قرار دیا ہے جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ "عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگہبان ہے اور وہ اس کے متعلق جواب دہ ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ افراد خانہ کے باہمی تعاون کے بغیر ایک دوسرے کے مال، جان اور

عزت کی حفاظت ممکن نہیں اور اگر مال و جان کی حفاظت نہ کی جائے تو زندگی میں سکون میسر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مال کی حفاظت کو ایک فریضہ قرار دیا ہے اور مال کی حفاظت میں مارے جانے والے کو شہید کہا ہے جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل ہوا وہ شہید ہے" (بخاری و مسلم)

حدیث ہے کہ ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر کوئی شخص میرا مال لینے (چرانے یا چھیننے) آئے تو کیا کروں؟ اسے مال دے دوں یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اپنا مال اس کو نہ دے۔ اس نے عرض کیا اگر وہ مجھ سے لڑے؟ فرمایا تو بھی اس سے لڑ۔ عرض کیا اگر وہ مجھ کو مار ڈالے؟ فرمایا تو شہید ہے۔ عرض کیا اگر میں اس کو مار ڈالوں؟ فرمایا وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم)

حقوقِ والدین

مفہوم :- حقوق والدین سے مراد وہ رعائتیں ہیں جو والدین کو اولاد کی طرف سے حاصل ہیں یا اس سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو اولاد پر والدین کے لئے عائد ہوتی ہیں بالفاظ دیگر حقوق والدین سے مراد فرائض اولاد ہیں۔

اہمیت

حقوق والدین کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے :-

۱- قریب ترین رشتہ : حقوق والدین کی اہمیت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ دنیوی تعلقات میں انسان کا سب سے زیادہ تعلق والدین کے ساتھ ہوتا ہے اور تمام رشتہ داریوں میں سب سے بلند درجہ والدین کا ہے کیونکہ انسان کی باقی تمام رشتہ داریاں یا تو باپ کے تعلق سے ہوتی ہیں یا پھر ماں کی وساطت سے تعلق رکھتی ہیں اسی لئے ہر رشتہ دار کا حق بھی والدین سے نسبت اور قربت کے لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے جتنا کوئی قریب کا تعلق رکھتا ہو اسی قدر زیادہ وہ حسن سلوک کا مستحق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے خود والدین کو سب سے زیادہ حقوق حاصل ہیں۔

۲- والدین کے احسانات : یوں بھی دیکھا جائے تو والدین کے انسان پر اس قدر احسانات ہوتے ہیں کہ انسان ان کی خدمت میں تمام عمر بھی صرف کر دے تو حق ادا نہیں کر سکتا اولاد کی پیدائش سے لیکر پرداخت، پرورش اور تعلیم و تربیت کے تمام مراحل طے کرانے میں والدین طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتے اور قسم قسم کے غم برداشت کرتے ہیں راتوں کی نیند اور دن کا آرام بچوں کے لئے قربان کر دیتے ہیں اور ہر قسم کے جانی و مالی ایثار و قربانی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں بچپن میں جب انسان کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تو سہارا دیتے ہیں کھلاتے پلاتے اور پہناتے ہیں اور اگر بچے کو ذرا سی تکلیف بھی آ جائے تو دور کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے پھر اولاد کی تعلیم و تربیت میں اپنی خون پسینے کی کمائی کو انتہائی فراخدلی سے خرچ کرتے ہیں والدین کی بے لوث محبت اور ان کے جانی اور مالی ایثار و احسانات کا بدلہ چکانا ممکن نہیں۔

لہٰذا اس کے لئے جس قدر بھی ان کی خدمت کی جائے بہتر ہے۔

۳۔ کتاب و سنت میں تاکید: حقوق والدین کی اہمیت نہ صرف عقلی دلائل سے مسلم ہے بلکہ قرآن حکیم اور احادیثِ نبوی میں بھی اس کی بہت تاکید موجود ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اکثر جگہ والدین کا ذکر توحید باری تعالیٰ کے ذکر کے بعد کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ	تو میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کر
(لقمٰن: ۱۴)	

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا	اور تیرے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے
اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ	کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور
اِحْسَانًا (بنی اسرائیل: ۲۳)	والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کی عظمت اور ان کے مرتبہ و مقام کو واضح فرمایا ہے آپ کا ارشاد ہے کہ "خدا کی خوشی ماں باپ کی خوشی اور خدا کی ناراضگی ماں باپ کی ناراضگی میں ہے" آپ نے حقوقِ والدین کی اس قدر اہمیت بیان فرمائی کہ آپ نے فرمایا "والدین کا حق کبھی نہیں چکایا جا سکتا ہاں ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ کسی کے غلام ہوں تو انہیں خرید کر آزاد کر دے"۔

۴۔ والدہ کا مقام: اسلام نے والدین میں سے والدہ کا مقام بہت زیادہ بلند قرار دیا ہے اور والدہ کے حقوق والد کی نسبت زیادہ مقرر کئے ہیں کیونکہ اولاد کی پرورش و تربیت کے لئے جس قدر تکالیف والدہ کو پیش آتی ہیں والد کو نہیں آتیں حمل و وضع حمل اور تربیت کے دیگر مراحل کی سخت تکالیف برداشت کرنا فقط والدہ ہی کا حصہ ہے چنانچہ قرآن پاک نے والدہ کی خصوصی خدمت کا ذکر کیا ہے:۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک
حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى	کی تاکید کی اس کی ماں نے ضعف پر ضعف
وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ	اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور اس کا دودھ
(لقمان: ۱۴)	چھڑانا دو سال میں ہوتا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا :-

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۚ (الاحقاف: ۱۵)	اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا اس کی ماں نے اس کو سخت تکلیف سے پیٹ میں اٹھائے رکھا اور بڑی مشقت سے جنا۔

آنحضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیشتر احادیث میں والدہ کے مقام کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں اس نے عرض کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں تین مرتبہ آپ نے یہی جواب دیا اور چوتھی مرتبہ ارشاد فرمایا تیرا باپ (بخاری) یعنی اگر حسن سلوک کے چار مواقع ہیں تو تین کی حقدار ماں ہے۔

عبادات اسلامی میں جہاد اور حج کی اہمیت واضح ہے لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حالات میں والدہ کی خدمت کو ان پر ترجیح دی ہے چنانچہ ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ میں جہاد میں شرکت کرنا چاہتا ہوں اور مشورہ کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے فرمایا "کیا تمہاری ماں زندہ ہے" جواب دیا "ہاں" آپ نے فرمایا "اس کی خدمت میں لگے رہو کیونکہ جنت اس کے قدموں کے نیچے ہے" ایک دوسری حدیث میں آپ کا ارشاد ہے اگر ماں زندہ ہے تو اس کی خدمت کرو اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ماں کے ساتھ نیک سلوک کرو یہ نیکی حج اور جہاد سے بھی بڑھ کر ہے۔

ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سر فہرست ماں کی نافرمانی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے (بخاری) نیز آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ نیک سلوک اور عمدہ برتاؤ کی سب سے زیادہ حقدار ماں ہے۔

رضاعی والدہ بھی حقیقی والدہ کی طرح عزت و تکریم اور ادب و احترام کی حقدار ہے چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ کی رضاعی والدہ آئیں تو آپ احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دی۔

والدین کے حقوق

قرآن وسنت اور تعلیماتِ اسلام کی روشنی میں والدین کے مندرجہ ذیل حقوق ثابت ہوتے ہیں:۔

۱۔ حسنِ سلوک: والدین کا سب سے اولین حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آیا جائے۔ ان کا ادب و احترام کیا جائے اور نہایت محبت و شفقت کا برتاؤ کیا جائے۔ گفتگو اور بات چیت نیز اٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ ان کی عزت و تکریم کی جائے اور کوئی سخت بات نہ کہی جائے بلکہ وہ اگر کوئی سخت بات کہدیں تو اسے خاموشی سے سن کر برداشت کر لیا جائے بالخصوص بڑھاپے میں جب انسان کے مزاج میں چڑچڑا پن آجاتا ہے معمولی معمولی بات پر غصہ آنے لگتا ہے اور عادات بچوں کی طرح ہو جاتی ہیں تو اس وقت ان کے ساتھ نرمی، محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آنا چاہیے اور ان کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھنا چاہیے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا	اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ
يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُ	اگر ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ
هُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ	جائیں تو انہیں اف تک نہ کہو اور نہ ان پر
لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَ	خفا ہو اور ان کے ساتھ ادب سے بولو اور
قُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَاخْفِضْ	ان کے لئے اطاعت کے بازو جھکاؤ
لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (بنی اسرائیل ۲۳-۲۴)	

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے:۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ	اور خدا کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو
شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا	شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسن
(النساء: ۳۶)	سلوک سے پیش آؤ۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی ہے آپ کا ارشاد ہے کہ نماز کے بعد خدا تعالیٰ کے ہاں سب سے پیارا اور محبوب عمل والدین سے نیکی ہے۔ ایک صحابیؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ خدا کو کونسا عمل سب سے زیادہ پسند ہے؟ فرمایا "وقت پر نماز پڑھنا۔

صحابیؓ نے عرض کیا پھر کونسا؟ فرمایا ماں باپ سے نیک سلوک کرنا۔ صحابیؓ نے عرض کیا پھر کونسا؟ فرمایا۔ راہ خدا میں جہاد کرنا۔

والدین کیساتھ الفت ومحبت کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بیٹا ماں باپ کی طرف الفت ومحبت کی نظر سے دیکھتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے لئے ہر نظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھ دیتا ہے صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر چہ دن بھر میں سو مرتبہ دیکھے؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں خدا بزرگ تر اور پاک تر ہے"

والدین کا ادب واحترام کرنے کی اسلام نے اس حد تک تاکید کی ہے کہ نہ صرف اپنے والدین کے احترام کو ملحوظ رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے بلکہ دوسروں کے والدین کا احترام کرنے کی بھی تاکید کی گئی ہے چنانچہ ایک موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ماں باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے" صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دے سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کوئی شخص کسی کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اور وہ اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے (بخاری ومسلم) یعنی دوسرے کے والدین کو گالی گلوچ کرنا اور برا کہنا اپنے والدین کو گالی دینے اور برا کہنے کے مترادف ہے۔

حسن سلوک صرف مسلمان والدین کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ والدین اگر غیر مسلم اور کافر ومشرک بھی ہوں تب بھی ان سے حسن سلوک سے پیش آنا چاہئے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کہتی ہیں کہ اس وقت جب قریش اور مسلمانوں کے درمیان صلح تھی میری ماں میرے پاس آئی اور وہ اس وقت مسلمان نہیں تھی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ مجھ سے کسی چیز کی رغبت کر رہی ہے کیا میں اسے کچھ دے سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں تم اس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرو۔ (بخاری ومسلم)

۲۔ اطاعت وفرمانبرداری: والدین کا دوسرا حق یہ ہے کہ ان کے ہر حکم کی بشرطیکہ وہ خلاف شریعت نہ ہو پوری پوری تعمیل کی جائے اور مکمل اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت دیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا	اور ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ والدین
وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ	سے حسن سلوک سے پیش آئے اور اگر وہ تمہیں مجبور
لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا	کریں کہ تم میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہراؤ
(لقمان: ۱۴)	جس کا تمہیں علم نہیں تو تم ان کی اطاعت نہ کرو

اس سلسلے میں جناب اسمٰعیل ؑ کا نمونہ ہمارے سامنے ہے کہ جب ان کے والد حضرت ابراہیم ؑ نے بعض وجوہات کی بنا پر انہیں حکم دیا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو تو انہوں نے اسے طلاق دے دی پھر اپنے والد کی خواہش پر خدا کی راہ میں ذبح ہونے کے لئے آمادگی کا اظہار کر کے مکمل اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت دیا چنانچہ قرآن پاک نے حضرت اسمٰعیل ؑ کے اظہارِ اطاعت کو یوں نقل کیا ہے " اے ابا جان! آپ کو جس چیز کا حکم ملا ہے کر گذریں اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے"۔

آنحضرت ﷺ نے بھی والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کی بہت تاکید فرمائی ہے آپ ؐ کا ارشاد ہے کہ "والدین کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور والدین کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے"۔ آپ ؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ خدا تعالیٰ نے تم پر ماں باپ کی نافرمانی کو حرام کر دیا ہے اور جو شخص ماں باپ کی نافرمانی کرتا ہے اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا نیز آپ ؐ نے ایک حدیث میں والدین کی نافرمانی کو کبیرہ گناہوں میں سے بتایا ہے۔

اس ضمن میں حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کا واقعہ نہایت اہم ہے کہ ان کے والد حضرت عمر رضؓ نے بعض وجوہات کی بنا پر انہیں بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیا وہ بیوی ان کی چہیتی تھیں اس لئے طلاق دینا نہ چاہتے تھے معاملہ نبی کریم ؐ کے پاس لایا گیا تو آپ ؐ نے حضرت عمر رضؓ کی حمایت کی اور عبداللہ بن عمر رضؓ کو بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیا۔

۳۔ مالی وجسمانی خدمت: والدین کا تیسرا حق یہ ہے کہ ان کی مالی و جسمانی ہر طرح سے خدمت کی جائے والدین اگر نادار و غریب یا بوڑھے ہوں تو انہیں تمام ضروریاتِ زندگی مثلاً روٹی کپڑا وغیرہ بہم پہنچائی جائیں جب وہ بیمار ہوں تو ان کا علاج کرایا جائے غرض ہر قسم کی اعانت و خدمت کی انہیں ضرورت ہو اسے پورا کیا جائے اور ان کی تمام تکالیف کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے والدین کی مالی خدمت و امداد کے بارے میں قرآن پاک نے بھی تاکید کی ہے فرمایا:۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (البقرۃ: ۲۱۵)

(اے نبی ؐ) کہہ دیجئے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین اور رشتہ داروں کے لئے ہے۔

والدین کی خدمت کے بارے میں نبی کریم ؐ سے متعدد احادیث مروی ہیں ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے پاس مال ہے اور میرا باپ میرے مال کا محتاج ہے آپ ؐ نے فرمایا تو اور تیرا مال دونوں تیرے باپ کی ملکیت ہیں تمہاری اولاد تمہاری پاک کمائی ہے اس لئے تم اپنی اولاد کی کمائی بے جھجک کھاؤ (ابوداؤد) ایک دوسری حدیث ہے کہ ایک دن ایک نوجوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا

یارسول اللہؐ! میرے ماں باپ نے میرا مال لے لیا ہے آپؐ نے فرمایا جاؤ اپنے باپ کو بلا لاؤ جب اس کا بوڑھا باپ حاضر خدمت ہوا تو آپؐ نے پوچھا تمہارے لڑکے کا کیا معاملہ ہے؟ بوڑھے باپ نے جواب دیا کہ آپ ذرا اس سے اتنا تو پوچھئے کہ میں اس کا مال اپنی ذات یا اس کی خالہ کے سوا کسی اور پر خرچ کرتا ہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سنا تو نوجوان کا گریبان پکڑ کر اس کے باپ کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے۔

متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں والدین کی خدمت جہاد سے بھی افضل ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص یمن سے آیا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی آپؐ نے فرمایا کیا تیرے ماں باپ ہیں؟ عرض کی ہاں آپؐ نے فرمایا جاؤ پہلے ان سے اجازت حاصل کرو اور اگر وہ اجازت نہ دیں تو ان کے حکم کی تعمیل کرو کیونکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اس کی بندگی کے بعد خدمت والدین سے بہتر اور کوئی عمل نہیں ہے نیز آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ سب سے بڑا جہاد ماں باپ کی اچھی طرح خدمت کرنا ہے۔

ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کی مجلس میں تشریف رکھتے تھے کہ فرمایا وہ بڑا بدنصیب ہے۔ وہ بڑا بدنصیب ہے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا یارسول اللہ کون؟ فرمایا جس نے اپنے ماں باپ یا دونوں میں سے ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی۔ آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ بہت برا ہے وہ شخص جس کے بوڑھے والدین نے اسے جنت میں داخل نہ کیا۔ مراد یہ ہے کہ ان کی خدمت کا موقع ملا اور خدمت کر کے جنت میں نہ گیا نیز آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی عمر طویل ہو اور اس کے رزق میں کشادگی ہو تو اسے چاہئے کہ والدین کی خدمت کرے۔

۴۔ اقرباء سے سلوک: والدین کا چوتھا حق یہ ہے کہ ان کے تمام رشتہ داروں۔ بلکہ دوستوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا جائے اور انہیں احسانات سے نوازا جائے۔ والدین کے اقرباء اور احباب سے حسن سلوک صرف والدین کی زندگی میں ہی نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی کرتے رہنا چاہئے۔ کیونکہ اس طرح ان کی روحوں کو ثواب حاصل ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس امر کی تاکید فرمائی ہے چنانچہ ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ! مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے! آپؐ نے فرمایا کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟ عرض کیا نہیں۔ آپؐ نے پھر پوچھا کیا تمہاری خالہ ہے۔ جواب دیا ہاں آپؐ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ نیکی کر۔ (ترمذی)

ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ جس نے میرے چچا کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی چچا باپ کے مثل ہوتا ہے (ترمذی)
نیز ایک موقع پر آپؐ نے حضرت عباسؓ کی زکوٰۃ اپنے پاس سے دی اور فرمایا چچا بھی تو باپ کے مثل ہوتا ہے (ترمذی)

والدین کا ایک حق یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد

۵۔ دعائے مغفرت: اولاد ان کے لئے بخشش و مغفرت کی دعا کرتی رہے اور تلاوت قرآن پاک اور دعاؤں سے انہیں ثواب پہنچاتی رہے اس طرح ان کی نیکیوں میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ والدین کے لئے دعائے مغفرت کرنا انبیاءؑ کی سنت ہے قرآنِ پاک میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ کی ان دعاؤں کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے والدین کے لئے مانگیں۔ اس کے علاوہ قرآن پاک نے مسلمانوں کو بھی اس کی تلقین کی ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا :۔

قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا (بنی اسرائیل ۲۴)

کہو کہ اے پروردگار! تو ان پر رحم کر جس طرح انہوں نے مجھے (مہر و محبت سے) بچپن میں پالا

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے :۔

قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ (نوح ۲۸)

کہو کہ اے پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو بخش دے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس امر کی تاکید کی ہے چنانچہ ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا والدین کی وفات کے بعد بھی ان کا کوئی حق ادا کرنا رہ جاتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں، ان کے لئے نماز پڑھ اور استغفار کر ان کے وعدوں کو پورا کر۔ ان کے قرابت داروں سے بھلائی کر اور ان کے دوستوں کی تعظیم کر" نیز آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ "کسی بندے کے والدین یا ان میں سے ایک مر جاتا ہے۔ اور وہ ان کا نافرمان ہوتا ہے۔ پھر وہ ان کے لئے دعا اور استغفار کرتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو سعادتمندوں میں لکھ لیتا ہے۔

ثمرات و فوائد

والدین کے ساتھ حسن سلوک ان کی اطاعت و خدمت اور ان کے دیگر حقوق کی بجا آوری سے دنیا و آخرت میں بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں :۔

۱۔ دنیوی فوائد: جو شخص سچے دل سے والدین کی خدمت کرتا ہے تو خدا اور اس کا رسولؐ اس سے خوش ہوتے ہیں اور ایسے شخص کو دنیا میں عزت و کامیابی حاصل ہوتی ہے آنحضورؐ کے فرمان کے مطابق اس کی عمر میں درازی کر دی جاتی ہے اور اس کے رزق میں کشادگی و فراخدلی ہوتی ہے۔ نیز والدین کی دعاؤں کے نتیجہ میں بہت سی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں اور دیگر بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں

۲۔ اُخروی فوائد: خدمتِ والدین کے آخرت میں بھی بہت سے فوائد ہیں۔ والدین کی خدمت کرنے والا جنت کا حقدار ہوتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ باپ جنت کا درمیانہ دروازہ ہے تو چاہے تو اسے ضائع کر دے اور چاہے تو محفوظ رکھ۔ نیز ایک شخص کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا کہ وہ تمہارے جنت و دوزخ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کی خدمت کر کے جنت حاصل کرو ـــــ علاوہ ازیں آپؐ کا فرمان ہے "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے"۔

حقوقِ اولاد

مفہوم :- حقوقِ اولاد سے مراد وہ مراعات یا وہ باتیں ہیں جو اولاد کو والدین کی جانب سے حاصل ہوتی ہیں یا اس سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو والدین پر اولاد کے لئے عائد ہوتی ہیں بالفاظ دیگر حقوقِ اولاد سے مراد فرائضِ والدین ہیں

اہمیت

حقوقِ اولاد کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے :-

۱۔ حسن معاشرت کا تقاضا :- حسن معاشرت اور معاملات کی صفائی کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کے مناسب و منصفانہ حقوق قائم ہوں اور انہیں بطریق احسن ادا کیا جائے چنانچہ اسلام نے معاشرتی و تمدنی تعلقات میں جو حقوق قائم کئے ہیں وہ دیگر تمام مذاہب کے مقرر کردہ حقوق کی نسبت زیادہ معقول، منصفانہ اور مکمل ہیں دوسرے مذاہب میں والدین، بزرگوں اور بڑوں کا تو خیال رکھا گیا ہے لیکن اولاد، بچوں اور چھوٹوں کو عام طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض جگہ بچوں کو زندہ مار دیا جاتا ہے یا دیوتاؤں کی نظر چڑھا دیا جاتا ہے اسلام نے حسن معاشرت کے پیشِ نظر تقسیم حقوق میں بڑوں اور چھوٹوں کا کوئی امتیاز مدنظر نہیں رکھا بلکہ چھوٹوں کے بھی بڑوں کی طرح مناسب حقوق قائم کئے ہیں اس امر کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ "وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی عزت نہیں کرتا (ترمذی) اس اصول کے پیشِ نظر اسلام نے جہاں والدین کے حقوق مقرر کئے ہیں وہاں اولاد کے حقوق بھی قائم کر دیئے ہیں۔

۲۔ والدین کے مفادات :- حقوق العباد کی بنیاد "احسان کا بدلہ احسان" کے اصول پر قائم ہے اور معاشرتی طور پر ایک دوسرے سے احسانات کے بدلے میں حقوق حاصل ہوتے ہیں مثلاً والدین کو اولاد کی طرف سے حقوق اس لئے حاصل ہیں کہ انہوں نے اولاد کی پیدائش پرورش اور تربیت کی ہوتی ہے حقوقِ اولاد پر غور کیا جائے تو یہاں بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ اولاد

سے والدین کے بہت سے مفادات وابستہ ہیں مثلاً جذبۂ محبت کی تسکین، بقائے نسل کی خوشی، آئندہ زندگی میں انکی خدمت و معاونت کی امید، دنیا میں نیک نامی و شہرت کی توقع اور آخرت میں صالح اولاد کی صورت میں سربلندی وغیرہ انہی مفادات کی بناء پر اولاد کو والدین کی طرف سے حقوق حاصل ہیں۔

۲۔ کتاب وسنت کی تاکید: اولاد کی زندگی کی تکمیل اور نشو ونما کی تاکید قرآن مجید اور احادیث میں بھی موجود ہے۔

اسلام سے قبل نہ صرف یہ کہ اولاد کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اولاد کی زندگی کو بھی کچھ وقعت نہیں دی جاتی تھی اور اکثر نہایت بے رحمی اور سفاکی سے قتل و زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اس کے کئی اسباب تھے پہلا سبب مذہبی تھا کہ لوگ اپنے دیوتاؤں اور بتوں کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے بچوں کو ذبح کر کے ان پر بھینٹ چڑھا دیتے تھے اور بعض اوقات اپنے کسی کام کے پورا ہونے کے لئے بچے کی قربانی کی منت مان لیتے تھے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ کو بھی ان کے والد عبدالمطلب نے قربان کرنا چاہا تھا مگر پھر ان کے عوض سو اونٹوں کا نذرانہ دیا۔ یہ رسم نہ صرف عرب بلکہ ایران و ہندوستان وغیرہ متمدن ممالک میں بھی رائج تھی۔ قرآن پاک نے اس رسم کا یوں قلع قمع کیا۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (الانعام:)

تحقیق [illegible] لوگ خسارے میں ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے لاعلمی میں قتل کیا

قتلِ اولاد کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا عرب کی سرزمین بالعموم ویران و ریگستان تھی اور غلہ بہت کم پیدا ہوتا تھا اس لئے وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوئی تو ان کے پرورش و کفالت کا انتظام کیونکر ہوگا؟ اور اسی خیال کے پیش نظر اولاد کو قتل کر ڈالتے تھے۔ اسلام نے اس بے بنیاد نظریہ کی یوں تردید کی کہ روزی رساں تو خالق کائنات ہے جو ہر ایک کو روزی مہیا کرتا ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (بنی اسرائیل: ۳۱)

اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی بے شک ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔

اولادکشی کا تیسرا سبب یہ تھا کہ لوگ لڑکیوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اپنی نام نہاد ننگ و عار کے خلاف سمجھتے تھے کہ اپنی لڑکی کسی دوسرے کے عقد میں دیں اس سبب سے لڑکی پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتے تھے یا زندہ درگور کر دیتے تھے جیسا کہ قبیلہ بنی تمیم کے سردار قیس بن عاصم نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تسلیم کیا کہ اس نے اپنی دس لڑکیوں کو زندہ درگور کیا تھا اسلام نے اس قبیح رسم کو بھی ختم کیا اور قرآن حکیم نے اس بدترین عمل کے دردناک انجام کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (التکویر۔ ۹،۸)

اور جب زندہ درگور کی ہوئی بچی سے (قیامت کے روز) پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظتِ اولاد ہی کے پیش نظر فرمایا کہ "قتل اولاد شرک جیسے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے"۔ اس کے علاوہ صلح حدیبیہ کے بعد جو عورتیں ایمان لائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جو بیعت کی اس میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرسکیں گی۔

مختصراً اسلام نے نہ صرف اولادکشی کو ختم کیا بلکہ اسقاط حمل کو بھی ناجائز قرار دیا ہے اور اولاد کے قیام کی ذمہ داری والدین پر عائد کر کے اولاد کے مناسب حقوق بھی مقرر کئے ہیں۔

اولاد کے حقوق

قرآن و احادیث سے اولاد کے مندرجہ ذیل حقوق ثابت ہوتے ہیں:-

۱۔ پرورش و رضاعت:- اولاد کا سب سے پہلا حق پرورش کا ہے۔ اسلام نے اولاد کی زندگی محفوظ کرنے کے ساتھ پرورش کا فریضہ بھی والدین پر عائد کیا ہے۔ اور اس ضمن میں تاکید کی ہے کہ وہ تنگی اور افلاس سے بچے رہیں۔ یہ فریضہ لڑکے کی صورت میں بلوغت تک اور لڑکی کی صورت میں شادی تک ادا کرنے کا حکم ہے۔ اس دوران بچے کی صحت و صفائی، نشو و نما لباس و طعام اور دیگر باتوں کی

پوری پوری خبر گیری کی جائے اور اس سلسلے میں جس قدر مصائب و آلام پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پرورش اولاد کی بہت تلقین کی ہے اور بالخصوص لڑکی کے بارے میں خصوصی تاکید کی ہے کیونکہ لڑکی خلقاً ضعیف و کمزور ہوتی ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ لڑکی کی پرورش والدین اور دوزخ کے درمیان پردہ ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو وہ شخص اور میں قیامت کے روز اس طرح ہونگے جس طرح یہ انگلیاں اور آپؐ نے اپنی شہادت کی اور درمیانی انگلی کو ملا کر دکھایا (مسلم)

مروی ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ کے پاس آکر سوال کیا اور اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں حضرت عائشہ کے پاس فقط ایک کھجور تھی وہی دے دی اس عورت نے کھجور کو دو ٹکڑے کر کے بچیوں میں بانٹ دیا اور چلی گئی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ عرض کیا آپؐ نے فرمایا جو شخص بچیوں کی آزمائش میں ڈالا گیا اور اس نے ان سے اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ ہونگی (بخاری)

ایک موقع پر آپ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کیا میں تم کو بہترین صدقہ سے آگاہ کر دوں؟ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ سلوک کرنا ہے جو تیری طرف لوٹائی گئی ہو (یعنی طلاق یافتہ یا بیوہ) اور تیرے سوا اب اس کے لئے کوئی کمانے والا نہیں۔ (ابن ماجہ)

پرورش کے ساتھ رضاعت بھی اولاد کا حق ہے یعنی پیدائش کے بعد دو سال تک بچے کو والدہ کا دودھ پلایا جائے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ	اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال
حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ	تک دودھ پلائیں یہ اس کے لئے ہے
أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ (البقرہ:۲۳۳)	جو رضاعت کی مدت پوری کرنا چاہے

اگر شیر خوارگی کے زمانہ میں بچے کی والدہ فوت ہو جائے یا اس کو طلاق دے دی جائے یا طبی نقطہ نگاہ سے والدہ کا دودھ مضر ہو تو والد کا فرض ہے کہ بچے کے لئے دودھ

پلانے کا انتظام کرے اور اس کے اخراجات اٹھائے طلاق کی صورت میں اگر ماں بچے کو دودھ پلائے تو باپ پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنی متعلقہ بیوی کے نان و نفقہ اور دیگر اخراجات کی ذمہ داری قبول کرے رضاعت کی مدت میں والدین کی باہمی رضامندی اور بچے کی صحت کے پیش نظر کمی بیشی ہو سکتی ہے

۲۔ تعلیم و تربیت: اولاد کا دوسرا حق تعلیم و تربیت کا ہے جسمانی پرورش کے علاوہ والدین پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ اولاد کو تعلیم دلائیں اور روحانی و اخلاقی تربیت دیں قرآن پاک کا ارشاد ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ — اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے
وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (التحريم:٦) — اہل و عیال کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ

اس حکم خداوندی کے پیش نظر والدین پر لازم آتا ہے کہ اپنی اولاد کو حسب استطاعت اعلیٰ دنیاوی تعلیم دلائیں تاکہ وہ اپنی روزی خود کما سکیں اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پال سکیں اور باعزت زندگی بسر کریں اس کے علاوہ دینی تعلیم سے بھی آراستہ کریں تاکہ وہ صحیح عقیدہ جات سے واقف ہو کر نیک سیرت و سعادت مند بنیں اور قوم و ملک کے مفید افراد ثابت ہوں۔

اس امر کی مزید وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز آدمی کے ساتھ سب سے پہلے جھگڑنے والے اس کے عیال ہونگے وہ خدا تعالیٰ سے کہیں گے کہ اے اللہ! تو اس سے ہماری داد لے ہم ناواقف تھے اور اس نے ہمیں حرام کھلایا ہمیں جو کچھ سکھانا فرض تھا اس نے نہ سکھایا اور ہم جاہل رہ گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں تربیت اولاد کی تاکید فرمائی ہے آپ کا ارشاد ہے کہ کوئی باپ اپنے بچے کو حسن ادب سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا (ترمذی) ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ انسان کا اپنی اولاد کو ادب کی ایک بات سکھانا ایک صاع (۴ ۱/۲ سیر) غلہ خیرات کرنے سے بہتر ہے (ترمذی)

دینی تربیت کے سلسلے میں آپ کا ارشاد ہے کہ جب تمہارے بچے سات برس کے ہو جائیں تو ان کو نماز پڑھایا کرو اور جب دس برس کے ہو جائیں تو انہیں مار کر نماز پڑھاؤ اور اس وقت الگ سلایا کرو (ابوداؤد)

تربیت اولاد کے بارے میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی نمونہ ہمارے سامنے ہے آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ آپؐ کے چچیرے بھائی حضرت علیؓ اور آپؐ کے نواسے حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ جنہوں نے آغوشِ رسولؐ میں پرورش و تربیت حاصل کی ان کی زندگیاں دنیا کے لئے اخلاق حسنہ کی بے نظیر مثالیں ہیں۔

۳۔ شفقت و محبّت: اولاد کا تیسرا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ رحمت و مؤدت اور شفقت و محبت کا سلوک کیا جائے اور ان پر شدید ظلم و زیادتی نہ کی جائے۔

اسلام جہاں اولاد کو قتل کرنے، بتوں کی بھینٹ چڑھانے، زندہ درگور کرنے اور ان پر شدید ظلم کرنے سے روکتا ہے وہاں اس امر کی بھی تاکید کرتا ہے۔ کہ اولاد کے ساتھ محبت اس قدر شدید نہ ہونی چاہئے کہ انسان خدا تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے احکام کو پسِ پشت ڈال دے اولاد کی خاطر حرام ذرائع سے روزی کمانے لگے۔ اولاد کو برے کاموں سے روکنے کے لئے سرزنش نہ کرے اور نیک کاموں کی تاکید کرنے میں غفلت کا اظہار کرے۔ درحقیقت اسلام اولاد کیساتھ اعتدال سے محبت کرنے کی تعلیم دیتا ہے چنانچہ قرآن پاک نے اولاد کو انسان کے لئے آزمائش قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (انفال ۲۸)	بیشک تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے آزمائش ہے۔

ایک دوسرے مقام پر تنبیہ کی ہے کہ اولاد کی محبت انسان کو خدا سے غافل نہ کر دے جیسا کہ فرمایا:۔

لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ	تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں خدا کے ذکر سے غافل نہ کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محبت اولاد کا اسوۂ ہمارے سامنے ہے۔ ایک روز ایک دیہاتی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کو صحابہؓ کے بچوں سے پیار کرتے دیکھ کر پوچھا کیا آپؐ بچوں کو چومتے اور پیار کرتے ہیں! ہم تو ایسا نہیں کرتے۔ آپؐ نے فرمایا کیا میں اس پر قادر

ہوں کہ تیرے دل سے خدا نے جو رحمت نکال لی ہے اس کو پھر تیرے دل میں رکھ دوں (بخاری و مسلم)

ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ کو چوما اور پیار کیا اور اس وقت اقرع بن حابس تمیمی بھی بیٹھا تھا۔ اقرع نے کہا میرے دس بیٹے ہیں لیکن میں نے ان میں سے کبھی بھی کسی کو نہیں چوما۔ اس پر حضورؐ نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا جو کسی پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا (بخاری)

ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدے کی حالت میں تھے کہ حضرت حسنؓ آپؐ کی کمر پر سوار ہو گئے آپؐ نے سجدے کو طول دیا جب نماز سے فارغ ہوئے تو ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ آپؐ نے سجدہ کیوں لمبا کر دیا تھا؟ آپؐ نے فرمایا کہ میرا بچہ مجھ پر سوار تھا اور میں نے پسند نہیں کیا کہ اس کے کھیل میں خلل ڈالوں۔

۴۔ عدل و مساوات: اولاد کا ایک حق عدل و مساوات بھی ہے اسلام تمام اولاد میں عدل کرنا اور کامل مساوات قائم رکھنا ضروری قرار دیتا ہے پرورش تعلیم و تربیت شفقت و محبت اور داد و دہش غرض ہر معاملہ میں سب اولاد میں مساوی سلوک روا رکھا جائے لڑکے اور لڑکی یا بڑے اور چھوٹے کا کوئی فرق و امتیاز ملحوظ نہ رکھا جائے کیونکہ عدل و مساوات قائم نہ رکھنے سے اولاد کے دل آپس میں پھٹیں گے باپ کے خلاف بھی نفرت پیدا ہو جائے گی اور بالآخر گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

بعض لوگ لڑکوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے ہیں اور لڑکیوں کی نسبت ان سے ترجیحی سلوک کرتے ہیں اسلام نے اسے سخت ناپسند کیا ہے اور لڑکیوں اور لڑکوں میں یکساں سلوک کی تاکید کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس امتیاز کو ناپسند فرمایا ہے، جیسا کہ آپؐ نے فرمایا جس شخص کے ہاں کوئی بچی پیدا ہوئی اور اس نے جاہلیت کے طریقہ پر زندہ دفن نہیں کیا اور نہ ہی اس کو حقیر جانا اور نہ لڑکوں کو اس کے مقابلہ میں ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جنت میں داخل کرے گا (ابوداؤد)

اسی طرح دنیا کے اکثر مذاہب میں بڑے اور چھوٹے کا فرق رکھا جاتا ہے اور سب سے بڑے کو خصوصی حق دیا جاتا ہے۔ اسلام نے اسے بھی سخت ناپسند کیا ہے اور سب

لڑکوں کو باپ کے مال میں یکساں حقدار ٹھہرایا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکوں میں سے ایک کو بلا وجہ کوئی عطیہ دینے اور باقیوں کو محروم رکھنے کو ظلم سے تعبیر فرمایا جیسا کہ حدیث ہے ۔

ایک صحابی رضؓ نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو غلام بخشا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانا چاہا چنانچہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی خواہش کا اظہار کیا آپؐ نے دریافت فرمایا کیا تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام بخشا ہے ۔اس نے عرض کیا نہیں آپؐ نے فرمایا تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا ۔ (ابوداؤد)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو

۵ ۔رسوم پیدائش : اولاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ پیدائش پر والدین خوشی منائیں اور بعض ضروری رسوم بھی ادا کریں بچہ کی پیدائش کے سلسلہ میں اسلامی رسوم یہ ہیں ۔

ا ۔تحنیک : بچہ پیدا ہونے کے بعد نہلا دھلا کر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنی چاہیئے مروی ہے کہ جب حضرت حسنینؓ میں سے ایک صاحب پیدا ہوئے تو حضورؐ نے انکے دائیں کان میں اذان دی اور بائیں میں اقامت کہی اس کے بعد تحنیک یعنی کھجور وغیرہ چبا کر بچے کے تالو میں لگانا مستحب ہے تحنیک کسی متقی و پرہیزگار شخص سے کرانی چاہیئے جیسا کہ حدیث ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بچے لائے جاتے تھے آپؐ ان کے حق میں دعا فرماتے اور تحنیک کرتے تھے ۔

ب ۔عقیقہ : عقیقہ دراصل ان بالوں کو کہتے ہیں جو بچے کی پیدائش سے اس کے سر پر ہوتے ہیں پھر اس جانور کو بھی کہنے لگے جو بچہ کی پیدائش کے بعد شکرِ نعمت کے طور پر ذبح کیا جاتا ہے ۔عقیقہ ایک قسم کا صدقہ ہے اور ہر شخص پر لازم نہیں بلکہ صرف صاحب حیثیت کے لیئے ضروری ہے ۔امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ سنت ہے اور زندگی میں کسی وقت بھی ادا کیا جاسکتا ہے ۔ساتویں روز ادا کرنا بہتر ہے ۔اگر اس روز ادا نہ ہو سکے تو چودھویں یا پھر اکیسویں دن ادا ہو سکتا ہے ۔بلکہ اگر والدین تمام عمر ادا نہ کر سکیں تو اولاد خود اپنا عقیقہ ادا کر سکتی ہے ۔

عقیقہ ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ جانور (بھیڑ بکری، دنبہ نر یا مادہ) ذبح کیا جائے لڑکی کی طرف سے ایک اور لڑکے کی طرف سے دو اور اگر دو کی استطاعت نہ ہو تو ایک ہی کافی ہے۔ گوشت احباب واقارب اور فقراء ومساکین میں تقسیم کیا جائے بچے کا سر منڈایا جائے اور بالوں کے برابر چاندی تول کر صدقہ میں دی جائے اس کے علاوہ بچے کا خوبصورت نام رکھا جائے۔

عقیقہ احادیث نبویؐ سے ثابت ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ بچہ اپنے عقیقہ میں رہن رکھا گیا ہے۔ ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے اس کا نام رکھا جائے اور اس کا سر منڈایا جائے (ترمذی) ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ لڑکے کی ولادت کے ساتھ عقیقہ ہے پس اس کی طرف سے خون بہاؤ اور بالوں وغیرہ کی گندگی دور کرو۔ (بخاری) ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسنؓ کا ایک بکری سے عقیقہ کیا اور آپؐ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا اس کا سر مونڈ دو اور سر کے بالوں کے برابر چاندی تول کر صدقہ کرو۔

ج۔ ختنہ: ختنہ کرانا اسلامی شعار ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پانچ چیزیں فطرت ہیں۔ زیر ناف بال مونڈنا، ختنہ کرانا، مونچھیں کترانا، بغلوں کے بال اکھاڑنا اور ناخنوں کا لینا۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ختنہ ضروریات دین سے ہے۔

ختنہ زیادہ سے زیادہ سات سال کی عمر تک ہونا چاہئے اس سے زیادہ تاخیر کرنا مناسب نہیں ختنہ کی تقریب کو عقیقہ کے ساتھ بھی ملایا جا سکتا ہے اور اگر الگ کی جائے تو دعوت کا اہتمام ضروری نہیں البتہ اگر استطاعت ہو اور نام ونمود اور لہو ولعب مقصود نہ ہو تو دعوت کرنے میں کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

د۔ شادی: اولاد کا یہ بھی حق ہے کہ جب اولاد بالغ ہو جائے تو حسب استطاعت اس کی شادی کا انتظام کریں شادی کرتے وقت محض اپنی مصلحتوں کو مدنظر نہ رکھیں بلکہ اولاد کی رضامندی حاصل کریں طرفین میں، سیرت، صورت، عمر،

تعلیم، دین، خاندان وغیرہ میں جس قدر ہم آہنگی و یکسانیت ممکن ہو سکے اور اچھا ساتھی تلاش کیا جا سکے بہتر ہے بالخصوص لڑکی کے لئے بہترین شوہر کا انتخاب اشد ضروری ہے۔ لڑکے کی رضا اس سے پوچھ کر اور لڑکی کی رضا قرائن سے معلوم کی جاتی ہے۔

شادی میں اولاد بالخصوص لڑکی کی رضامندی حاصل کرنے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت تاکید فرمائی ہے آپؐ کا ارشاد ہے کہ کنواری عورت کے نکاح کے معاملہ میں اجازت حاصل کی جائے وہ خاموش رہے تو اس کو اس کی اجازت سمجھا جائے اور اگر انکار کرے تو اس پر جبر نہ کیا جائے۔

ایک مرتبہ ایک لڑکی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح کر دیا ہے اور وہ اس سے ناخوش ہے آپؐ نے لڑکی کو اختیار دے دیا کہ نکاح برقرار رکھے یا توڑ دے (ابوداؤد)

۷۔ **میراث**: اولاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ باپ کی وفات کے بعد اس کی میراث میں حصہ لے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ	اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے متعلق
لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ	حکم دیتا ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے
(النساء: ۱۱)	برابر (میراث میں) حصہ دو۔

اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق لڑکے کو لڑکی کی نسبت دگنا حصہ ملتا ہے! اور کسی باپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی زندگی میں اپنی اولاد میں سے کسی ایک لڑکے یا لڑکی کو بالکل محروم کر دے یا کسی ایک کو یا چند کو پوری جائیداد کا وارث بنا جائے بلکہ اسلام سب کے ساتھ عدل کا سلوک کرتا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دنیا میں اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے لڑکی کو بھی باپ کی جائیداد میں حقدار ٹھہرایا ہے۔

ثمرات و فوائد

اولاد کی پرورش تعلیم و تربیت اور ان کے دیگر حقوق کی ادائیگی ایک بہت بڑی قومی و دینی خدمت ہے جس کے دنیا و آخرت میں بہت سے فوائد ہیں۔

نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے نیک اولاد سے دنیا میں نیک نامی حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں اس کی دعاؤں اور نیک کاموں سے والدین کے درجات میں اضافہ ہوتا ہے نیز نیک اولاد کی بدولت انسان کا بڑھاپا جو زندگی کی انتہائی کٹھن منزل ہے۔ نہایت ہی آرام و سکون سے بسر ہوتا ہے۔

حقوق زوجین

مفہوم : زوجین لفظ زوجہ کا تثنیہ ہے ۔ جس کے معنی جوڑا اور ساتھی ہیں ۔ یہ لفظ مذکر و مونث یعنی خاوند اور بیوی ہر دو کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ زوجین کے معنی دو زوج یعنی خاوند اور بیوی ہیں ۔

حقوق زوجین سے مراد وہ مراعات اور باتیں ہیں جو خاوند اور بیوی کو ایک دوسرے کی طرف سے حاصل ہیں یا وہ ذمہ داریاں ہیں جو خاوند اور بیوی پر ایک دوسرے کے لئے عائد ہوتی ہیں ۔ بالفاظ دیگر حقوق زوجین کو فرائض زوجین بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک کے فرائض دوسرے کے حقوق ہوتے ہیں ۔

اہمیت

رشتہ زوجیت درج ذیل پہلوؤں کی بنا پر نہایت اہم ہے ۔

۱۔ بنیادی رشتہ: دنیاوی تعلقات میں والدین اور اولاد کے بعد سب سے مضبوط رشتہ زوجین کا ہے ۔ اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ رشتہ باقی تمام رشتوں کی اصل بنیاد ہے ۔ عائلی یا اہلی زندگی کا آغاز بھی اسی رشتے سے ہوتا ہے اور اسی سے ہی بنی نوع انسان کا سلسلہ چلتا ہے ۔ ازدواجی زندگی اختیار کرنے سے ہی حسن سلوک اور حسن معاملات کا عمدہ موقع میسر آتا ہے ۔ اس سے ہی مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں ۔ معاشرے میں صحیح معنوں میں توازن و اعتدال پیدا ہوتا ہے ۔ اور ایک صحت مند و صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے ۔

۲۔ کتاب و سنت میں تاکید: قرآن مجید اور احادیث رسولؐ میں نکاح اور ازدواجی زندگی کو اختیار کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے ۔ قرآن حکیم نے یہ بتایا ہے کہ ساری کائنات کا نظام اسی رشتہ زوجیت پر مبنی ہے جیسا کہ فرمایا ۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ — اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے۔

(الذاریات ۴۹)

پھر بنی نوع انسان کے متعلق خصوصیت سے بتایا کہ یہ بھی اسی رشتہ کا معجزہ ہے جیسا کہ فرمایا:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا۔ (البقرۃ) — اور یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہیں میں سے جوڑے پیدا کئے۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے نکاح کی تاکید ان الفاظ میں کی:۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ (نور ۳۲) — اور تم میں سے جن کے نکاح نہیں ہوتے ان کے نکاح کرا دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی نکاح کراؤ جن میں اس کی صلاحیت ہو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا۔ جیسا کہ فرمایا۔

اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ۔ — نکاح کرنا میری سنت ہے اور جو شخص میری سنت سے احتراز کرے وہ مجھ سے نہیں۔

ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "جس کو میری فطرت سے محبت ہو وہ میری سنت پر چلے اور وہ نکاح ہے۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔ جو شخص میرے اور داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ابراہیمؑ کے دین پر ہے اگر اس کو توفیق ہو تو نکاح کرے"۔ نیز آپ نے فرمایا کہ "جو آدمی نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اور نکاح نہ کرے اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نکاح کو جزو ایمان قرار دیا۔ آپ نے فرمایا:

اَلنِّكَاحُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ — نکاح نصف ایمان ہے

ایک دوسرے موقع پر

ارشاد فرمایا کہ جس نے نکاح کیا اس نے اپنا آدھا ایمان بچا لیا پس اسے چاہئے کہ دوسرے آدھے حصے کی بھی حفاظت کرے۔ ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی مسلمان نکاح کرتا ہے تو شیطان چیخ اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا برا ہو اس نے مجھ سے دو تہائی دین بچا لیا۔ مختصر یہ کہ احادیث نبوی میں نکاح کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

ازدواجی زندگی کا مقصد

اسلام ازدواجی زندگی کو ایک مقدس فریضہ قرار دیتا ہے۔ اور اپنے ماننے والوں کو ازدواجی زندگی اختیار کرنے اور اس کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسلام کے نقطہ نظر سے ازدواجی زندگی کا مقصد مرد اور عورت کو اس فطری زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔ جس سے معاشرے میں اعتدال و توازن پیدا ہوتا ہے۔ جس سے مرد اور عورت کے اخلاق اور عصمت و عفت کی حفاظت ہوتی ہے اور ناجائز جنسی تعلقات کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ جس سے مرد اور عورت میں باہمی الفت و محبت، خلوص و ہمدردی اور اشتراک و تعاون کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور دونوں خوشگوار اور پرسکون زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس سے مرد اور عورت میں زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں مزید محنت و مشقت کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ازدواجی زندگی اختیار کرنے کا مقصد مرد اور عورت کو ایک صالح و صحت مند معاشرے کی بنیادیں استوار کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔

زوجین کے مراتب

دنیا کے سماج میں مرد اور عورت کی حیثیت و مرتبہ مقرر کرنے میں ہمیشہ افراط و تفریط سے کام لیا جاتا رہا۔ اسلام سے پیشتر عورت کی حالت انتہائی ابتر تھی اور مرد کے مقابلہ پر اس کی

حیثیت کو قطعاً تسلیم نہ کیا جاتا تھا۔ بعض قوموں کے نزدیک بیٹی کا وجود باعثِ ذلت تصور کیا جاتا تھا۔ لڑکی کو اکثر زندہ درگور کر دیا جاتا یا دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔ شادی کے بعد عورت شوہر کی زر خرید لونڈی سمجھی جاتی تھی اور اس کا وجود شوہر کا وجود ہوتا تھا جب کوئی شخص انتقال کر جاتا تو اس کی بیویاں بھی اس کی اولاد میں جائداد کے ساتھ تقسیم ہو جاتی تھیں۔ غرض بیٹی، بیوی، ماں ہر لحاظ سے عورت کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے برعکس دورِ جدید میں بعض معاشروں نے عورت کا مقام متعین کرنے میں اس قدر غلو سے کام لیا ہے کہ عورت اور مرد میں کچھ امتیاز باقی نہیں رہنے دیا۔

اسلام نے اس افراط و تفریط سے ہٹ کر مرد اور عورت کو ان کا صحیح مرتبہ مقام دیا ہے۔ اسلام تمام زندگی میں مرد اور عورت بیچ مساوات کا حامی ہے۔ دینی و روحانی اعتبار سے دونوں کو اپنے نیک کام کرنے کا مساوی اجر ملے گا اور دونوں ہی جنت و دیگر انعاماتِ ربانی کے یکساں مستحق ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی

بے شک میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے مرد اور عورت کے اجر کو ضائع نہیں کرونگا۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ یُرْزَقُوْنَ فِیْہِ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔

اور جو نیک عمل کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہے تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہونگے جہاں بغیر حساب انہیں رزق دیا جائے گا۔ (المومن: ۴۰)

دنیاوی و مادی لحاظ سے بھی دونوں برابر ہیں۔ مرد کی طرح عورت بھی جائداد کی مالک ہو سکتی

ہے اور حدود شہری میں رہتے ہوئے کوئی سا فن یا پیشہ اختیار کر سکتی ہے۔ قانون کی نگاہ میں بھی دونوں ایک حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا — مردوں کے لئے وہی ہے جو کچھ وہ کماتے ہیں اور

وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ — عورتوں کے لیے بھی وہی ہے جو وہ کماتی ہیں

(النساء: ۳۲)

اور فرمایا:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ — وہ عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم

لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرۃ: ۱۸۷) — اِن کے لئے لباس ہو۔

لیکن یہ مساوات اہلِ زندگی کے دائرے میں ممکن نہیں کیونکہ گھر کا صحیح انتظام چلانے کے لیے سربراہ فقط ایک ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دو سربراہوں کی صورت میں ہر وقت جھگڑے اور اختلاف کا امکان رہتا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک نے جسمانی ساخت اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر محافظ اور منتظم و نگران مقرر کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ — مرد اور عورتوں پر نگران ہیں، اس وجہ سے کہ

بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ — اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔

بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَا — اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے مالوں میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (النساء: ۳۴)

لِهِمْ (النساء: ۳۴)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ — عورتوں کو مردوں پر ایسا ہی حق ہے جیسا کہ

بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ — مردوں کو عورتوں پر اور مردوں کو عورتوں

دَرَجَةٌ (البقرۃ: ۲۲۸) — پر ایک درجہ (فوقیت) حاصل ہے۔

انسانی زندگی دو حصوں میں منقسم ہے۔ بیرون خانہ زندگی اور خانگی زندگی۔ بیرون خانہ زندگی کی تمام تر مصروفیات فقط مرد کا حصہ ہیں لیکن خانگی زندگی کے تعلق میں مرد اور عورت دونوں پر بعض مشترکہ اور بعض مخصوص ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ مرد اپنی صلاحیت اور استعداد کی بدولت اپنے اور اہل و عیال کے لئے کسب معاش کرتا اور ضروریات زندگی مہیا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اہل و عیال کی حفاظت و نگرانی کی ذمہ داری بھی مرد پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اس لئے مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت دی گئی ہے۔ اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ اہلی زندگی اختیار کرنے کے بعد عورت کی حیثیت کم ہو گئی بلکہ بیوی کی حیثیت سے اگر اس کے مقام میں کچھ کمی ہوئی بھی ہے تو ماں کی حیثیت سے اس کا مقام کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

حدیث شریف میں گھریلو زندگی میں مرد اور عورت کے تعلق کو راعی اور رعایا کی عمدہ مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "مرد اپنے گھر والوں کا راعی (نگران) ہے اور وہ اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد کی راعیہ (نگران) ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے" (بخاری و مسلم) اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اہلی زندگی میں مرد کی حیثیت ایک بادشاہ اور عورت کی حیثیت ایک وزیر باتدبیر کی ہے اور گھر ان کی سلطنت ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اسلام مرد اور عورت ہر دو کو افراط و تفریط سے بچا کر اہلی زندگی میں انہیں ان کا صحیح مقام عطا کرتا ہے۔ عورت کو ماں، بیوی اور بیٹی ہر روپ میں قابل احترام قرار دیتا ہے اور احترام انسانیت کے نقطہ نظر سے دونوں کو مساوی قرار دیتا ہے۔ اگر انتظامی غرض سے "زوجین" میں مرد کو فوقیت دی ہے تو والدین میں عورت کی بحیثیت والدہ کئی درجہ حیثیت بلند کی ہے۔

حقوق و فرائض زوجین

خاوند و بیوی چونکہ جسمانی ساخت اور استعداد کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مرد زیادہ محنت و مشقت کر سکتا ہے اور عورت امور خانہ کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے دونوں کے حقوق و فرائض بھی ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ اگرچہ دونوں میں باہمی اشتراک و تعاون ناگزیر ہے۔

خاوند کے حقوق یا بیوی کے فرائض

خاوند کے حقوق یا بیوی کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ **اطاعت و فرمانبرداری:** بیوی کا اولین فرض یہ ہے کہ ہر اس معاملہ میں جس میں خدا اور رسولؐ کی نافرمانی نہ ہوتی ہو اپنے خاوند کی اطاعت کرے اور مکمل فرمانبرداری کا ثبوت دے والدین، رشتہ دار اور ذاتی خواہشات غرض ہر معاملہ میں خاوند کی رضا و خوشنودی کو ترجیح دے۔ امارت و غربت اور خوش حالی و تنگی ہر حال میں اس کی وفادار رہے۔ اور کبھی بھی بات ناراض ہونے کا موقع نہ دے۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (النساء: ۳۴) (نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس بارے میں بہت تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کا فرمان ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی امت کی عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں۔ (ترمذی) ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ پرہیزگاری کے بعد نیک عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ شوہر اسے جو کہے وہ مانے اور جب اس کی طرف دیکھے خوش کر دے۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی عورت مرے اس

حال میں کہ اس کا خاوند اس سے راضی ہو تو وہ جنت میں جائے گی (ترمذی)

خاوند کی اطاعت کا شریعت نے یہانتک حکم دیا ہے کہ اگر خاوند بیوی کو نفل نماز یا نفل روزہ چھوڑ دینے کے لئے کہے تو اطاعت لازم ہے اس صورت میں اگر بیوی نوافل ادا کرے گی تو مقبول نہیں ہوں گے۔ اسی طرح بیوی اپنے خاوند کے گھر سے کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہیں دے سکتی اور اگر ایسا کرے گی تو شوہر کو اجر ملے گا اور بیوی گناہ گار ٹھہرے گی نیز بیوی کو خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلنا چاہیئے۔

البتہ اگر خاوند اپنی بیوی سے ایسی باتوں کا مطالبہ کرے جو خلاف شریعت ہوں مثلاً فرائض عبادات سے منع کرے، حرام کھانے کو کہے، فواحش کا ارتکاب کرانا چاہئے تو ان تمام صورتوں میں بیوی پر خاوند کی اطاعت لازم نہیں کیونکہ خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی فرمانبرداری جائز نہیں

۲۔ تحفظ مال وعزت: بیوی کا دوسرا فرض یہ ہے کہ خاوند کی عدم موجودگی میں اپنی عصمت و آبرو اور اس کے مال و متاع کی حفاظت کرے۔ نیز خاوند کی عزت و وقار کا خیال رکھے۔ کسی اجنبی شخص کو خاوند کی اجازت کے بغیر گھر میں نہ آنے دے۔ نہ ہی اس کی اجازت کے بغیر خود ہی باہر جائے اور نہ ہی اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جس سے اس کی اپنی عصمت وپاکدامنی یا خاوند کی عزت و آبرو پر حرف آئے۔ اسی طرح بیوی کو چاہیے کہ خاوند کے مال و اسباب کی پوری پوری حفاظت کرے اور اس کی مرضی کے بغیر خرچ نہ کرے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ

نیک عورتیں وہ ہیں جو اطاعت کرنے والی ہوں اور خاوند کے پیچھے ان چیزوں کی حفاظت کرنے والی ہوں جن کی حفاظت اللہ نے ان کے سپرد کی ہو۔

(النساء: ۳۴)

اس آیت کریمہ کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے

جس میں آپ نے فرمایا کہ وہ بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تو اسے دیکھے تو تیرا دل خوش ہو جائے جب تو کسی بات کا حکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے اور جب تو گھر سے باہر ہو تو وہ تیرے پیچھے تیرے مال اور اپنے نفس کی حفاظت کرے (نسائی) ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ جب کوئی عورت فرض نماز پڑھے ، ماہ رمضان کے روزے رکھے اپنے ناموس کی حفاظت کرے اور شوہر کی اطاعت کرے تو جنت میں جس دروازے سے چاہے داخل ہو۔ حضور اکرمؐ کا یہ بھی فرمان ہے کہ بہترین عورت وہ ہے کہ جب اس کا خاوند غائب ہو تو وہ اپنے نفس کی حفاظت کرے ۔

۳۔ **امور خانہ کی انجام دہی:** بیوی کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ گھر کے تمام کام کاج مثلاً کھانا پکانا صفائی وغیرہ کرے اور جو کام خود انجام دے سکتی ہو اس کے کرنے میں تامل نہ کرے ۔ اس کے علاوہ بچوں کی پرورش و تربیت کی طرف توجہ دے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد کی نگران ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے "۔

۴۔ **شکر گزاری:** بیوی پر ایک فرض یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ خاوند کے احسانات کی ناشکری نہ کرے اور نہ ہی بلاوجہ ناجائز باتوں سے خاوند کو ذہنی پریشانی دے بلکہ دکھ سکھ اور تنگدستی و خوشحالی ہر حالت میں خاوند کی شکر گزار و قانع رہے ۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے دوزخ کو دیکھا تو اس میں سب سے زیادہ عورتوں کو پایا ۔ اس کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اپنے خاوندوں کو لعن طعن اور ان کی ناشکر گزاری و ناحق شناسی سے ان کا یہ حال ہے (بخاری) ۔ آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے کہ وہ طویل عرصے تک اپنے والدین کے گھر کنواری بیٹھی رہتی ہے ۔ پھر خدا تعالیٰ اسے شوہر دیتا ہے اور اس سے اس کی اولاد ہوتی ہے پھر وہ شوہر سے یوں کہتی ہے کہ مجھ کو تجھ سے کوئی آرام نہ ملا تو نے میرے ساتھ کوئی احسان نہیں کیا ۔

۵۔ **عدت:** بیوی پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ خاوند کی وفات کے بعد چار ماہ دس دن تک اس کے گھر میں عدت گزارے ۔ اسلام نے عدت کو بیوی کا حق نہیں بلکہ اس کا فریضہ قرار دیا ہے تاکہ ازدواجی زندگی میں زیادہ سے زیادہ یک جہتی و ہم آہنگی پیدا ہو سکے ۔

بیوی کے حقوق یا خاوند کے فرائض

بیوی کے حقوق یا خاوند کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ مہر: خاوند کا اولین فرض یہ ہے کہ اپنی بیوی کا مہر ادا کرے۔ مہر سے مراد وہ رقم یا مال ہے جو حق زوجیت پر بطور معاوضہ خاوند پر بیوی کو دینا لازم آتا ہے۔ اسلام بیوی کی مستقل حیثیت و شخصیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے موقف کو محفوظ کرنے کے لیے اسے بعض معاشی حقوق بھی عطا کرتا ہے جن میں سے ایک مہر ہے۔ مہر کا اصل مقصد یہ ہے کہ عورت کی مالی حیثیت کو اس قدر مضبوط کر دیا جائے کہ وہ بوقت ضرورت اپنے حقوق کی مدافعت کر سکے نیز یہ بھی مقصد ہے کہ نکاح کے وقت سے ہی مرد کو بیوی کی کفالت اور اس کی ضروریات کا احساس دلایا جائے۔

مہر نقد یا جنس دونوں طرح مقرر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نقد زیادہ بہتر ہے۔ مہر کی رقم خاوند کے پیش نظر فریقین کے باہمی تصفیہ سے طے ہوتی ہے اور نکاح کے وقت مرد کو ادا کرنا پڑتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں جہاں بھی نکاح کا ذکر ہوا ہے وہاں خصوصیت سے مہر کی ادائیگی کی تاکید بھی کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء:۴)

اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے ادا کرو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (النساء:)

پس تم قرار داد کے مطابق ان کے مہر ادا کرو۔

مہر اگر نکاح کے وقت ادا نہ کیا جائے تو خاوند پر قرض رہتا ہے۔ جسے وہ زندگی میں

کبھی بھی یک مشت یا قسطوں کی صورت میں ادا کر سکتا ہے۔ لیکن جس قدر جلد ادا کیا جائے، بہتر ہے۔ البتہ اگر خاوند ادا نہ کر سکتا ہو تو بیوی سے اس کا کچھ حصہ یا سارا معاف کرا سکتا ہے۔ لیکن اس معاملہ میں بیوی پر زبردستی کرنا جائز نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا (النساء) پھر اگر وہ (بیوی) خوشی سے اس میں سے کچھ معاف کر دے تو اسے مزے سے کھاؤ

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ (النساء) اور اگر تم معاہدہ کے بعد اس میں کمی یا زیادتی پر باہمی رضامندی سے کوئی تصفیہ کر لو تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔

اگر نکاح کے وقت مہر مقرر ہی نہ کیا جائے تو نکاح ہو جاتا ہے اور مہر بعد میں باندھا جا سکتا ہے یا پھر مہر مثل ادا کرنا پڑتا ہے جو عورت کے خاندان کے اعتبار سے شمار ہوتا ہے۔ بہرکیف اگر خاوند اپنی زندگی میں مہر ادا نہ کر سکے تو بیوی اس کی میراث میں سے وصول کر سکتی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر کی ادائیگی پر اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ آپ کا ارشاد ہے "شرطوں میں سے وہ شرط سب سے زیادہ پوری کرنے کی مستحق ہے جس کے ذریعے تم عورتوں کی عصمت کے مالک بنے ہو" (بخاری و مسلم) ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ "جس نے ایک مال مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ مہر ادا نہیں کرے گا وہ در اصل زانی ہے"۔

نفقہ: خاوند پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ بیوی کو تمام ضروریات زندگی مثلاً کھانا، پینا، پہننا اور رہائش مہیا کرے۔ اس کو نفقہ کہتے ہیں اور یہ خاوند پر حسب استطاعت لازم آتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (البقرۃ) دولت مند پر اس کی حیثیت کے مطابق اور نادار پر اسکی استطاعت کے مطابق (البقرہ)

آنحضور نے بھی نفقہ کو بیوی کے حقوق میں سے قرار دیا ہے۔ چنانچہ حدیث ہے کہ ایک صحابیؓ نے آپ سے پوچھا کہ بیوی کا کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جو تو کھائے اسے بھی کھلائے اور جو تو پہنے اسے پہنائے اور اس کے چہرے پر نہ مارے اور نہ بددعا کہے اور اگر اس سے ترک تعلق کرے تو اپنے تک محدود رکھے۔ (ابوداؤد)

اگر کوئی شخص بخل سے کام لے کر اپنی حیثیت سے بہت کم نفقہ ادا کرے اور بیوی کی جائز ضروریات پوری نہ کرے تو بیوی کو حق حاصل ہے کہ وہ خاوند کی لاعلمی میں اس کی دولت میں سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لے لے۔ چنانچہ فتح مکہ کے روز ابوسفیان کی بیوی ہندہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یارسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہے اور وہ مجھے اور میرے بچوں کو ضرورت سے کم مال دیتا ہے۔ کیا میں اس کے مال میں سے اسے بتائے بغیر کچھ لے سکتی ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو۔

اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کو نفقہ مہیا نہ کر سکتا ہو تو اسے مناسب مدت کی مہلت دی جائے گی کہ وہ بیوی کی ضروریات زندگی کا انتظام کرے اور اگر اس مدت میں انتظام نہ کر سکے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کا اختیار حاصل ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص عمداً اپنی بیوی کو نفقہ نہ دے تو یہ ظلم ہے اور بیوی کو حق حاصل ہے کہ عدالت کے ذریعے زبردستی نفقہ وصول کرے۔ پھر اگر خاوند عدالت کے حکم کی تعمیل نہ کرے تو قاضی کو حق حاصل ہے کہ دونوں میں تفریق کرا دے۔

۳۔ **حسن سلوک:** خاوند کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ بیوی کے ساتھ حسن سلوک اور حسن اخلاق کا رویہ رکھے۔ بول چال، رہن سہن اور تمام معاملات میں نہایت خوش کن انداز اختیار کرے اور کسی قسم کا ظلم یا زیادتی نہ کرے۔ بلکہ ان کی غلطیوں سے درگذر کرے اور حلم و بردباری سے پیش آئے چنانچہ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا۔

اور ان (بیویوں) کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کی بہت تاکید فرمائی ہے آپؐ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے بہتر ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ مومنوں میں کامل ترین مومن وہ ہے جو خلق میں بہت اچھا اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ نرم ہو۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنی بیوی کی سخت کلامی برداشت کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اتنا اجر عطا فرماتا ہے جتنا حضرت ایوبؑ کو ان کی تکلیف پر دیا گیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ "مسلمانو! عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ میں تمہیں عورتوں کے بارے میں تقویٰ کی تلقین کرتا ہوں۔ ان کے ساتھ نیک سلوک کرو وہ تمہارے بس میں ہیں۔

اسلام بیوی کے ساتھ صرف حلم و بردباری کے برتاؤ کا ہی حکم نہیں دیتا بلکہ یہ بھی تلقین کرتا ہے کہ بیوی میں نقائص ہونے کے باوجود حتی الامکان اس سے تعلق قائم رکھا جائے اور نفرت نہ کی جائے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کوئی مومن اپنی مومن بیوی سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی ایک عادت پسند نہیں تو اس کی اور دوسری عادتیں پسند آ جائیں گی۔ مثلاً اگر صورت اچھی نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ اس کی سیرت اچھی ہو۔ جب بیوی کو بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر الگ کرنا ہی پڑے تو اس وقت بھی اسلام حسن سلوک سے رخصت کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (حسن سلوک سے علیحدہ کردو)۔ طلاق کا ارادہ کر لینے کے بعد عورت کو محض ستانے اور تنگ کرنے کے لیے روک رکھنا خلاف شریعت اور ظلم ہے۔

۴. عدل و انصاف: خاوند کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ اپنی بیوی یا بیویوں کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک رکھے۔ اگر ایک بیوی ہو تو اسے خوراک پوشاک اور رہائش مہیا کی جائے اور اس کے سب حقوق پورے کئے جائیں۔ یہی عدل ہے اگر ایک سے زائد بیویاں ہوں تو سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ ان کے رہنے سہنے، کھانے پینے پہننے اور جنسی تعلقات میں برابری و مساوات قائم رکھی جائے۔ اسی لئے قرآن پاک نے ایسے شخص کو جو سب بیویوں میں مساوات نہ رکھ سکتا ہو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء ۴)

پس اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو۔

نیز بیویوں میں عدل قائم رکھنے کے بارے میں فرمایا۔

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ ۸)

تم انصاف کرو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے

آنحضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں دنیا کے سامنے لاثانی مثال پیش کی ہے۔ تعدد ازدواج کے باوجود آپؐ کا گھر عدل و مساوات کے اعتبار سے ایک جنت تھا۔ ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کبھی آپؐ نے اپنی کسی بیوی پر سختی کی ہو۔ بلکہ آپؐ ازواج مطہرات میں عدل و مساوات قائم رکھنے کا حد سے زیادہ اہتمام فرماتے تھے اور اس احتیاط کے باوجود بارگاہ ایزدی میں بار بار یہ دعا کرتے تھے کہ "اے اللہ! جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے ان کے درمیان انصاف ملحوظ رکھا لیکن اگر مجھ سے کہیں ناانصافی کا مظاہرہ ہوا ہو تو معاف فرما"۔

حضور اکرمؐ نے دوسروں کو بھی بیویوں کے ساتھ عدل و مساوات کا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنی بیویوں میں امتیاز روا رکھے گا اس کا نصف بدن قیامت کے روز ٹیڑھا ہو جائے گا۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جب کسی شخص کے پاس دو بیویاں ہوں اور اس نے ان کے حقوق میں عدل و انصاف قائم نہ رکھا تو قیامت کے دن وہ

اس حال میں آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ رہ گیا ہوگا ۔

خاوند پر ایک فریضہ یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے جسم عصمت اور اخلاق
۵۔ حفاظت: کی نگہداشت کرے کیونکہ عورت صنفِ نازک ہونے کی بنا پر ہر وقت مرد کی نگہداشت کی محتاج ہے ۔ اسی لئے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاۗءِ (نساء ۳۴) مرد عورتوں پر محافظ ہیں ۔

آنحضورؐ نے بھی اس ضمن میں ارشاد فرمایا کہ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور وہ اپنی رعایا کے متعلق جواب دِہ ہے ۔

مرد نہ صرف عورت کے جسم و اخلاق کا ہی محافظ ہے بلکہ اس کے رازوں کی حفاظت کا بھی ذمہ دار ہے یعنی خاوند کے لئے ضروری ہے کہ بیوی کی رازدارانہ باتوں کو دوسروں کے سامنے بیان نہ کرے ۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز بدترین شخص وہ ہوگا جو بیوی کے راز سے باخبر ہوا اور اس نے اسے افشا کر دیا ۔

۶۔ میراث: خاوند کے فوت ہو جانے کے بعد بیوی اس کی میراث میں بھی حق رکھتی ہے اگر اولاد ہو تو آٹھواں حصہ اور اگر اولاد نہ ہو تو چوتھائی حصہ ملے گا ۔

ثمرات و فوائد

ازدواجی زندگی اختیار کرنے سے مرد اور عورت میں محبت و شفقت اور خلوص و ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے دونوں کے اخلاق اور عصمت و عفت کو تحفظ حاصل ہوتا ہے ۔ زندگی کے سفر میں دونوں ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوتے ہیں ۔ معاشرے میں اعتدال و توازن پیدا ہوتا ہے اور ایک صحت مند و صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے ۔

نیز ازدواجی زندگی اپنانے سے خدا اور اسی کے رسولؐ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور انسان باری تعالیٰ کے دنیوی و اخروی انعامات سے سرخرو ہوتا ہے ۔

اسلامی نظام تعلیم

(مکتب و مسجد)

تعلیم

مفہوم: علم کے لغوی معنی جاننا، پہچاننا، واقفیت حاصل کرنا اور یقین کرنا ہیں۔ لیکن اصطلاح میں علم سے مراد سن کر یا مطالعہ سے کسی چیز کے متعلق صحیح معلومات اخذ کرنا، اس کی حقیقت کو جاننا اور اس کی صحت کی یقین حاصل کرنا ہے۔ تعلیم کے معنی علم حاصل کرنا اور سکھانا ہے۔

نوعیت: اسلامی تعلیم کا دائرہ نہایت وسیع ہے مفکرین نے علوم کی دو بڑی قسمیں بیان کی ہیں:-

۱- دینی علوم یا علوم نقلیہ: جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے انبیاءؑ کی وساطت سے سینہ بسینہ ہم تک پہنچے ہیں یا جو علوم قرآن وسنت کے سمجھنے میں ممد و معاون ہوں دینی علوم کہلاتے ہیں مثلاً علم القرآن، علم الحدیث، علم التفسیر، علم السیر و المغازی، علم فقہ وغیرہ۔

۲- دنیوی علوم یا علوم عقلیہ: وہ علوم جو انسان نے اپنی عقل و تجربات سے حاصل کئے ہیں دنیوی علوم کہلاتے ہیں مثلاً سائنس، ادب، فلسفہ، ریاضی، ہیئت و کیمیا وغیرہ اسلام علوم کی ان تمام اقسام کے حصول کو جائز قرار دیتا ہے بشرطیکہ دین و مذہب پر کوئی زد نہ پڑتی ہو۔ دراصل اسلام کو تمام علوم پر فوقیت حاصل ہے اور اسلام کا نظریۂ تعلیم یہی ہے کہ جو دنیوی علوم پڑھے جائیں ان کا مقصد بھی فہم دین میں آسانی پیدا کرنا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دنیوی علوم کو دینی علوم کے تابع رکھتا ہے اور صرف انہی علوم کی تعلیم کو پسند کرتا ہے جو اسلامی معاشرے کے لئے مفید و نفع بخش ہوں۔ جن علوم کے حصول سے دنیاوی لالچ وابستہ ہو اور انسانیت کو

فرمبرچیتا ہو اسلام نے ان کی تعلیم کو سخت ناپسند کیا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس قسم کی تعلیم سے پناہ مانگی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:
اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ۔ اے اللہ میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو کوئی نفع نہیں دیتا۔

۲۔ اہمیت و فضیلت

اسلام میں تعلیم کی اہمیت و فضیلت کے متعدد پہلو ہیں۔

۱۔ **قرآن پاک کا ارشاد:** تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کلامِ الٰہی کی پہلی وحی جو نبی کریم پر نازل ہوئی تعلیم کی فضیلت کے بیان پر مشتمل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۝ (العلق: ۱-۵)

(اے نبی) پڑھئے اپنے پروردگار کے نام سے جس نے سب کو پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھئے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم دی وہ باتیں سکھائیں جو انسان کو معلوم ہی نہیں تھیں۔

قرآن پاک میں جابجا علم کی فضیلت و برتری کا ذکر ہے۔ ایک جگہ عالم اور جاہل کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝ (الزمر: ۹)

فرمائیے کیا علم والے اور بے علم برابر ہوسکتے ہیں؟ نصیحت صرف وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

پھر قرآن پاک میں تعلیم کو خدا شناسی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے جیسا کہ فرمایا :-

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ۝ (الفاطر: ۲۸)

اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں بیشک اللہ زبردست بخشنے والا ہے۔

قرآن پاک نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد کتاب و حکمت کی تعلیم بتایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے :-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (الجمعہ: ۲)

وہی ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو انہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ درآنحالیکہ اس سے پیشتر وہ کھلی گمراہی میں تھے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جو انسانوں کے سب سے بڑے معلم ہیں انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے مزید علم کے حصول کی دعا مانگنے کی تلقین کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا (طٰہٰ: ۱۱۴)

اور (اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ اے میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ کر

علم کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ خود سرچشمہ علم ہے اور قرآن پاک میں اس کی صفات عالم، علیم اور علام کا ذکر بھی ہوا ہے۔

۲۔ احادیث نبویؐ : آں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں تعلیم کی اہمیت و فضیلت بیان کی ہے اور اس کے حصول کی تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے :-

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت

(ابن ماجہ) پر فرض ہے۔

حصول تعلیم کے لئے طویل سفر کرنے کی ترغیب دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

۷ - اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ۔ علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے چین کیوں نہ جانا پڑے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد بھی تعلیم دینا ہی بیان فرمایا۔ آپؐ کا ارشاد ہے۔ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا بیشک میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ جسے بھلائی دینا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے اور علم صرف سیکھنے سے آتا ہے۔" ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ "صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا جائز ہے ایک وہ جسے اللہ نے مال دیا ہو اور وہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرے دوسرا وہ جسے اللہ نے علم دیا ہو اور وہ اس کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کرے اور اس کی تعلیم دے۔" آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے کہ جس نے علم کی طلب کی اور وہ کامیاب ہوا تو اسے دوہرا اجر ملے گا اور اگر وہ ناکام رہا تو ایک اجر پائے گا۔ نیز آپ کا ارشاد ہے کہ "علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں حصول تعلیم کو جنت کا راستہ طے کرنے کے مترادف قرار دیا اور طالب علم کی موت کو شہادت کا رتبہ دیا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "جو آدمی تلاش علم کا راستہ اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔" ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ طالب علم کو علم کی تلاش کے دوران موت آجائے تو وہ شہید ہوتا ہے۔" آپؐ کا ارشاد ہے۔ کہ "عالم کے قلم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ قابل ستائش ہے۔" آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "مومن نیک علم سے کبھی سیر نہیں ہوتا حتیٰ کہ جنت میں پہنچ جاتا ہے۔" نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ "علم نافع کا ثواب زندگی کے ساتھ منقطع نہیں ہوتا۔"

۳۔ **اقوالِ صحابہؓ:** صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی علم کی فضیلت و اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس ضمن میں ان کے متعدد ارشادات کتب احادیث میں مذکور ہیں۔ حضرت علیؓ جنہیں حضور پاکؐ نے شہرِ علم کا دروازہ کہا، ارشاد فرماتے ہیں کہ "علم دولت سے بہتر ہے کیونکہ علم تمہاری پاسبانی کرتا ہے اور دولت کی تمہیں پاسبانی کرنی پڑتی ہے۔ علم حکمران ہوتا ہے اور دولت پر حکمرانی کی جاتی ہے، دولت خرچ کرنے سے کم ہوتی ہے اور علم بڑھتا ہے"۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ "فقہ کی ایک مجلس ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے"۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رات کی ایک گھڑی علم سیکھنا ساری رات کی عبادت سے بہتر ہے"۔

۴۔ **شرفِ انسانیت:** اسلام نے تعلیم کی اہمیت و فضیلت کو نہ صرف تسلیم ہی کیا ہے۔ بلکہ اسے شرفِ انسانیت کا ذریعہ بھی قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں قصۂ تخلیق آدمؑ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو علم کی نعمت عظمیٰ سے نوازا اور اس کی بنا پر انہیں تمام فرشتوں پر فضیلت و برتری عطا کی۔ پھر اسی علم کی بدولت انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا اور اسے اتنے اختیارات و تصرفات عطا کئے کہ اس نے تمام کائنات کو مطیع و مسخر کر لیا۔

ابتدائے آفرینش سے اب تک ہر دور اور ہر زمانہ میں انسان نے تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا ہے اور اس کے حصول کے لئے کوششیں جاری رکھی ہیں۔ تعلیم ہی وہ زیور ہے جس کی بدولت انسان نہ صرف دوسری مخلوقات سے افضل ہوا بلکہ کائنات کی ہر چیز کو مسخر کر کے اپنی فضیلت و برتری کو ثابت کیا ہے۔ تعلیم ہی سے انسان نے بنجر زمینوں اور لق و دق صحراؤں کو سرسبز و شاداب وادیوں میں تبدیل کر دیا۔ تعلیم ہی کے ذریعہ انسان نے زمین سے بیش قیمت دفینوں کو برآمد کیا اور پہاڑوں اور سمندروں کو کاٹ کر بین الاقوامی تجارت و صنعت کو فروغ بخشا۔ تعلیم ہی سے زندگی کی جدید

آسائشیں و سہولتیں مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، ریل گاڑی، ہوائی جہاز وغیرہ ایجاد کیے۔ اور تعلیم ہی کی بدولت آج چاند تک پہنچنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ تعلیم حاصل کئے بغیر نہ کوئی قوم ترقی کر سکتی ہے اور نہ ہی فرد کسی قسم کی عزت و مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ تعلیم اچھے برے اور اعلیٰ و ادنیٰ میں تمیز سکھاتی ہے اور انسان میں اخلاص و محبت اور مروت و ہمدردی وغیرہ فضائل اخلاق پیدا کرتی ہے ایک فرد کو اپنے حقوق کی نگہبانی کے لئے تعلیم سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے اور دینی حیثیت سے بھی تعلیم کا حصول اس پر لازم ہے کیونکہ تعلیم کے بغیر انسان نہ تو اپنے معبود حقیقی کو پہچان سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کی رضا و خوشنودی کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ تعلیم انسان کو نہ صرف انسان بناتی ہے بلکہ اسے باقی تمام مخلوقات پر فضیلت و برتری عطا کرتی ہے اور صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

اسلامی تعلیم کے مقاصد

اسلام میں حصول تعلیم کے بیشمار مقاصد ہیں جن میں سے بعض اہم حسب ذیل ہیں:-

۱. **خداشناسی:** حصول تعلیم کا اولین مقصد معبود حقیقی کو پہچاننا ہے تاکہ اسے پہچان کر اس کے احکام اور اس کی منشاء و رضا کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔

۲. **حقائق شناسی:** اسلامی نقطۂ نظر سے حصول تعلیم کا ایک مقصد حقائق شناسی ہے کہ انسان کائنات اور اس کی مختلف اشیاء

کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے اور ان کے فوائد سے خود کو اور دوسروں کو لطف اندوز کرے

۳۔ **پاکیزگی نفس و اصلاح احوال:** اسلامی تعلیم کے حصول کا ایک مقصد تزکیہ نفس اور اصلاح معاشرہ ہے تاکہ انسان پر امن ماحول میں متمدن و مہذب زندگی بسر کر سکے اور زندگی کے تمام امور بطریق احسن انجام پا سکیں۔

۴۔ **متوازن زندگی:** علم کا مقصد زندگی کے انفرادی و اجتماعی، سیاسی و تمدنی، معاشی و معاشرتی، روحانی و جسمانی تمام پہلوؤں کی نشو و نما اور تعمیر و ترقی بھی ہے تاکہ انسان ایک متوازی زندگی بسر کر سکے۔

ثمرات و فوائد

حصول تعلیم کے بے شمار ثمرات و فوائد ہیں جن میں سے بعض اہم درج ذیل ہیں۔

۱۔ **خداشناسی:** حصول تعلیم کا سب سے بنیادی فائدہ یہ ہے کہ انسان اس سے اپنے معبود حقیقی کو پہچان لیتا ہے اور اس کی رضا و خوشنودی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ (آل عمران)

اللہ نے اور فرشتوں نے اور اہل علم نے گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ صاحب انصاف حاکم ہے۔

۲۔ **حصول کامرانی:** تعلیم کے ذریعے انسان دینی و دنیاوی زندگی میں فلاح و کامرانی حاصل کرتا ہے۔ وہ زندگی کے فرائض کو حسن و خوبی سے انجام دینے کے طور طریقے سیکھ لیتا ہے اور نہایت کامیاب متمدن و مہذب

زندگی بسر کرتا ہے۔ بلکہ حقائق کی تلاش اور نئی ایجادات سے زندگی کو پر مسرت و خوشگوار بناتا ہے اور یہی زندگی کی اصل کامیابی ہے۔

۲- **اُخروی اجر:** حصول تعلیم سے انسان کو آخرت میں بہت اجر و ثواب اور درجات حاصل ہوں گے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:-

وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلہ)	اور وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے ان کے لئے درجات ہیں۔

استاد اور شاگرد

مفہوم: استاد یا معلم کے لغوی معنی پڑھانے سکھانے اور تعلیم دینے والا ہیں اور شاگرد یا طالب علم کے معنی پڑھنے سیکھنے اور تعلیم حاصل کرنے والا ہیں۔ اصطلاح میں استاد سے مراد وہ شخص ہے جو کسی تعلیمی ادارے میں لوگوں کو تعلیم دیتا ہو اور شاگرد اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم پاتا ہو۔

اہمیت

تحصیل علم میں استاد اور شاگرد کے رشتہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

تعلیم حاصل کرنا چونکہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اس لئے ہر ہر شخص کو یہ فریضہ ادا کرنے کے لئے کسی نہ کسی استاد کے روبرو زانوئے تلمذ طے کرنا لازمی ہے۔ اگرچہ تعلیم بغیر استاد کے بھی گھر پر کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن علم ایک نہایت بلند پایہ چیز ہے اور جو لوگ عالم ہوتے ہیں وہ اس کے صحیح و غلط، نیکو بد اور ہدایت و گمراہی میں تمیز کر سکتے ہیں۔ لہذا استاد سے تعلق قائم کئے بغیر انسان نہ تو صحیح تعلیم ہی حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے فوائد سے متمتع ہو سکتا ہے۔

پھر یہ بات بھی مسلم ہے کہ کتابوں کا علم نہایت محدود ہوتا ہے اس کے برعکس استاد کی صحبت سے طلبہ شعوری اور لاشعوری طور پر بہت کچھ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں سیکھی ہوئی عادات اور اخلاق انسان کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں اس لئے استاد کی عادات و اخلاق اور اس کے علم و فضل کا شاگرد کی زندگی پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے اور طالب علم اپنی زندگی کو بہت

حد تک استاد کے نقش قدم پر ڈھال لیتا ہے ۔ لہذا جس قدر کوئی طالب علم اپنے استاد کے قریب رہنے کی کوشش کرے گا۔ اسی قدر وہ علم کی دولت سے مالا مال ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ حصول تعلیم میں مکتب، کتابیں اور دیگر اشیاء ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور اصل اور بنیادی حیثیت استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات و روابط کو حاصل ہے ۔

استاد کا مقام

استاد چونکہ علم کا سرچشمہ ہوتا ہے اس لئے اسلام نے اس کا مقام نہایت بلند متعین کیا ہے اور اس کی بے حد عزت و تکریم کرنے کی تاکید کی ہے۔ بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استاد کو حقیقی باپ سے بھی زیادہ مرتبہ دیا ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ "دنیا میں تمہارے تین باپ ہیں۔ ایک وہ جو تمہاری پیدائش کا باعث ہوا دوسرا وہ جس نے اپنی لڑکی کی شادی تمہارے ساتھ کر دی اور تیسرا وہ جس سے تم نے علم حاصل کیا اور ان میں سے بہترین باپ تمہارا استاد ہے ۔

صحابہ کرامؓ اور علمائے سلف کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے اور کبھی کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے دیتے جو استاد کی طبیعت پر گراں ہوتی۔ صحابہ کرامؓ نہ صرف اپنے معلم اعظم حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ادب و احترام کرتے تھے بلکہ آپس میں بھی جس سے کچھ سیکھتے اسے استاد کا درجہ دیتے تھے۔ اور اس کا ادب ملحوظ رکھتے تھے۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ "جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا میں اس کا غلام ہوں اسے اختیار ہے چاہے وہ مجھے بیچ دے چاہے آزاد کرے اور چاہے غلام بنائے رکھے ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب میں علم حاصل کرنے کے لئے حضرت زید بن

ثابتؓ کے مکان پر حاضر ہوتا اور وہ باہر تشریف نہ رکھتے ہوتے تو میں ازراہ ادب ان کو آواز نہ دیتا اور نہ ہی انہیں بلواتا بلکہ ان کے دروازے کی دہلیز پر سر رکھ کر بیٹھ جاتا اور ہوا مٹی اور ریت اڑا کر مجھ پر ڈالتی رہتی۔ پھر جب حضرت زیدؓ باہر تشریف لاتے اور مجھے اس حالت میں دیکھتے تو نہایت افسوس سے فرماتے اے ابن عم رسولؐ! مجھے اطلاع کیوں نہ کرا دی؟ اور میں عرض کرتا کہ میرے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ میں آپ کو اطلاع کراتا!

استاد کی عظمت اور اس کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اسے ہمیشہ روحانی باپ سمجھا۔ یہاں تک کہ خلفاء خود بھی اساتذہ کا بہت زیادہ ادب و احترام کیا کرتے تھے۔ مشہور عباسی خلیفہ واثق باللہ کا واقعہ ہے کہ ایک روز ہارون بن زیادؒ ان سے ملنے آئے۔ خلیفہ نے انہیں نہایت ادب و احترام سے بٹھایا اور نہایت سعادت مندانہ طور پر گفتگو کی کہ اہل دربار حیران رہ گئے۔ چنانچہ جب وہ رخصت ہوئے تو کسی نے پوچھا کہ یا امیر المومنین! یہ کون تھے؟ واثق نے جواب دیا کہ یہ میرے استاد تھے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کی مثال اس بارے میں قابل تقلید ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرے استاد حمادؒ جب تک زندہ رہے میں نے ان کے مکان کی طرف کبھی پاؤں بھی نہیں پھیلائے۔

استاد کے حقوق

استاد کے حقوق سے مراد وہ مراعات ہیں جو کسی استاد کو اپنے طلبہ اور معاشرے کی جانب سے حاصل ہوں۔ اسلامی معاشرے کے لئے لازمی ہے کہ استاد کے حقوق کی نگہداشت کرے تاکہ وہ امن و سکون سے اپنے فرائض کو انجام دے اور معاشرے کے لئے مفید

افزائش پیدا کرے۔ استاد کے بہت سے حقوق ہیں جن میں سے بعض اہم یہ ہیں۔

۱۔ **معاشرتی وقار:** استاد کا اولین حق یہ ہے کہ معاشرے میں اسے عزت و وقار حاصل ہو۔ اور ہر جگہ اس کی عزت و تکریم کی جائے اسے معاشرے کا ایک اہم فرد تصور کیا جائے اور تمام قومی و ملکی معاملات میں اس سے مشورہ حاصل کیا جائے اور زندگی کے کسی شعبہ میں اسے نظر انداز نہ کیا جائے اس طرح اسے اپنے مرتبہ و مقام کا احساس ہوگا اور وہ نہایت محنت و جانفشانی سے تعمیر معاشرہ میں مصروف رہے گا۔ مزید فائدہ یہ ہوگا کہ لائق و ذہین افراد معلمی کی طرف مائل ہوں گے اور قوم کو نہایت قابل و لائق اساتذہ کی خدمات حاصل ہوں گی۔ نتیجتاً معاشرے کا تعلیمی معیار بلند ہوگا اور قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہوگی

۲۔ **روزگار سے بے فکری:** استاد کا دوسرا حق یہ ہے کہ وہ روزگار کی جد وجہد اور معاش کے فکر سے آزاد ہو اس کی تنخواہ یا وظیفہ اتنا ہو کہ اس کی تمام ضروریات کو کفیل ہو اور وہ بآسانی گذر اوقات کر سکے تاکہ وہ مکمل ذہنی امن و سکون سے اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لاکر اپنے تدریسی فرائض کو سر انجام دے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر استاد کا ذہن فکر معاش میں مصروف رہے گا تو وہ کبھی بھی تخلیقی، تحقیقی یا تدریسی ذمہ داریوں سے باحسن طریق عہدہ برآ نہیں ہو سکے گا۔ پھر استاد اپنی معاشی پستی و بدحالی کی بنا پر نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس سے اس کی ذہنی و دماغی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ استاد کی آمدن اس قدر معقول ہو کہ وہ باعزت زندگی بسر کر سکے۔

۳۔ **ادب و احترام:** استاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ طلبا اس کی ہر طرح عزت و تعظیم کریں۔ اور ہر موقع و محل پر اس کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھیں۔ استاد کو اپنا روحانی باپ سمجھیں اور حقیقی باپ کی طرح اطاعت و

فرمانبرداری کریں اور کسی معاملے میں نافرمانی، بداخلاقی اور گستاخی کے مرتکب نہ ہوں اس طرح استاد بھی نہایت محبت و شفقت اور محنت و جانفشانی سے تعلیم دے گا۔

استاد کے فرائض

استاد کے فرائض سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو اس پر اپنے طلبہ اور معاشرے کے لیے لازم آتی ہیں۔ معلم کے لیے فرائض کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ تاہم ضروری فرائض حسب ذیل ہیں:-

۱۔ **اخلاق حمیدہ**: استاد کا اولین فرض یہ ہے کہ اپنے آپ کو اخلاق حمیدہ کا حامل بنائے اور اپنے نفس کو ہر قسم کے رذائل اخلاق سے بچائے رکھے۔ امانت و دیانت، صداقت و راستبازی، محبت و شفقت، وقار و متانت، فیاضی و فراخدلی، صبر و قناعت اور حق گوئی و بیباکی وغیرہ تمام صفات حسنہ اس میں ہونی چاہئیں اور بغض و حسد، بجز و غرور، غیبت و چغلخوری، حرص و ہوس، بخل و خودپسندی، نمائش و ریاکاری اور لغو و بیہودہ گوئی جیسی عادات قبیحہ سے اسے اپنا دامن پاک رکھنا چاہیے۔ استاد کو ہمیشہ خودی و خودداری کی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اور انتہائی تنگ حالی میں بھی اپنے آپ کو ذلیل و رسوا نہیں ہونے دینا چاہیے۔ طلبہ سے ہمیشہ نرمی و رحمدلی اور شفقت و ہمدردی سے پیش آنا چاہیے۔ ان کی مشکلات کو حل کرنے پر تیار رہنا چاہیئے اور ان کی غلطیوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہر ایک سے خوش خلقی سے پیش آنا چاہیئے۔ نہایت سلیقہ سے گفتگو کرنی چاہیے۔ اور بیہودہ گوئی اور بدزبانی سے اجتناب کرنا چاہیے مختصر یہ کہ استاد کو شستہ اطوار محمودہ اخلاق اور نفیس مذاق کا حامل ہونا چاہیئے۔

۲۔ **احساسِ ذمہ داری:** معلم کا دوسرا فرض یہ ہے کہ اسے اپنی ذمہ داریوں کا پوری طرح سے احساس ہو۔ اسے اس بات کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ قوم کے نونہالوں کی تعلیم کا مقدس فریضہ اسے سونپا گیا ہے اور قوم کی آئندہ ترقی و عروج کا انحصار اسی کی کوششوں و کاوشوں پر ہے۔ اس بارے میں اس کی معمولی کوتاہی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے اور قوم کو ہمیشہ کے لئے پستی و پسماندگی میں ڈال سکتی ہے۔ درحقیقت ذمہ داری کا احساس ہی استاد کو محنت و عرق ریزی پر آمادہ کرتا ہے اور وہ پوری تگ و دو کے ساتھ اپنے آپ کو قوم کی تعمیر میں مصروف کر دیتا ہے۔ لہٰذا استاد کو اپنی تمام ذمہ داریوں کا پاس ہونا چاہیے وقت کا پابند ہو، محنت و جانفشانی سے صحیح معلومات بہم پہنچائے، طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خیال رکھے اور نہایت خلوص سے اپنے فرائض کو سرانجام دے۔

۳۔ **مطالعہ:** معلم کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہے جو مضمون بھی وہ پڑھائے اس پر اسے مکمل عبور حاصل ہونا چاہیے کیونکہ اگر وہ خود کسی چیز کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے گا تو وہ طلبا کو کیسے سمجھائے گا۔ کم علم اور آسائش پسند اساتذہ نہ تو کبھی طلبہ میں مقبول ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان سے اپنا احترام کرا سکتے ہیں۔ لہٰذا استاد کے لئے ضروری کہ مطالعہ و تحقیق میں مصروف رہ کر اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے۔ حضرت سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں کہ عالم اسی وقت تک عالم رہ سکتا ہے جب تک وہ طالب علم ہے۔ جب وہ پڑھنا چھوڑ دے اور سمجھے کہ علم سے بے نیاز ہو گیا ہے اور جو کچھ اس نے حاصل کر لیا ہے وہ اس کے لئے کافی ہے تو ایسا سمجھنے والا سب سے بڑا جاہل ہے۔

۴۔ **طلبہ سے شفقت و ہمدردی:** معلم کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں سے غیر معمولی شفقت و

ہمدردی سے پیش آئے اور ان سے مساویانہ سلوک روا رکھے - استاد کو ایک روحانی باپ کی حیثیت سے شاگردوں کے ساتھ نہایت مشفقانہ برتاؤ کرنا چاہیے۔ ان کے مسائل میں دلچسپی لینی چاہیے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اگر کوئی شاگرد غریب و نادار ہو تو اس کی مالی امداد کا انتظام کیا جائے اور اگر کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کی جائے۔

اس ضمن میں یہ بات مدنظر رہنی چاہئے کہ سب طلبا سے مساویانہ سلوک کیا جائے امیر و غریب، اعلیٰ و ادنیٰ اسب قسم کے طلبا سے ایک جیسا برتاؤ کیا جائے۔ اسی طرح طلبا ذہین بھی ہوتے ہیں .. اور کند ذہن بھی - استاد کو چاہیے کہ دونوں طرح کے طلبا کی طرف برابر توجہ دے اور کند ذہن و غبی کو نفرت و حقارت سے نہ دیکھے بلکہ ہمدردی و شفقت سے پیش آئے۔

۵۔ **طلبہ کے کردار کی تشکیل:** معلم کا فقط یہی فرض نہیں کہ وہ طلبا کو علم سے نوازے بلکہ صحیح استاد وہ ہے جو تعلیم کے ساتھ اپنے طلبہ کو اخلاقی تربیت بھی دیتا ہے اور ان کی سیرت و کردار کی تشکیل بھی کرتا ہے استاد کو چاہیے کہ طلبا کے اخلاق پر نظر رکھے اور تعلیم کے دوران گاہے بگاہے ان کی اخلاقی کمزوریاں اشارتاً ان پر واضح کرتا رہے اور عمدہ اخلاق اور نیک اعمال کی طرف ان کو ترغیب دلاتا رہے۔ اس طرح تعلیم کا اصل مدعا حاصل ہوتا ہے اور طلبہ عالم باعمل بن کر فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔

۶ **پابند شریعت:** معلم کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ پابند شریعت ہو۔ دل میں خوف خدا رکھتا ہو اور دین و شریعت کے تمام احکام پوری طرح بجا لاتا ہو۔ اس کے تمام اعمال و اقوال اور حرکات و سکنات سے تقویٰ و پرہیزگاری عیاں ہوتی ہو اور وہ فرائض پنجگانہ پوری طرح ادا کرتا ہو

خود نیکی کرتا ہو اور دوسروں کو بھی برائی سے بچنے اور نیکی کرنے کی ترغیب دیتا ہو

۷۔ قول و عمل میں مطابقت: معلم کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنے قول و عمل میں مطابقت پیدا کرے۔ جو بات زبان سے کہے اور جس بات کی دوسروں کو تعلیم دے خود بھی اس پر عمل پیرا ہو۔ کیونکہ اگر وہ خود عمل نہیں کرے گا تو اس کا قول بے اثر ہو گا۔ اور بات بے نتیجہ ثابت ہو گی قرآن پاک میں بھی قول و عمل میں مطابقت کی تلقین کی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ — جس چیز پر تم خود عمل نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو!

جن لوگوں کے قول و عمل میں مطابقت نہیں انہیں آخرت میں سخت عذاب دیا جائے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے لئے تشریف لے گئے تو آپؐ کا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ آپؐ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو اچھی بات کی تلقین کرتے تھے مگر خود ان پر عمل نہیں کرتے تھے۔ استاد چونکہ دوسرے کے لئے نمونہ اور مثال ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ جس بات کی دوسروں کو تلقین کرے پہلے خود اپنے آپ کو اس کا عامل بنا لے۔

۸۔ اشاعت علم: استاد کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ علم کی اشاعت کرے۔ تعلیم کا فریضہ محض علم حاصل کر کے اپنے تک محدود رکھنے سے ادا نہیں ہوتا بلکہ طلب کے بعد علم کی اشاعت بھی اسی طرح فرض ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ضروری علم اور قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ اللہ تو اس شخص کو خوش رکھے جس نے میری باتیں سنیں انہیں یاد رکھا اور انہیں نشر کیا۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ کسی سے علم کے بارے میں کوئی بات پوچھی جائے اور وہ جانتے بوجھتے نہ بتائے تو قیامت کے روز اسے

آگ کی لگام دی جائے گی۔

شاگرد کے حقوق

شاگرد کے حقوق سے مراد وہ مراعات ہیں جو ایک طالب علم کو معاشرہ اور استاد کی جانب سے حاصل ہوں۔ شاگرد کے حقوق کو ذیل کے عنوانات کے تحت جمع کیا جاسکتا ہے:۔

۱۔ **تحصیل علم کی سہولتیں:** شاگرد کا اولین حق یہ ہے کہ تحصیل علم کے لئے اسے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ درس گاہ کے لئے ایک روشن ہوا دار عمارت ہونی چاہیے۔ ہر مضمون کے ماہر، لائق و قابل اساتذہ کا خاطر خواہ انتظام ہو۔ درس گاہ سے ملحق ایک وسیع کتب خانہ بھی ہونا چاہیئے جس میں ہر موضوع پر عمدہ عمدہ کتابیں ہوں۔ پھر دور دراز سے آنے والے طلبہ کے لئے اقامت گاہ ہونی چاہیے جس میں رہائش کے علاوہ خوراک کا بھی انتظام ہو۔ غریب و نادار طلباء کو وظائف اور مالی رعائتیں دی جائیں اور لائق و محنتی طلبا کی انعامات و اکرامات سے حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ غرضیکہ تعلیم حاصل کرنے والوں کو ہر ممکن سہولتیں ہونی چاہیئں۔

۲۔ **صحت و تندرستی:** شاگرد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کی جسمانی صحت و تندرستی کا خیال رکھا جائے اس مقصد کے لئے مکتب سے ملحق کھیل کا میدان ہونا چاہیے جہاں ہر طرح کی کھیلوں اور ورزشوں کے لئے سہولتیں میسر ہوں تاکہ طلباء اپنی صحت کو برقرار رکھ سکیں۔ پھر مکتب کے ساتھ شفا خانے کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اکہ گاہے بگاہے طلبہ کی صحت کا معائنہ کیا جاسکے اور بوقت ضرورت علیل و بیمار طلبہ کا علاج معالجہ کیا جاسکے۔

۳۔ **اخلاقی تربیت:** شاگرد کا فقط یہی حق نہیں کہ علم سکھا دیا جائے بلکہ اس کی اخلاقی تربیت بھی اس کے حقوق میں شامل ہے علم تو

گھر پر بھی کتابوں سے اخذ کیا جا سکتا ہے لیکن استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کا مقصد علم کے ساتھ اخلاقی تربیت کا حصول بھی ہے استاد کو چاہیے کہ اپنے قول و فعل سے شاگرد کو اخلاق حمیدہ سکھائے اور اس کی سیرت و کردار کی اعلیٰ پیمانے پر تشکیل کرے

شاگرد کے فرائض

شاگرد کے فرائض سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو کسی شاگرد پر استاد و معاشرے کے لئے لازم آتی ہیں۔ شاگرد کے فرائض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ **علم کی لگن:** شاگرد کا اولین فرض یہ ہے کہ اپنے اندر علم کی لگن و پیاس پیدا کرے۔ کیونکہ اس کے بغیر علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ تحصیل علم کے دوران طالب علم کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے اگر اس میں علم حاصل کرنے کا سچا جذبہ اور جوش و ولولہ نہ ہوگا تو وہ ہمت ہار بیٹھے گا۔ حصول علم کے لئے بعض اوقات طویل سفر اور فقر و فاقہ تک کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر علم سے دلچسپی اور ذوق و شوق کا نہ ہونا تحصیل علم میں زبردست رکاوٹ بنتا ہے۔

علمائے سلف کو تحصیل علم کی اس قدر لگن تھی کہ انہوں نے اس راستے میں دور دراز ممالک کا سفر۔ اور کئی کئی روز کا فاقہ برداشت کرنا ضروری قرار دے دیا چنانچہ امام مالک کہتے ہیں کہ "کوئی شخص علم و دانش کے مرتبے پر اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس پر فقر و فاقہ کی مار نہ پڑے اور وہ اسے ہر چیز پر ترجیح نہ دے" امام شعبیؒ سے پوچھا گیا کہ انہیں علم کیونکر حاصل ہوا؟ تو فرمایا "اپنے اوپر اعتماد نہ کرنے، علم کے لئے سفر کرنے۔ گدھے کی طرح صبر اور کوے کی طرح صبح سویرے اٹھنے سے"

علم کی لگن اس درجہ ہونی چاہیے کہ علم کی بات بلا تمیز جس سے بھی ملے حاصل کرلے اپنے سے کم تر یا کم عمر سے علم حاصل کرنے میں عار محسوس نہ کرے۔ امام ابوحنیفہؒ

اگرچہ اپنے استاد امام مالکؒ سے تیرہ سال بڑے تھے لیکن ان کے سامنے اس طرح رہتے جس طرح کوئی بچہ اپنے باپ کے سامنے ہو۔

۲۔ **استاد کا ادب واحترام**: شاگرد کا ایک اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے استاد کا حد درجہ ادب واحترام کرے اور اس کی پوری پوری اطاعت و فرمانبرداری بجا لائے۔ نافرمانی، گستاخی، بے رخی یا کجروی اور ایسی بات نہ کرے جس سے استاد کو تکلیف یا کوفت پہنچتی ہو۔ اگر کسی وقت استاد سخت الفاظ کہدے تو محسوس نہ کرے کیونکہ استاد کا ہر ارشاد شاگرد کی بھلائی کے لئے ہوتا ہے استاد کی عزت و تکریم بالکل اسی طرح کرنی چاہیے جس طرح حقیقی باپ کی بات کی جاتی ہے۔ حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ اپنے استاد حضرت زید بن ثابتؓ کی رکاب پکڑ کر چلتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ "ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے علماء کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں۔"

۳۔ **علم کا احترام**: شاگرد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ استاد کے علاوہ علم کا بھی احترام کرے۔ کیونکہ علم کی تعظیم کئے بغیر علم حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاگرد سے کوئی فعل بھی ایسا سرزد نہ ہونا چاہیے جس سے علم کے احترام کو صدمہ پہنچتا ہو۔ کتابوں کو نہایت سلیقے و قرینے اور ادب واحترام سے رکھنا چاہیے اور علم حاصل کرنے کے لئے علم کے مقام تک خود پہنچنا چاہیے چنانچہ امام زہریؒ کہتے ہیں "علم کے لئے یہ بھی کسر شان ہے کہ اسے اس کے حاصل کرنے والے کے گھر پہنچایا جائے۔"

۴: **احساس فرائض**: شاگرد کو اپنے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہونا چاہیے۔ وقت کی پابندی کرے سبق یاد کرے اور جو کام اسے دیا جائے اسے کما حقہٗ کرے اپنے فرائض کی ادائیگی میں غفلت وسستی کا اظہار نہ کرے اور سبق پڑھنے سے جی نہ چرائے۔

۵۔ **صحت کی حفاظت**: شاگرد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی صحت و

تندرستی کا بھی خیال رکھے کیونکہ تندرست جسم تندرست دماغ کا پیش خیمہ ہے جسم و دماغ کے بھی انسان پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اس لئے ہر وقت انہیں تحصیل علم کی مشقت میں مبتلا نہیں رکھنا چاہیے۔ بلکہ کچھ وقت انہیں آرام بھی مہیا کرنا چاہیے۔ اگر طالب علم ہر وقت کتابی کیڑا بنا رہے گا۔ تو اس کی صحت برباد ہو جائے گی جس کا خمیازہ اسے آخری عمر ادا کرنا ہوگا۔ لہذا طالب علم کو چاہیے کہ وہ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ اپنی جسمانی صحت کا بھی خیال رکھے اور کھیل کود سے اسکی چستی قائم رکھے۔

۶۔ **عمدہ سیرت و کردار**: شاگرد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو عمدہ سیرت و کردار کا حامل بنائے۔ شریعت کا پابند ہو۔ استاد کے نقش قدم پر چلے۔ اپنے ہم جماعتوں سے پیار و محبت اور خلوص و یگانگت سے رہے اور ہمیشہ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرے کبھی کسی پر زیادتی نہ کرے اور نہ ہی لغو و بیہودہ گفتگو اور اخلاق رذیلہ کا مرتکب ہو۔ بلکہ ہمیشہ فضائل اخلاق اور بلندی کردار کا ثبوت دے تاکہ اپنے اساتذہ اور مکتب کے لئے عزت و وقار ۔

مکتب

مفہوم: مکتب کے لغوی معنی لکھنے کی جگہ ہیں۔ لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ جگہ یا عمارت ہے جہاں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ درس و تدریس کا انتظام ہے اور علوم و فنون کی تحصیل کی جاتی ہے۔ مکتب کا لفظ نہایت وسعت کا حامل ہے اور اس میں سکول و کالج اور یونیورسٹی تمام مدارج کی درس گاہیں شامل ہیں۔

اہمیت

اسلام میں مکتب کو بہت اہمیت اور تقدس حاصل ہے۔ جس کے اہم پہلو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ **قومی تعمیر و ترقی:** علم کی فضیلت و افادیت کے ساتھ مکتب کی اہمیت بھی مسلّم ہے۔ قوموں کی تعمیر و ترقی میں مکتب کو نہایت اہم مقام حاصل رہا ہے اور قومیں ہمیشہ اپنے ممتاز مکاتب و مدارس اور ان کے علمی کارناموں پر فخر و ناز کرتی ہیں۔

مکتب قوم کی تمدنی و معاشرتی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں اور مذہب و قانون اور سیاست و معاشرت کے مختلف شعبوں کے لئے مفید کارکن تیار کرتے ہیں۔ مکتب افراد کے قلب و ذہن جلا بخشتے ہیں اور ان کے لئے زندگی کی نئی راہیں استوار کرتے ہیں۔ علوم و فنون اور عقل و دانش کی تعلیم تو انسان گھر پر بھی حاصل کر سکتا ہے لیکن انسانی کردار کی صحیح تربیت استاد و مکتب کے بغیر ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد

سکے ذہنوں کو یہیں جلا ملتی ہے قومی شعور یہیں بیدار ہوتا ہے اور سب قومی و ملی تحریکیں یہیں جنم لیتی ہیں۔

پھر ہر مکتب کے ساتھ اس کے فارغ التحصیل طلبہ کو زندگی بھر عقیدت رہتی ہے۔ اور ان کے خیالات و احساسات پر مکتب ہمیشہ اثر انداز ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک اچھے مکتب سے فارغ التحصیل افراد اپنی قوم کو نئی زندگی عطا کرتے ہیں اور اس کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مکتب ہی کسی قوم کی ترقی و عروج کا واحد مرکز ہے اور ایک پسماندہ قوم کو اس کے عمدہ مکاتب صرف چند سالوں میں بام عروج پر پہنچا دیتے ہیں۔

۷۔ **مکتب صدر اسلام:** مکتب کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ تاریخ اسلام کے تمام ادوار میں مکتب کو نہایت اہم مقام حاصل رہا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ اسلام کا آغاز کیا تو لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ آپؐ نے ایک صحابی ارقمؓ کے گھر کو اس مقصد کے لیے منتخب فرمایا۔ جہاں لوگ آکر اسلام قبول کرتے اور اسلامی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرتے تھے۔ اس طرح "دار ارقم" کو اسلام کا پہلا مکتب ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ہجرت کے بعد تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی اور مسجد نبویؐ میں پہلا باضابطہ مکتب قائم ہوا۔ اس مسجد سے ملحق ایک چبوترہ جسے صفہ کہتے تھے درسگاہ کا کام دیتا تھا۔ اس درس گاہ میں تعلیم کے دو طریقے رائج تھے ایک غیر مستقل اور دوسرے مستقل۔ غیر مستقل طریقہ یہ تھا کہ مدینہ سے باہر کے لوگ آکر چند روز مدینہ میں ٹھہرتے۔ اور ضروری احکام و مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے اور اپنے اپنے قبیلوں میں اس تعلیم کو پھیلاتے۔ مستقل طور پر تعلیم حاصل کرنے والے اصحاب صفہ

(چبوترے والے) کہلاتے تھے۔ ان لوگوں نے مستقلاً اپنی زندگیاں حصول علم اور تبلیغ دین کے لئے وقف کردی تھیں اور مسجد نبوی میں ہی رہائش رکھتے تھے۔ یہ لوگ نہایت فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ پہننے کو فقط ایک کپڑا ہوتا اور کھانے کو جو میسر آتا اسی پر گذر کر لیتے۔ لیکن ہر وقت ہمہ تن درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود اسی مکتب کے معلم اور نگران تھے۔ لیکن آپؐ کے علاوہ بڑے بڑے صحابہؓ بھی یہاں تعلیم دیتے رہے۔ اس مکتب سے تعلیم یافتہ لوگوں کو قراء (قاری کی جمع) کہا جاتا تھا اور انہیں تبلیغ و تعلیم کے لئے مختلف مقامات پر بھی بھیجا جاتا تھا۔ عہد رسالت میں مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ کی دیگر مساجد میں بھی مکتب قائم ہو چکے تھے۔

خلافت راشدہ کے دور میں بھی مساجد ہی بطور مکتب استعمال ہوتی رہیں حضرت عمرؓ کے عہد میں تعلیم عام ہو گئی تھی اور پڑھانے لکھانے اور فنون سکھانے کے لئے الگ الگ استاد مقرر تھے۔ خلافت بنو امیہ میں مکاتب کی تعداد میں اضافہ ہوا اور علمائے اسلام جو دور دراز علاقوں میں پھیل چکے تھے نے اپنے گھروں میں مکتب قائم کر لئے۔ عہد بنی عباس میں باقاعدہ طور پر الگ مکتب قائم ہونے

اکثر خلفائے بنی عباس نے بڑی فیاضی سے ان مکاتب کی سرپرستی کی۔ جامعہ نظامیہ، جامعہ مستنصریہ، جامعہ قرطبہ اور جامعہ ازہر اسی دور کے مشہور مدارس ہیں۔ یہاں بڑے بڑے جلیل القدر علماء معلم تھے اور قرآن و حدیث اور فقہ کے علاوہ ادب، سائنس، فلسفہ طب تاریخ اور جغرافیہ سبھی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان مکاتب میں درس و تدریس کے علاوہ تحقیق و تدوین اور تصنیف و تالیف کا وہ کارنامہ سرانجام دیا گیا جس کی مثال دنیا کی علمی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مختصر یہ کہ صدر اسلام میں مکتب کو نہایت ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔

فرائض و مقاصد

قرآن و سنت اور دیگر تعلیمات اسلامی کی روشنی میں مکتب کے فرائض و مقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ **تعلیم و تعلم**: مکتب کا اولین اور بنیادی مقصد تعلیم و تعلم ہے۔ کسی ملک سے جہالت کو دور کرنے اور علم کو پھیلانے کا فریضہ جس حسن و خوبی سے مکتب ادا کر سکتے ہیں وہ کسی اور طریق سے ممکن نہیں۔

علم بے شک گھر بیٹھ کر بھی کتابوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن مکتب میں علم حاصل کرنے سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ گھر پر حاصل نہیں ہو سکتے۔ بچہ طبعاً جماعت پسند ہوتا ہے اور تنہا پڑھتا پڑھتا اکتا جاتا ہے لیکن ہم عمر بچوں کی صحبت میں ذوق و شوق بڑھتا ہے اس کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے اور نہ صرف علم حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے بلکہ اس کی شخصیت میں بھی ابھار پیدا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مکتب کی تعلیم بہت دور رس نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ خود پڑھ کر کوئی چیز اتنی یاد نہیں رہتی جتنی کہ دوسروں سے سن کر۔ مکتب میں طالب علم نہ صرف مختلف اساتذہ کے خیالات سے مستفید ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ بھی سبق دہرانے کا موقع حاصل کرتا ہے اس طرح اس کی علم سے رغبت بڑھتی ہے اور وہ گھر کی نسبت زیادہ آسانی سے علم حاصل کرتا ہے۔

۲۔ **نظم و ضبط**: مکتب کے قواعد و ضوابط کی پابندی سے دوران تعلیم ہی بچے کو نظم و ضبط کی تربیت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً پابندی

وقت، وقت پر پڑھنا اور کھیلنا، کام باقاعدگی سے کرنا، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنا، قوانین کا احترام وغیرہ قواعد وضوابط اس کی زندگی کو بااصول اور منظم بنا دیتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں سیکھے ہوئے اصول ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی میں پختہ ہو جاتے ہیں اور وہ بااصول زندگی کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ **آداب واخلاق:** مکتب میں ایک طالب علم کو اخلاقی تربیت بھی حاصل ہوتی ہے اور شائستہ آداب اور نیک اطوار سیکھتا ہے۔ مثلاً نشست و برخاست میں سلیقہ، بڑوں کی تعظیم و توقیر، گفتگو میں خوش اخلاقی لباس اور کتابوں میں صفائی وغیرہ آداب واخلاق کی سب باتیں بچہ مکتب ہی میں اخذ کرتا ہے۔ کیونکہ ایک اچھا استاد اپنے شاگردوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ان کو عمدہ آداب واخلاق سے بھی مزین کرتا رہتا ہے۔ اس طرح مکتب تعلیم حاصل کرنے والے افراد سلیقہ، آداب اور شائستگی سے زندگی بسر کرنے کے عادی بن جاتے ہیں

۴۔ **اخوت ومساوات:** مکتب ایک نئی برادری کی بنیاد رکھتا ہے اور طلبہ میں باہمی الفت ومحبت، اخوت وموانست اور ویگانگت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ مکتب میں امیر وغریب، کالے اور گورے سب ایک سطح پر استاد سے مساوی طور پر مستفید ہوتے ہیں۔ اور ان کے درمیان کوئی فرق وامتیاز برقرار نہیں رکھا جاتا اس طرح آپس میں ایک دوسرے کے لئے تعاون وہمدردی، بردباری ورواداری اور ایثار وقربانی کے جذبات بھی ابھرتے ہیں۔ مکتب کی برادری میں خلوص محبت کے یہ جذبات اس قدر قوی اثر پیدا کرتے ہیں

کہ عمر بھر یہ تعلق برقرار رہتا ہے۔ اور یہی جذبات اکثر مکاتب ومدارس میں طلبہ قدیم کی انجمنوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس طرح مکتب سے تعلیم یافتہ افراد اخوت ومساوات کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

۵۔ **تحقیق و تدوین:** مکتب کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ اس میں تحقیق و تدوین کا انتظام ہو۔ مختلف علوم و مسائل پر تحقیق کرائی جائے اور کتابیں تصنیف کی جائیں تاکہ عوام ان سے مستفید ہوں اس طرح طلبا کے ذہنی شعور میں پختگی بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ زندگی کے مسائل کو خاص محققانہ انداز میں سوچتے اور حل کرتے ہیں۔

۶۔ **جسمانی صحت و تندرستی:** مکتب کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ طلبا کی جسمانی صحت و تندرستی کی نشوونما کا انتظام کیا جائے۔ کیونکہ تندرست جسم تندرست دماغ کا ضامن ہے۔ ہر مکتب سے ملحق کھیل کا میدان ہونا چاہیے۔ جہاں انہیں مختلف قسم کی جسمانی ورزشیں اور ریاضتیں سکھائی جائیں۔ ورزش اور کھیل نہ صرف طلبہ کی جسمانی صحت کو برقرار رکھتے ہیں بلکہ چستی و چالاکی اور تنومندی پیدا کر کے دوسروں کا قائد بننے کی صلاحیتیں اجاگر کرتے ہیں اس طرح طلبا اپنے فالتو وقت میں نہ صرف تفریح حاصل کر لیتے ہیں بلکہ اسے مفید راستے میں بھی صرف کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد کی تعلیم میں دلچسپی تو حوصلہ افزا نہیں ہوتی لیکن کھیل کے میدان میں وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اس طرح قوم کو مختلف شعبوں میں کارآمد افراد مہیا ہوتے ہیں۔

۷۔ **گھریلو زندگی کی تربیت:** اکثر مکاتب کے ساتھ اقامت گاہیں ہوتی ہیں جہاں طلبا گھر سے علیحدہ ایک خاص ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اقامت گاہ میں رہنے والے طلبا کو خوراک و لباس کا انتظام کرنے اور ضروریات زندگی کا اہتمام کرنے کی مختصر پیمانے پر تربیت ملتی ہے۔ ہر اقامت گاہ میں ایک استاد ناظم کی حیثیت سے رہتا ہے جو والدین کا متبادل تصور کیا جاتا ہے۔ وہ طلبا کے اخلاق و عادات، صحت و صفائی اور ان

کے رہن سہن کی نگہداشت کرتا ہے اور مناسب ہدایات دیتا رہتا ہے اس طرح یہ طلبہ ایک با اصول گھریلو زندگی بسر کرنا سیکھ جاتے ہیں ۔

لوازمات مکتب

اگرچہ مکتب کے بنیادی اجزا اساتذہ اور طلبا ہیں۔ جہاں استاد بیٹھ جائے اور شاگرد اس کے گرد حصول علم کے لئے جمع ہو جائیں مکتب وجود میں آجاتا ہے تاہم مکتب کے بعض لوازمات بھی ہیں
حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ **مسجد**: مکتب اگر مسجد سے الگ قائم کیا گیا ہے تو نہایت ضروری ہے کہ اس سے ملحق مسجد بھی ہو تاکہ طلبہ پابندی وقت کے ساتھ خدا تعالی کی عبادت کر سکیں ۔

۲۔ **کتب خانہ**: ہر مکتب میں کتب خانے کا وجود بھی اشد ضروری ہے تاکہ اساتذہ اور طلبہ دونوں اس سے استفادہ کر سکیں۔ اسلامی دور حکومت میں مکاتب کے ساتھ ایسے ایسے عظیم کتب خانے قائم تھے جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی

۳۔ **تجربہ گاہ**: ہر مکتب بالخصوص فنی مدارس میں تجربہ گاہ کا ہونا بھی ضروری ہے جہاں طلبہ پر علوم و فنون کے مسلمات کو تجربات سے واضح کیا جا سکے نیز مزید تحقیق کا موقع بھی مل سکے ۔

۴۔ **اقامت گاہ**: مکتب سے ملحق ایک اقامت گاہ بھی ہونی چاہیے جہاں شہر سے باہر رہنے والے طلبا مقیم ہو سکیں۔ اقامت گاہ میں خوراک و رہائش کا عمدہ انتظام ہونا چاہیے ۔

۵۔ **شفاخانہ:** یہ بھی مناسب ہے کہ مکتب کے ساتھ ایک چھوٹا سا شفاخانہ ہو جہاں مکتب سے متعلق افراد اپنا علاج معالجہ کرا سکیں اور انہیں دور جانے میں وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔

۶۔ **کھیل کا میدان:** مکتب کے ساتھ کھیل کا میدان بھی ہونا چاہیے جہاں طلبہ کی جسمانی صحت اور نشوونما کے لیے ضروری کھیلوں اور ورزشوں کا انتظام ہو۔

مسجد

مفہوم : مسجد کے لغوی معنی سجدہ کرنے کی جگہ کے ہیں ۔ لہٰذا ہر اس جگہ کو جہاں بارگاہ ایزدی میں سجدہ کیا جاتا ہو مسجد کہہ سکتے ہیں ۔ جیسا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارے لئے ساری زمین مسجد بنادی گئی ہے یعنی ہر پاکیزہ جگہ مسلمان کی سجدہ گاہ ہو سکتی ہے ۔ لیکن اصطلاح شریعت میں مسجد اس جگہ یا عمارت کو کہتے ہیں جو خدا تعالیٰ کی عبادت اور نماز باجماعت کے لئے مستقل طور پر وقف کر دی گئی ہو ۔

اہمیت و عظمت

اسلام میں مسجد کو بہت اہمیت و عظمت حاصل ہے جس کے دلائل حسب ذیل ہیں

۱۔ **قرآن پاک کا ارشاد:** قرآن پاک میں متعدد مقامات پر مسجد کی اہمیت و عظمت کا بیان ہوا ہے اور اس کے تقدس کو واضح کیا گیا ہے ۔ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے :-

اِنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝ (البقرۃ : ؟) — بے شک مسجدیں اللہ ہی کیلئے ہیں ۔ پس اس کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا :-

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ (البقرۃ ۱۱۴) — اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکے

ایک اور جگہ مسجد کی اہمیت کو یوں واضح کیا گیا ہے ۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج: ۴۰)

اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دور نہ کرتا تو بہت سے تکیے، مدرسے، عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے ڈھا دیئے جاتے۔

۲۔ **ارشادات نبوی:** مسجد کی اہمیت اس بات سے ہی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہجرت کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مسجد ہی کی بنیاد رکھی۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جس مقام پر نماز ادا کی مسلمانوں نے وہیں مساجد تعمیر کر دیں۔ تاہم حضورؐ نے اپنے ارشادات میں بھی مسجد کی اہمیت وعظمت کو واضح کیا ہے آپؐ نے فرمایا بے شک مسجدیں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے بنائی گئی ہیں
ایک دوسری حدیث میں فرمایا بدترین مجلس گاہیں بازار اور راستے ہیں اور بہترین مجلس گاہیں مسجدیں ہیں آپؐ نے مسجد میں نماز ادا نہ کرنے والوں پر تہدید کرتے ہوئے فرمایا۔ بلاشبہ جی چاہتا ہے کہ جوانوں کو حکم دوں کہ وہ میرے پاس لکڑیوں کا ڈھیر لگا دیں پھر میں ان میں جاؤں اور جو اپنے گھر میں بلا عذر نماز پڑھتے ہیں انہیں گھروں سمیت پھونک دوں۔

۳۔ **مسجد صدر اسلام میں:** عہد رسالتؐ اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ مسجد ایک طرف خدا تعالیٰ کی عبادت کا کام دیتی تھی تو دوسری طرف یہ مسلمانوں کا زبردست تربیتی مرکز تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہیں مسلمانوں کو تعلیم وتربیت سے نوازتے تھے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں مجلس شوریٰ قائم ہوئی تھی اور مسلمان اپنے سیاسی و معاشرتی منصوبے تیار کرتے تھے۔ یہی جگہ عدالتی مرکز بھی تھی اور یہیں مسلمانوں کے باہمی معاملات طے ہوتے تھے اور جزا و سزا کے احکام جاری ہوتے تھے۔ مسلمانوں کا مکتب و مدرسہ بھی یہی ہوتا تھا اور یہی جگہ دارالتبلیغ کا کام بھی دیتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے مہمان سرائے اور مہاجروں کے لئے قیام گاہ کا کام بھی اسی سے لیا جاتا تھا۔ جنگ کی صورت میں آلات جنگ اور دیگر ضروریات جنگ یہیں جمع

ہوتی تھیں اور زخمیوں کے لئے دارالشفا کا کام بھی اسی سے لیا جاتا تھا۔ حکومت کا دیوان اور خزانہ بھی یہی تھا۔ مختلف ممالک اور حکومتوں کے سفیروں اور ایلچیوں کو باریابی کے لئے یہیں منتظر رہنا پڑھتا تھا۔ غرضیکہ صدر اسلام میں مسجد مسلمانوں کی تمام انفرادی و اجتماعی اور دینی و دنیاوی ضروریات کو پورا کرتی تھی اور اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

۴۔ **معاشرتی ضرورت:** مسجد مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بھی نہایت بنیادی کردار ادا کرتی ہے اور اسلامی معاشرے کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ مسجد نہ صرف مرکز عبادت ہے بلکہ مسلمانوں کی سماجی و معاشرتی اصلاح و اتحاد کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے۔ روزانہ پانچ وقت کی نماز اور ہر جمعہ کے علاوہ دیگر اسلامی تقاریب کے سب اجتماعات مسجد ہی میں منعقد ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی دینی تعلیم کا سلسلہ بھی مسجد ہی میں قائم ہے۔ غرضیکہ زندگی کا کوئی بھی پہلو کیوں نہ ہو اس میں مسجد آج بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ درحقیقت مسجد ہی وہ جگہ ہے جہاں مسلمانوں کی معاشی و سیاسی اور اخلاقی و معاشرتی ترقی یا جمود کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور جہاں عوام اور حکام میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے اور اس طرح پورے معاشرے کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ مسجد ہی ہے۔

فرائض و مقاصد

قرآن و سنت اور دیگر تعلیمات اسلام کی روشنی میں مسجد کے حسب ذیل فرائض و مقاصد معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ **مرکز عبادت:** مسجد کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں انسان کی عاجزی و انکساری اور بندگی کا اظہار ہوتا ہے اور خداوند قدوس کی عظمت و کبریائی اور ہیبت و جبروت نمایاں ہوتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں بندے کو اپنے خالق سے بلا روک ٹوک

اور دقت کے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے اور اس کے ہر سوال کا جواب مسلسل انعامات و کرامات کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ ان نوازشات ربانی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خدا کے حضور میں اس کی فرض کردہ نماز اور سجدہ شکر ادا کرتا رہے۔

عبادت یوں تو تنہا بھی کی جاسکتی ہے لیکن جماعتی طور پر ادا کرنے سے دل پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے کیونکہ سب افراد ایک دوسرے سے اثر اندوز ہوتے ہیں اور عبادت کی محویت بڑھتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے نماز با جماعت کو ضروری قرار دیتے ہوئے فرمایا:

وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ (البقرۃ) اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "بلاشبہ جی چاہتا ہے کہ جوانوں کو حکم دوں کہ وہ میرے پاس لکڑیوں کا ڈھیر لگادیں پھر میں ان کے پاس جاؤں جو اپنے گھروں میں بلا عذر نماز پڑھتے ہیں اور انہیں گھروں سمیت پھونک ڈالوں (ابو داؤد)" لہذا نماز با جماعت واجب ٹھہری تو مسجد کا وجود ضروری قرار پایا۔ درحقیقت مسجد کی بدولت عبادت کی فضیلت انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ہر وہ قدم جو مسجد کی طرف اٹھتا ہے انسان کے گناہوں میں کمی کا باعث ہوتا ہے۔ رحمت خداوندی اور فرشتوں کی دعائیں شامل حال ہو جاتی ہیں۔ نیز مسجد میں عبادت کرنا گھر میں بیٹھ کر عبادت کرنے سے کئی درجہ افضل اور مقبول ہے۔ اس طرح مسجد سے عبادت کے ہمہ گیر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۲۔ **اولیں درسگاہ:** مسجد مسلمانوں کی اولیں درسگاہ ہونے کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا پہلا مکتب مسجد نبوی ہی میں قائم کیا اور یہاں اصحاب صفہ تعلیم پاتے رہے۔ اس کے علاوہ آپ کے عہد میں دوسری مساجد میں بھی بچوں کو دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ اسلام کی تقریباً تین صدیوں تک مسلمانوں کی درسگاہیں مسجدوں میں ہی قائم رہیں

اور طالبان علم اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے مساجد کا رخ کرتے رہے۔ جب کبھی نئی درسگاہ کی ضرورت پڑتی تو ایک نئی مسجد تعمیر کر لی جاتی تھی۔ ان مساجد سے ملحق حجرے یا کمرے بھی ہوتے تھے۔ جو طلبہ کے لئے اقامت گاہوں کا کام دیتے تھے آج بھی مذہبی تعلیم مساجد ہی میں سرانجام پاتی ہے۔ غرضیکہ مسجد مسلمانوں کی دینی تعلیم و تدریس کا اہم مرکز ہے۔

۳۔ **دینی شعار:** مسجد مسلمانوں کا دینی شعار ہے۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں پر مسلمان آباد ہیں۔ کیونکہ جہاں مسلمان رہتے ہوں وہاں مسجد ضرور ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔ کہ غزوات میں رات بھر انتظار فرماتے اور صبح کو جہاں سے اذان کی آواز آتی وہاں حملہ نہ کرتے تھے۔ ایک موقع پر آپؐ نے مجاہدین کو روانہ کرتے ہوئے نصیحت فرمائی کہ "اگر کہیں مسجد دیکھو یا اذان سنو تو وہاں کسی شخص کو قتل نہ کرو"

درحقیقت مسجد دین اسلام کی ایک روشن علامت ہے۔ اس کی عمارت سادگی کے باوجود پرکشش ہوتی ہے اس کو اس قدر تقدس حاصل ہوتا ہے کہ دیکھتے ہی دل میں احترام و عقیدت کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں اور ایمان تازہ ہو جاتا ہے خلیفہ ولید اول نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے جامع دمشق کو سونے اور چاندی سے مرصع کیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے تو سادہ طبیعت ہونے کی وجہ سے خانہ خدا پر یہ اسراف پسند نہ کیا اور اسے اکھاڑنے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں کسی نے بتایا کہ ایک عیسائی زائر مسجد کی اسی شان و شکوہ کو دیکھ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اس کی شان اغیار کے لئے باعث ہیبت ہے تو اسے اس کے حال پر رہنے دو۔

پھر مسجد سے دن میں پانچ مرتبہ بلند ہونے والی اذان کی صدا بھی دین اسلام کا شعار ہے۔ اذان کا ہر جملہ مسلمان کے جوش ایمانی کو ابھارتا ہے اور دشمنان اسلام کے جذبات کو کچلتا اور مغلوب کرتا ہے۔

۴ **مرکز ثقافت:** مسجد اسلامی ثقافت و تہذیب اور روایات کا اہم مرکز

ہے۔ یہاں مسلمانوں کو طہارت و پاکیزگی و صفائی و سادگی اور مساوات و ہمدردی کا درس ملتا ہے۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پاکیزگی کو جزو ایمان قرار دیا ہے۔ نماز کے لئے پاک و صاف اور باوضو ہونا ضروری ہے۔ لہذا مسلمان مسجد میں داخل ہونے سے پیشتر اس بات کا اہتمام کر لیتا ہے کہ جسم اور کپڑے صاف و پاکیزہ ہوں پھر نماز ادا کرنے کے لئے تمام قسم کے تکلفات مثلاً ریشمی لباس اور طلائی زیورات سے مبرا ہونا ضروری ہے اس طرح مسجد میں ہر داخل ہونے والا اپنے آپ کو ہر طرح کے پر تکلف لباس سے الگ کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ مسجد میں اٹھنا بیٹھنا بھی انتہائی سادگی سے ہوتا ہے۔

مسجد مساوات اور باہمی تعاون و ہمدردی کا درس بھی دیتی ہے۔ یہاں امیر و غریب، حاکم و محکوم اور رنگ و نسل کا کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا بلکہ سب ایک ہی صف میں خدا کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح امیر و غریب، شاہ و گدا اور حاکم و محکوم میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی و تعاون کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مسجد صحیح معنوں میں اسلامی ثقافت و تہذیب کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

۵۔ **تعمیر کردار:** مسجد انسان کے لئے روحانی اور اخلاقی تربیت کا سامان بھی مہیا کرتی ہے اور انسانی کردار کی صحیح نہج پر تعمیر کرتی ہے۔ مسجد میں انسان متقی و پرہیزگار اور نیک و صالح لوگوں سے ملتا ہے۔ ان سے وعظ و نصیحت حاصل کرتا ہے اور ان کے اخلاق و عادات کو سیکھتا ہے۔ روزمرہ کا درس قرآن مجید جمعہ کے روز کا خطبہ اور گاہے بگاہے علماء کے وعظ و تقاریر انسان کے اخلاق و کردار پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسجد میں آنے والے کا دل دنیا میں ہی نہیں الجھا رہتا بلکہ ہر وقت خدا کی یاد دل میں سمائی رہتی ہے جو انسان کو ہر قسم کی برائیوں سے بچائے رکھتی ہے اور وہ صحیح اسلامی کردار کا مظہر ہوتا ہے۔

۶۔ **نظم و ضبط:** مسجد نظم و ضبط کا درس بھی دیتی ہے۔ نماز با جماعت کے لئے

اوقات مقرر ہوتے ہیں اور ہر شخص اذان سنتے ہی نماز کے لئے مستعد ہو جاتا ہے۔ وقت مقررہ کے بعد کسی امیر و کبیر کا انتظار نہیں کیا جاتا بلکہ سب نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مسجد کے ذریعے مسلمانوں کو پابندی وقت کی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے کہ "بہترین عمل وقت مقررہ کی نماز ہے" نماز باجماعت نظم و ضبط کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ سب نمازی شانہ بہ شانہ نہایت خوش ترتیبی سے صفیں باندھ کر نماز ادا کرتے ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوں کی درستی پر بہت تاکید فرمائی ہے اور آپ نے صفوں کی درستی کو نماز کی تکمیل اور اس کا حسن قرار دیا ہے۔ اسی طرح پوری نماز میں تمام نمازی بخوشی امام کی اطاعت کرتے ہیں۔ قیام، رکوع، سجود، قعدہ اور تسلیم میں کسی مقتدی کے لئے جائز نہیں کہ امام سے سبقت لے جائے

پھر نماز اور امام کے خطبہ کے دوران گفتگو کرنا سخت منع ہے بلکہ کسی بولنے والے کو بھی سوائے اشارہ چپ کرانا جائز نہیں۔ اس کے علاوہ بھی مسجد میں امن و سکون اور نظم و ضبط کو برقرار رکھنا اشد ضروری ہے۔

۷۔ **مرکز اشاعت و تبلیغ:** مسجد اشاعت و تبلیغ اسلام کا بہت بڑا فریضہ سرانجام دیتی ہے مسجد میں روزانہ قرآن سنت کا درس دیا جاتا ہے۔ پھر ہر جمعہ کے روز خطبہ دیا جاتا ہے جس میں خدا کا پیغام اور اس کے احکام لوگوں تک پہنچائے جاتے ہیں اس طرح لوگوں کو اپنے روزمرہ کے معاملات میں دینی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ پھر ہر مسجد میں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی ہے اور لوگوں کو اسلام کے ابتدائی مسائل و احکام سکھائے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مسجد اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور لوگوں کی اصلاح و تنبیہ کا بہت اہم مرکز ہے۔

۸- اتحاد ملت : مسجد اتحاد ملت اسلامیہ کی بھی موجب ہے۔ مسجد میں آنے والے مسلمانوں کا ایک ہی نصب العین ہوتا ہے۔ لہذا ان میں ہم آہنگی و یکجہتی، الفت و محبت اور اتفاق و اتحاد کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں ایک دوسرے سے شناسائی حاصل ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور مسائل کا پتہ چلتا ہے۔ اس طرح انفرادی اور اجتماعی طور پر آپس کے مسائل پر غور و خوض کر کے تعاون و امداد کا جذبہ ابھرتا ہے۔ افراد معاشرہ میں شیرازہ بندی ہو جاتی ہے اور ملت میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔

۹- تعلیم آداب : مسجد متفرق اسلامی آداب خصوصاً معاشرتی آداب کی بھی نہایت مستحکم تعلیم دیتی ہے ہر شخص نہایت مؤدبانہ انداز میں مسجد میں داخل ہوتا ہے۔ مسجد میں سبھی لوگ نہایت ادب و سکون سے ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ پھر نماز خود ادب و سلیقہ کی بہترین مظہر ہے۔ غرضیکہ مسجد میں ہر فعل ادب و سلیقہ کی آئینہ داری کرتا ہے۔ نیز مسجد کے آداب کو تقدس حاصل ہوتا ہے اس لئے انسان جو آداب یہاں سیکھتا ہے وہ زندگی بھر کے لئے اس میں پختہ ہو جاتے ہیں۔

آداب مسجد

مسجد خدا کا گھر ہے اور مقدس جگہ ہے لہذا اس کا پورا پورا ادب و احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ آداب مسجد مختصراً درج ذیل ہیں:-

۱- مسجد میں داخل ہونے کے لئے جسم و لباس کا پاکیزہ ہونا ضروری ہے۔ جنبی اور نجس کا داخلہ ممنوع ہے۔

۲۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت لباس کا ہونا ضروری ہے۔ مسجد میں ننگا آنا جائز نہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یٰبَنِیْ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ — اے بنی آدم! تم مسجد میں لباس پہن کر جایا کرو۔

نیز لباس کا صاف ستھرا ہونا بھی لازمی ہے، خصوصاً جمعہ کے روز اچھے لباس اور خوشبو کا اہتمام سنت رسولؐ ہے۔

۳۔ مسجد میں جانے سے پیشتر پیاز، لہسن، مولی وغیرہ بدبودار اشیاء نہ کھانی چاہئیں۔

۴۔ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے پہلے دایاں قدم رکھنا چاہیئے۔ نیز یہ دعا پڑھنا مستحب ہے۔

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ — اے اللہ میرے لیئے رحمت کے دروازے کھول دے

۵۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی دو رکعت نماز نفل (تحیۃ المسجد) پڑھنا مسنون ہے۔

۶۔ مسجد محض ذکر الٰہی و عبادت خداوندی کے لیئے ہے اس لیئے یہاں خدا تعالیٰ کی عبادت و ذکر میں ہی مصروف رہنا چاہیے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا — بیشک مسجدیں اللہ کے لیئے ہیں پس اللہ کے سوا ان میں کسی اور کو نہ پکارو

۷۔ مسجد میں خرید و فروخت اور دنیاوی کاروبار یا ان کے متعلق گفتگو کرنا خیرات مانگنا، فضول و بیہودہ باتیں کرنا، لڑنا جھگڑنا، شور مچانا نیز ایسی بلند آواز سے پکارنا جس سے دوسرے کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہو ممنوع ہے۔

۸۔ مسجد میں دوسروں کے سروں اور کندھوں پر سے کودتے ہوئے آگے بڑھنا یا نماز پڑھتے ہوئے کے آگے سے گزرنا بھی جائز نہیں۔

۹۔ مسجد میں وضو کرنے، تھوکنے، ناک صاف کرنے اور حجامت وغیرہ بنانے کی اجازت نہیں وضو وغیرہ کے لئے مسجد سے الگ جگہ ہونی چاہیئے۔

۱۰۔ مسجد کو گرد و غبار سے پاک وصاف رکھنا چاہیے۔ نیز اس میں تصاویر آویزاں نہیں کرنی چاہیئں کیونکہ اس سے عبادت میں توجہ کے ہٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

۱۱۔ مسجد سے نکلتے ہوئے پہلے بایاں پاؤں باہر رکھنا چاہیے اور اس وقت یہ یہ دعائیہ کلمات کہنا مستحب ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ۔ — اے اللہ! میں تیرے فضل و رحمت کا طالب ہوں۔

اِسلامی معُاشرہ

اسلامی معاشرہ

معاشرہ کے معنی مل جل کر رہنا سہنا یا باہم مل کر زندگی بسر کرنا ہے لیکن اصطلاح

مفہوم: میں معاشرے سے مراد انسانوں کا وہ اجتماع، گروہ، طبقہ یا جماعت ہے جو کسی خاص مقصد کے تحت مل جل کر رہتے ہوں۔ معاشرے کے قیام کے لیے افراد کا باہم ملنے میں کسی مقصد کا ہونا ضروری ہے کیونکہ جو افراد بغیر کسی مقصد و ارادہ کے جمع ہو جائیں معاشرہ نہیں کہلائیں گے یہی وجہ ہے کہ جانوروں کے ریوڑ کو معاشرہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کے سامنے کوئی اجتماعی مقصد نہیں ہوتا۔

اسلامی معاشرہ سے مراد انسانوں کا وہ اجتماع ہے جن کی زندگیوں کے تمام شعبے مذہبی سیاسی، معاشی، اخلاقی وغیرہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات کے مطابق بسر ہوں۔ اسلامی معاشرہ دنیا کے تمام نسلی، قومی اور وطنی معاشروں کے برعکس خالص دینی و اخلاقی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ جس میں انسانوں کے باہمی اجتماع کا مقصد ایک عقیدہ توحید اور ایک اخلاقی ضابطہ حیات ہے۔

اہمیت

معاشرے کے قیام کی اہمیت کے مندرجہ ذیل پہلو ہیں۔

1 تقاضائے فطرت: انسان مدنی الطبع ہے اور معاشرے کا قیام اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے سہنے اور زندگی بسر کرنے پر فطرتاً مجبور ہے اور تنہائی و علیحدگی کی زندگی سے طبعاً گھبراتا ہے۔ اس کے علاوہ ضروریات

زندگی اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اشتراک و تعاون میں زندگی بسر کرے۔ پیدائش سے وفات تک انسان دوسروں کی امداد و تعاون کا محتاج رہتا ہے۔ بچے کی تربیت و پرورش کا کٹھن کام والدین کے تعاون کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ ماں دودھ پلاتی ہے اور بچے کی صحت و صفائی اور آرام کا خیال رکھتی ہے۔ باپ اس کی ضروریات مہیا کرتا ہے۔ پھر اس کی تعلیم کا مسئلہ پیش ہوتا ہے جو مختلف اساتذہ کے تعاون و رہنمائی سے تکمیل پاتا ہے۔ پھر شادی بڑھاپا زندگی کے ہر مرحلے پر ہی دوسروں کی امداد کی ضرورت پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں سے بے تعلق رہ کر انسان زندگی بسر نہیں کر سکتا کیونکہ معاشرے کے قیام کے بغیر فرد کا وجود بے حقیقت ہو کر رہ جاتا ہے نیز انسان اپنی فطری صلاحیتوں کو فقط معاشرہ میں ہی رہ کر بروئے کار لا سکتا ہے اور اگر وہ معاشرے سے قطع تعلق کر لے تو اس کے لئے مادی و روحانی دونوں اعتبار سے ترقی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ تجربہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ آرام دہ زندگی بسر کرنے کے لئے معاشرے کا وجود ضروری ہے۔

۲۔ اسلامی نقطہ نظر: اسلامی نقطہ نظر سے انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کا خلیفہ یا نائب ہونے کی ہے۔ خلافت اور نیابت کی ذمہ داری ہی انسان کی زندگی کو با مقصد بنا دیتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کو قائم کیا جائے کیونکہ تشکیل معاشرہ کے بغیر انسان نہ تو خدا تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں نافذ کر سکتا ہے اور نہ ہی ان کے مطابق اس دنیا کا انتظام چلا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے رہبانیت، تنہائی، کنارہ کشی اور گوشہ نشینی کی زندگی کو خلاف فطرت قرار دیا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے۔

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ — اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

اس کے برعکس آنحضرت نبی کریمؐ نے معاشرتی زندگی اختیار کرنے کو پسند فرمایا خواہ اس کے اپنانے میں تکلیف ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی ایذا رسانی پر صبر کرتا ہے اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔

قیام معاشرے کے متعلق جدید مفکرین میں دو مختلف و متضاد نظریات پائے جاتے ہیں ایک نظریہ یہ ہے کہ معاشرے کا مقصد اس کی اجتماعی بہبود ہے اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ معاشرے کا اصل مقصد اس کے افراد کی بہبود ہے یعنی ایک نظریہ معاشرہ کا حامی ہے اور دوسرا فرد کا طرفدار ہے۔

اسلام افراط و تفریط کے ان دونوں نظریات سے ہٹ کر اعتدال کا راستہ پیش کرتا ہے فرد یا معاشرہ ان دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر بالکل ترجیح نہیں دیتا بلکہ دونوں میں اعتدال و توازن قائم کرتا ہے اور دونوں ہی کی فلاح و بہبود کا تقاضا کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشرہ کی روح کو قرآن حکیم نے یوں بیان کیا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

پس تم اللہ سے ڈرتے رہو اور آپس میں تعلقات درست رکھو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ دل میں خدا کا خوف رکھنا آپس میں صلح صفائی سے رہنا اور قرآن و سنت کی پیروی کرنا ہی اسلامی زندگی کا صحیح معیار ہے اور یہی اسلامی معاشرے کا مقصد بھی ہے۔

درحقیقت اسلام میں معاشرہ کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کا ہر فرد اپنی شخصیت کی تعمیر خوف خدا دل میں رکھتے ہوئے کرے تاکہ وہ معاشرے کا ایک صالح رکن بن سکے اور تمام افراد معاشرہ باہم ایک دوسرے کی اصلاح کرتے رہیں تاکہ معاشرہ مجموعی طور پر بھی ترقی کرے اور ایک عالمگیر حیثیت اختیار کرے جو صحیح معنوں میں خدا اور رسولؐ کے مطیع فرماں بردار مومنین کا معاشرہ ہو۔

اسلامی معاشرہ کی خصوصیات

اسلامی معاشرہ کی اہم و ممتاز خصوصیات حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ وحدت فکر و عمل: اسلامی معاشرہ کی سب سے بنیادی خصوصیت وحدت فکر و عمل ہے یعنی اسلامی معاشرہ کے تمام افراد ایک ہی انداز پر سوچتے اور عمل کرتے ہیں ۔ فکری وحدت کی بنیاد ایمان ہے ۔ ہر مسلمان خدا، اس کے رسولوں، فرشتوں، الہامی کتابوں اور یوم آخرت پر کامل ایمان رکھتا ہے اور انہی پر اپنے افکار کی بنیاد رکھتا ہے ۔ اسی طرح عملی وحدت کی بنیاد ارکان اسلام ہیں یعنی شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج مسلمانوں کی عملی وحدت کا ثبوت ہیں کیونکہ انہی پر مسلمان اپنے دیگر اعمال کو استوار کرتا ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں بعض معمولی باتوں میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے لیکن یہ فروعی اختلاف فطری اور ناگزیر ہے اصولی اعتبار سے مسلمانوں میں وہ وحدت فکر و عمل موجود ہے جس کی مثال دنیا کا کوئی دوسرا معاشرہ پیش نہیں کر سکا ۔ دیکھا جائے تو یہی فکر و عمل کی روش اختلافات کے باوجود اسلامی معاشرہ کو متحد و منظم اور مضبوط و مستحکم کئے ہوئے ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قوم کا خدا ایک، نبیؐ ایک، کتاب ایک، قبلہ ایک، شریعت ایک اور طریقہ عبادت بھی ایک ہو اس میں ہمیشہ فکر و عمل کی وحدت رہے گی ۔

۲۔ اخوت و محبت: اسلامی معاشرہ کی دوسری اہم خصوصیت اخوت ہے ۔ یعنی اسلامی معاشرہ کے افراد آپس میں بھائی چارہ، دوستی و رفاقت، خلوص و ہمدردی، ایثار و تعاون سے اور خیر خواہی و بھلائی کا تعلق رکھتے ہیں اس رشتہ اخوت کا ذکر قرآن پاک میں یوں ہے ۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (حجرات ۱۰) سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں ۔

اس آیت کریمہ کی وضاحت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات مروی ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ تو وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے" ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ "کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان

سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"۔ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ (بخاری)

آنحضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر مسلمانوں کے رشتۂ اخوت کی وضاحت کرتے ہوئے مسلمانوں کو ایک جسم کی مانند قرار دیا جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "تو مسلمانوں کو آپس میں رحمدلی، محبت اور ارتباط میں ایک جسم کی مانند دیکھے گا کہ اگر اس کا ایک عضو بیمار ہوا تو سارا جسم بیداری اور بخار میں مبتلا ہو گیا (بخاری) ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کے رشتۂ اخوت کو ایک عمارت سے تشبیہ دی ہے۔ جیسا کہ آپ کا فرمان ہے کہ مسلمان مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو قوت دیتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے ملایا۔ (بخاری و مسلم)

ہجرت کے بعد مدینہ میں حضور اکرم صلی اللہ وسلم نے مسلمانوں میں مواخات قائم کر کے اخوت اسلامی کا ایسا عمدہ عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جس کی نظیر ملنا محال ہے۔ تمام مہاجرین اور انصار آپس میں خون کے رشتے کی طرح دو قالب و یک جان ہو گئے۔ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کو مکان، سرمایہ، کاروبار اور کھیتی باڑی میں سے حصہ دیا یہاں تک کہ جن کے پاس دو بیویاں تھیں انہوں نے ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کے عقد میں دے دی۔

۳۔ مساوات: اسلامی معاشرے کی تیسری خصوصیت مساوات ہے یعنی اس معاشرہ کے تمام افراد معاشرتی مراتب اور حقوق کے اعتبار سے برابر و مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا قومی، ملکی، نسلی، لسانی اور طبقاتی امتیاز مدنظر نہیں رکھا جاتا کسی شخص کو اپنے خاندان یا حسب نسب یا دولت کی بنا پر نہ کوئی فخر و مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی شخص اپنی پیدائش یا پیشے کے اعتبار سے کمتر و ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح آقا و غلام اور شاہ و گدا کی بھی کوئی تمیز نہیں ہوتی بلکہ فضیلت و برتری کا اصل معیار تقویٰ و پرہیزگاری ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ — بے شک تم میں سب سے زیادہ معزز

اَتْقٰکُمْ (الحجرات ۱۳) اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس امر کی وضاحت میں فرمایا ہے کہ نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر اور نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر مگر تقویٰ کے ساتھ۔ تمام لوگ ابن آدم ہیں اور سا آدمؑ مٹی سے پیدا کئے گئے۔

۴۔ حریت:- اسلامی معاشرے کی چوتھی خصوصیت حریت یعنی آزادی ہے۔ اس معاشرہ کے تمام افراد کو مذہبی و معاشی و سیاسی ہر اعتبار سے مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ کسی شخص کو پکڑ کر غلام نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ہی کسی شخص کو خرید و فروخت کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص کو اپنا پسندیدہ مذہب و عقیدہ اختیار کرنے اور اپنے مذہب و عقیدہ کے مطابق مذہبی رسوم وغیرہ ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر شخص تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے افکار و خیالات کا بھی مکمل اظہار کر سکتا ہے اور حکومت کا پورا پورا محاسبہ کر سکتا ہے۔ آزادی دین کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ (البقرہ ۲۵۶) دین میں کوئی جبر نہیں۔

۵۔ سادگی و صفائی: اسلامی معاشرے کی پانچویں خصوصیت سادگی، صفائی اور پاکیزگی ہے۔ اسلام آرائش و نمائش اور اسراف و فضول خرچی کو ناپسند کرتا ہے اور مسلمانوں کو سادہ اور پاکیزہ و صاف رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن پاک میں سادگی کی تعلیم ان الفاظ میں دی گئی ہے:-

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (اعراف ۳۱) اور کھاؤ، پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں سادگی کی تلقین فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ ناز و نعمت اور عیش و عشرت کی زندگی سے بچو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بندے عیش کی زندگی بسر کرنے والے نہیں ہیں۔ (مشکوٰۃ) ایک دوسری حدیث میں آپؐ کا فرمان ہے کہ سادہ زندگی بسر کرنا ایمان میں سے ہے۔"

پاکیزگی وصفائی کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان کا جسم اور لباس ہر وقت پاک وصاف رہنا لازمی ہے کیونکہ مسلمان کو دن رات میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرنا ہوتی ہے جس کے لیے جسم و لباس کی پاکیزگی شرط ہے۔ علاوہ ازیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "صفائی ایمان میں سے ہے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی زندگیاں سادگی، صفائی اور پاکیزگی کا عملی نمونہ تھیں۔

۶۔ **وضع داری**: اسلامی معاشرے کی ایک خصوصیت وضعداری بھی ہے۔ یعنی اسلامی معاشرے کے مخصوص آداب واخلاق ہیں جو اسے ایک خاص وضع عطا کرتے اور دیگر معاشروں میں ممتاز کرتے ہیں۔ خورد و نوش، نشست و برخاست اور میل ملاپ وغیرہ کے بارے میں اسلام نے خاص آداب سکھائے ہیں جن سے مسلمانوں کی پہچان ہوتی ہے اور ملی خودداری اور خودی کا احساس بیدار رہتا ہے۔

اسی طرح اسلامی معاشرے کے افراد کے لیے اخلاق حسنہ مثلاً صداقت وامانت عدل وانصاف اور رحم وکرم وغیرہ کا اختیار کرنا ضروری ہے اور اخلاق رذیلہ مثلاً جھوٹ، ظلم وغیرہ سے باز رہنا لازمی ہے۔ اخلاق حسنہ ہی اسلامی معاشرہ کے افراد کی مخصوص پہچان ہیں اور یہی اسلام کا مقصد ہے۔

۷۔ **تبلیغ**: اسلامی معاشرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے افراد نیکی و بھلائی کی تبلیغ واشاعت اور برائی و بے حیائی سے دوسروں کے روکنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ قرآن حکیم نے بھی مسلمانوں کے اس فریضہ کی نشاندہی کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۱۰)

تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کی طرف نکالی گئی ہو تاکہ تم نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط (مائدہ ۲)

تم نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس امر کی تاکید فرمائی ہے کہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ جب بھی وہ کوئی خلافِ شریعت ناپسندیدہ کام دیکھے تو اس کو حسب استطاعت روکنے کی کوشش کرے جیسا کہ آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی برے کام کو دیکھے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے روکے اور اگر ہاتھ سے روکنے کی قدرت نہ ہو تو زبان سے اور اگر زبان سے بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا جانے یہ کمزور ترین ایمان ہے۔

۸۔ لغو امور سے اجتناب: اسلامی معاشرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں تمام لہو و لعب اور فضول و بیہودہ مشاغل ممنوع ہیں۔ اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ ناچ، راگ، رنگ، شراب اور دیگر لغو و لایعنی مشاغل میں قیمتی وقت صرف کیا جائے جس سے دینی و دنیاوی کوئی بھی فائدہ حاصل نہ ہو اس کے برعکس اسلام فارغ اوقات میں ایسے تفریحی مشاغل اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے جس سے انفرادی یا اجتماعی دینی و دنیاوی فوائد حاصل ہوں مثلاً باہمی اصلاحی کاموں میں حصہ لیا جائے اور خدمت خلق کے کام کئے جائیں۔

رشتہ دار

رشتہ دار کے لئے عربی زبان میں لفظ اقرب استعمال ہوتا ہے جس کی جمع اقارب یا اقربا ہے اور

مفہوم: اس کے معنی قریبی یا نزدیکی ہے اصطلاحاً اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا والدین، اولاد اور زوجین کے بعد ہمارے خاندانی تعلق ہوتا ہے یعنی چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ وغیرہ۔ عربی زبان میں رشتہ دار کے لئے اقرب کے علاوہ لفظ رحم بھی مستعمل ہے جس کی جمع ارحام ہے اور اس کے معنی ماں کا پیٹ ہیں۔ چونکہ تمام رشتہ داروں کا تعلق والدین کے ذریعے سے ہوتا ہے اور والدین میں ماں کا مقام باپ سے بلند ہے اس لئے اصولی طور پر تمام رشتہ دار رحم مادر کی نسبت سے ہی تعلق رکھتے ہیں اور ارحام کہلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عربی محاورے میں رشتہ داروں سے حسن سلوک کو صلہ رحمی کا نام دیا جاتا ہے اور ان سے تعلق توڑنے کو قطع رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں رشتہ دار کے لئے "ذوالقربٰی" اور "ذوی الارحام" دونوں ہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا مطلب "قرابتدار" اور "رحم" والے" ہیں۔

اہمیت

رشتہ داری کی اہمیت مندرجہ ذیل پہلوؤں سے واضح ہوتی ہے۔

۱۔ فطری تعلق: رشتہ داروں کے ساتھ انسان کو طبعی و فطری محبت ہوتی ہے اور ان کے ساتھ تعلق قدرتی، حقیقی اور غیر مصنوعی ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اسے توڑنا بھی چاہیں اور رشتہ داری سے الگ ہونا چاہیں تو ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ رشتہ داری میں اصل اشتراک رحم مادر ہے۔ برخلاف دوسرے تعلقات کے جو محض قوم، ملک، مذہب، پیشہ اور دیگر نظریاتی اشتراک پر استوار ہوتے ہیں اور ان کے ختم ہونے کا ہمیشہ امکان رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر رشتہ داروں میں کبھی ناراضگی یا رنجش پیدا بھی ہو جائے تو صلح وصفائی کا قوی امکان رہتا ہے۔ درحقیقت یہ رشتہ والدین، اولاد اور زوجین کے بعد سب سے مضبوط ہوتا ہے۔

۲۔ استحکام معاشرہ: رشتہ داروں سے جو معاشرت قائم ہوتی ہے وہ نہایت اہم اور پائیدار ہوتی ہے۔ کیونکہ رشتہ دار طبعی و فطری تعلق کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و ہمدردی، ایثار و قربانی اور حسن سلوک کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رشتہ داروں کی

موجودگی میں انسان اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتا بلکہ اپنے آپ کو ایک مضبوط جماعت متصور کرتا ہے اور حالات کا نہایت قوی القلب ہو کر مقابلہ کرتا ہے۔

مستحکم رشتہ داریاں بہت بڑی قوت ہوتی ہیں اور ان کے تعاون سے بڑے بڑے تعمیری کام ہو سکتے ہیں رشتہ داروں کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا ہے تو وہ انتہائی خلوص و جانثاری سے سرانجام دیتے ہیں اور مختلف امور میں حتی الوسع ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و امداد کرتے ہیں۔ ہر شخص کے پیش نظر محض اس کی ذاتی منفعت مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہ سب رشتہ داروں کے اجتماعی مفاد کو مدنظر رکھتا ہے۔ اس طرح رشتہ داروں کی باہمی امداد و کفالت سے معاشرہ خوشحال و فارغ البال ہو جاتا ہے اور پورے معاشرے کو اتحاد و استحکام حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ قرآن پاک میں تاکید: رشتہ داری کی اہمیت واضح کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن پاک میں کم از کم بارہ مقامات پر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی صریح تاکید وارد ہوئی ہے اور اس حسن سلوک کو احسان نہیں بلکہ انسان کا فرض قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (روم: ۳۸) پس قرابتدار کو اس کا حق ادا کر

رشتہ داری کی اہمیت اس امر سے بھی واضح ہوتی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے دعوت و تبلیغ حق میں بے شمار مصیبتیں اور صعوبتیں برداشت کیں اور امت مسلمہ پر بے حد و کنار احسان کئے اس کا بدلہ فقط یہ طلب کیا کہ امت اپنے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرے اور ان کے حقوق ادا کرے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى (شوریٰ: ۲۳) (اے نبی) کہدیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا سوائے اس کے کہ تم اپنے رشتہ داروں میں محبت و مروت پیدا کرو

اس کے علاوہ قرآن میں متعدد مقامات پر مختلف انداز میں حقوق اقارب کے ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے مثلاً ایک مقام پر ارشاد فرمایا۔

۱۔ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى اور وہ خدا کی محبت میں رشتہ داروں کو مال دیتے ہیں (البقرہ: ۱۷۷) ۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:-

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى ۔ بیشک اللہ تعالیٰ عدل و احسان اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔ (نحل ۹۰)

۴۔ احادیث نبوی: آنحضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں صلہ رحمی کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ ایک مرتبہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کونسا آدمی افضل ہے آپ نے فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہو اپنے رشتہ داروں سے ہمیشہ اچھا سلوک کرتا ہو اور لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتا ہو اور برائیوں سے روکتا ہو۔

ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں رحمٰن ہوں اور رحم مجھ سے نکلا ہے۔ پس جو رحم کو ملائے گا میں اسے اپنی رحمت سے ملاؤں گا اور جو رحم کو قطع کرے گا میں اس سے قطع کروں گا ایک دوسری حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔ ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا کہ اپنی قرابت کو زندہ کرتے رہو چاہے سلام کے ذریعے ہی ہو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی تمام زندگی رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کیا۔ آپ کو جب تبلیغ دین کا حکم ہوا تو آپ نے دین حق کی طرف سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو ہی دعوت دی آپ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کی خود کفالت کی اس کے علاوہ آپ دوسرے رشتہ داروں کی بھی وقتاً فوقتاً امداد فرماتے رہے تھے۔

اقربا پروری کی حد

رشتہ داروں کی مدد اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ایک قابل تحسین جذبہ اور بہت بڑی نیکی ہے لیکن اس میں بھی اعتدال ضروری ہے۔ اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ انسان اقربا نوازی میں اس حد تک بڑھ جائے کہ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز ختم ہو جائے اور عدل و انصاف کی بجائے دوسروں پر ظلم و زیادتی اور ان کی حق تلفی ہونے لگے۔ رشتہ داروں کی ہر غلط بات میں بھی حمایت کی جائے اور اہلیت رکھنے والے غیر رشتہ داروں پر نااہل رشتہ داروں کو ترجیح دی جائے بلکہ اسلام رشتہ داری کو باہمی ربط و تعلق اور خلوص و محبت کا وسیلہ قرار دیتا ہے نہ کہ ایک دوسرے کے خلاف گروہ آرائی اور تعصب کا ذریعہ۔

ایک موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ کیا اپنے خاندان سے محبت رکھنا تعصب میں

داخل ہے ؟ آپ نے فرمایا نہیں، تعصب یہ ہے کہ تو اپنے خاندان کی بے انصافی میں مدد کرے۔

حقوق اقارب

قرآن و سنت اور دیگر تعلیمات اسلامی کی رو سے رشتہ داروں کے حقوق مندرجہ ذیل ہیں :۔

احسن سلوک : رشتہ داروں کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جائے۔ ان کے ساتھ محبت و شفقت اور حلم و بردباری کا برتاؤ کیا جائے اور کسی قسم کی سختی یا زیادتی نہ کی جائے۔ قرآن پاک میں رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے توحید و عبادت اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى (النساء)

اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ (النساء)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے :۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى (البقرۃ :)

اور والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

تمام رشتہ دار امیر ہوں یا غریب، بلند مرتبہ ہوں یا کم مرتبہ نزدیکی ہوں یا دور کا تعلق رکھتے ہوں سبھی حسن سلوک کے مستحق ہیں یہاں تک کہ اگر رشتہ دار غیر مسلم ہوں تو بھی حسن سلوک کے حقدار ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے متعلق فرمایا کہ فلاں میرے ملی رفیق نہیں میرا ولی و دوست اللہ تعالیٰ اور نیک مسلمان ہیں البتہ ان غیر مسلم اقربا کے ساتھ میرا خون کا رشتہ ہے میں اس کو بھلائی کے ساتھ زندہ رکھوں گا۔ البتہ جس قدر کوئی رشتہ دار قریبی تعلق رکھتا ہو گا اسی قدر وہ زیادہ حسن سلوک کا حق دار ہو گا اور جتنا دور کا تعلق رکھے گا اسی قدر اس کے حقوق کم ہوں گے ایک مرتبہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں کس سے بھلائی کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اپنی ماں سے اور باپ سے اور بھائی سے اور پھر اس کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں سے اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات ایسے رشتہ داروں سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے جو حاسد شر پسند گھٹیا اور

کینہ ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ نیکی کی جائے تو بدی سے جواب دیتے ہیں اور ان کی بہتری کی کوشش کی جائے تو نقصان پہنچاتے ہیں اور ہمیشہ زیادتی کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ ایسے رشتہ دار پریشانی و ملال کا باعث بنے رہتے ہیں لیکن ان کی شر انگیزی اور کینہ سوزی کو صبر و تحمل سے برداشت کیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت ثواب کا باعث ہے رشتہ دار برا ہو تو بھی اس سے حسن سلوک کیا جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں۔ میں ان سے تعلق رکھنا چاہتا ہوں اور وہ توڑتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ بھلائی کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برائی کرتے ہیں میں ان سے نرمی کرتا ہوں اور وہ سختی کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہ بتا رہے ہو تو جب تک اس حال پر رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ تمہاری مدد پر مقرر رہے گا

درحقیقت انسانیت کا کمال یہی ہے کہ بدسلوکی کا جواب حسن سلوک سے دیا جائے چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کسی شخص کا یہ کمال نہیں ہے کہ وہ حسن سلوک کا جواب حسن سلوک سے دے بلکہ کمال یہ ہے کہ اس کے رشتہ دار اس سے بدسلوکی کریں اور وہ ان سے حسن سلوک سے پیش آئے

(بخاری)

۲۔ مالی اعانت: رشتہ داروں کا دوسرا حق یہ ہے کہ ان کی مالی اعانت کی جائے۔ ایک خاندان کے سب افراد یکساں طور پر مالدار نہیں ہوتے بلکہ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو روٹی کپڑے کو بھی محتاج ہوتے ہیں اس لئے اہل ثروت و دولت پر لازم ہے کہ وہ اپنے مفلس و نادار رشتہ داروں کو مالی امداد دیں اور ان کے لئے ضروریات زندگی مثلاً کھانا، پینا اور رہائش وغیرہ کا انتظام کریں بلکہ اگر کوئی یتیم ہو تو اس کی پرورش و تربیت کا بھی انتظام کریں حتیٰ کہ اگر کوئی غریب رشتہ دار تعلیم کا مستحق ہو تو اسے تعلیم کے سلسلے میں مالی امداد دی جائے۔

قرآن پاک میں متعدد جگہ رشتہ داروں پر مال صرف کرنے کی تلقین کی گئی ہے ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (البقرۃ ۲۱۵)

اے نبی کہہ دیجئے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی۔ (البقرۃ)

اور وہ اللہ کی محبت میں رشتہ داروں پر مال خرچ کرتے ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے رشتہ داروں کی مالی اعانت فرماتے تھے۔ آپ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت علیؓ کی کفالت کی۔ علاوہ ازیں آپ نے صحابہ کرامؓ کو بھی اسی امر کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص عام غریبوں کو صدقہ دے گا۔ اسے ایک درجہ ثواب ملے گا اور جو شخص رشتہ داروں پر خرچ کرے گا اسے دگنا ثواب ملے گا۔

صحابہ کرامؓ نے رشتہ داروں کی مالی اعانت کی عملی مثالیں پیش کی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے مسطح بن اثاثہ اور دیگر قرابتداروں کی کفالت اپنے ذمے رکھی تھی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک غریب بچے کو اس کے چچیرے بھائی خرچ نہیں دیتے تھے۔ آپ نے انہیں قید میں ڈال دیا۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ نے اپنا گھر اپنے رشتہ دار زیدؓ بن خطاب کو عمر بھر کے لئے دے رکھا تھا۔

حضرت طلحہؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے پاس ایک باغ ہے اور میں اسے اللہ کی راہ میں وقف کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تیرا اجر ثابت ہو گیا اور تو اسے اپنے اقربا میں تقسیم کر دے۔ چنانچہ انہوں نے وہ باغ رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا۔

۳۔ تعاون و ہمدردی: رشتہ داروں کا ایک حق یہ بھی ہے کہ دکھ سکھ، رنج و راحت، بیماری و صحت اور شادی و موت پر موقع پر ان کے ساتھ ہمدردی و تعاون کا اظہار کیا جائے اور نہ صرف مالی بلکہ ہر قسم کی روحانی و اخلاقی امداد دی جائے۔ اگر کوئی رشتہ دار بیمار ہو تو اس کی عیادت و تیمارداری کی جائے۔ اگر کوئی کسی مصیبت و مشکل میں پھنسا ہو تو اسے نجات دلانے کی کوشش کی جائے اگر کوئی بے راہ روی کی زندگی بسر کرنے لگے تو اسے راہ راست پر لانا بھی رشتہ داروں ہی کا فرض ہے۔ اسی طرح رشتہ داروں کے مختلف مسائل حل کرنے میں ان کے ساتھ تعاون کرنا اور ان کی الجھنیں دور کرنے کے لئے مفید مشورے دینا بھی ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ رشتہ داروں کے ساتھ ہر نیک کام میں تعاون کیا جائے اور ہر دکھ و مصیبت میں ان کی مدد کی جائے اور اظہار ہمدردی کیا جائے۔

۴۔ عفو و درگزر: رشتہ داروں کا یہ بھی حق ہے کہ ان کے ساتھ عفو و درگزر کا سلوک کیا جائے اور ان سے قطع تعلق سے گریز کیا جائے۔ بلکہ ان کی غلطیوں اور زیادتیوں کو

بڑی عالی حوصلگی اور فراخدلی سے برداشت کرتے ہوئے تعلق برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے ایک رشتہ دار مسطح نے آپ کی بیٹی ام المومنین حضرت عائشہؓ پر بہتان طرازی میں حصہ لیا تو آپؓ نے اس کی امداد بند کر دی۔ اس پر قرآن پاک میں یہ حکم نازل ہوا:۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ (نور: ۲۲) اور تم میں سے جو فضل اور کشائش والے ہیں وہ اہل قرابت اور محتاجوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھائیں۔

ایک دوسرے مقام پر قطع رحمی پر تنبیہ کی گئی ہے۔ فرمایا:۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ (النساء: ۱) اور اللہ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سوال کرتے ہو اور رشتہ داروں سے تعلق توڑنے سے بھی بچو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں رشتہ داروں سے قطع تعلق کی ممانعت فرمائی ہے آپ کا ارشاد ہے کہ جو صلہ رحمی نہیں کرتا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ قطع رحمی کرنے والے کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجلس میں تشریف رکھتے تھے کہ فرمایا کہ ہم میں اس وقت جو قاطع رحم ہے اٹھ جائے۔ ایک نوجوان اٹھ کر چلا گیا۔ اس کی اپنی خالہ سے کچھ بدمزگی تھی اس کے پاس گیا اور مصالحت کر کے واپس آیا۔ حضور نے فرمایا کہ جن لوگوں میں کوئی قاطع رحم ہو ان پر رحمت نازل نہیں ہوتی۔

ثمرات و فوائد

رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے سے مندرجہ ذیل ثمرات و فوائد حاصل ہوتے ہیں:۔

۱۔ خانگی مسرت و اطمینان: رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا بنیادی فائدہ یہ ہے کہ اس سے پورے خاندان کا ماحول پرسکون خوشگوار ہو جاتا ہے۔ خاندان کے تمام افراد میں ایک دوسرے کے لئے خلوص و ہمدردی، ایثار و قربانی اور عفو و درگزر کا احساس پیدا ہو جاتا ہے تمام خاندانی جھگڑے اور رقابتیں ختم ہو کر مسرت و اطمینان کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ یتیموں، غریبوں اور

مفلسوں و ناداروں کی امداد سے پورا خاندان خوشحال ہو جاتا ہے اور افراد خاندان کو معاشرے کی بہبود کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ خیر و برکت: رشتہ داروں سے حسن سلوک خیر و برکت کا بھی موجب ہے۔ خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کی روزی میں برکت دیتا ہے اور مال و دولت میں کشائش عطا کرتا ہے نیز ان کی عمریں بھی دراز کرتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے کہ "جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت کی جائے اور اس کی عمر دراز کی جائے تو اسے چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے" (بخاری)

۳۔ آخرت میں کامیابی: رشتہ داروں سے حسن سلوک کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کو اخروی زندگی میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ جنت کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ ایک شخص نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جو جنت میں لے جائے۔ آپؐ نے فرمایا خدا کی عبادت کرو کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ نماز ادا کرو۔ زکوٰۃ دو اور اہل قرابت کا حق ادا کرو (بخاری) ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا۔ کہ جو صلہ رحمی نہیں کرتا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

۴۔ کفارہ گناہ: رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا گناہوں کے کفارے کا موجب ہوتا ہے ان سے قطع تعلق کرنا اعمال کی نا مقبولیت کا باعث بنتا ہے ایک شخص نے حضرت رسول خدا کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں ایک کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا ہوں کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ آپؐ نے پوچھا کیا تیری ماں زندہ ہے۔ عرض کیا نہیں۔ پھر آپ نے پوچھا کیا تیری خالہ زندہ ہے؟ عرض کیا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا تو اس کے ساتھ حسن سلوک کر۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ "قطع رحمی کرنے والے کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا"۔

ہمسایہ

مفہوم: ہمسایہ کے لئے عربی زبان میں لفظ 'جار' استعمال ہوتا ہے جس کی جمع 'جیران' ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے قرب وجوار اور پڑوس میں رہتے ہوں۔ شریعت میں ہمسائیگی کی حد اپنے مکان سے چاروں طرف چالیس گھروں تک ہے۔ جس میں اپنے بیگانے رشتہ دار و غیر رشتہ دار اور مسلم و غیر مسلم سب شامل ہیں اگرچہ ہمسایہ کا مفہوم نہایت وسیع ہے اور اس کا اطلاق صرف ہم رہائش پر ہی نہیں ہوتا بلکہ ہم مکتب، ہم پیشہ، ہم کاروبار اور ہم سفر وغیرہ سب ہمسائیگی کے مفہوم میں شامل ہیں۔ تاہم ہمسایہ سے عام طور پر مراد ہم رہائش یعنی ساتھ ساتھ رہنے والے ہی ہوتے ہیں۔

ہمسایہ کے مدارج: اسلام میں حسن سلوک کا معیار 'قربت' ہے جو جتنا زیادہ قریب ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حسن سلوک کا مستحق ہوگا۔ ہمسایہ کے معاملہ میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ سب قسم کے ہمسایوں میں فوقیت و برتری اس کو حاصل ہے جس کے ساتھ ہمسائیگی کے علاوہ کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو۔ کافر و غیر رشتہ دار ہمسایہ کا حق سب سے کم ہے کیونکہ اس کے ساتھ صرف ہمسائیگی کا تعلق ہے۔ مسلمان ہمسایہ کا اس سے زیادہ حق ہے کیونکہ وہ ہمسائیگی کے علاوہ اخوت اسلامی کا بھی تعلق رکھتا ہے مسلمان رشتہ دار ہمسایہ کا حق سب پر فائق ہے کیونکہ اس کا ہمسائیگی اور ہم مذہبی کے علاوہ تیسرا تعلق قرابت کا بھی ہے چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "غیر مسلم ہمسایہ کا ایک حق ہے، مسلمان ہمسایہ کے دو حق ہیں اور رشتہ دار ہمسایہ کے تین حق ہیں"

حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ میرے دو پڑوسی ہیں میں تحفہ یا کوئی چیز کس کے پاس بھیجوں؟ آپؐ نے فرمایا جس کا گھر تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو (بخاری)

اہمیت

ہمسایہ کی اہمیت مندرجہ ذیل دلائل سے واضح ہوتی ہے:۔

۱۔ معاشرتی ضرورت: ہمسایہ سے عمدہ تعلقات رکھنا ایک بہت بڑی معاشرتی ضرورت ہے انسانی معاشرہ اور تمدن کی بنیاد اشتراک عمل اور باہمی تعاون پر قائم

ہے۔ کیونکہ ہر انسان فطری طور پر دوسرے کا محتاج ہے اور کوئی شخص بھی بے نیازی کا دعویٰ نہیں کر سکتا رنج و غم، بیماری و دکھ، پریشانی و مصیبت اور تکالیف و خطرات میں اسے دوسروں کی امداد و اعانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان حالات میں سب سے پہلے جو انسان کی مدد و اعانت کو پہنچ سکتا ہے وہ اس کا ہمسایہ ہی ہے یہی وجہ ہے کہ قریبی ہمسایہ کی اہمیت دور کے رشتہ دار سے بھی زیادہ ہے۔

ہمسایہ کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ بوجہ قرب و پڑوس وہ ہر وقت کا شریک رنج و راحت ہوتا ہے اور اگر اس سے بہتر تعلقات نہ رکھے جائیں تو عین ممکن ہے وہ کسی وقت شر یا مصیبت کا باعث بن جائے کیونکہ انسان کو تکلیف یا دکھ پہنچنے کا اسی سے اندیشہ ہو سکتا جو اس کے زیادہ قریب ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمسایہ سے حسن سلوک کیا جائے اور خوشگوار تعلقات قائم کئے جائیں تاکہ انسان اس کے ضرر سے محفوظ رہے۔

۲ قرآن وسنت میں تاکید: ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک اور اس کے حقوق ادا کرنے کی قرآن پاک میں بھی تاکید آئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ (النساء) اور رشتہ دار ہمسایہ اور اجنبی ہمسایہ اور ہم مجلس کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین ہے اور اس کے حقوق کی اہمیت بیان فرمائی ہے آپؐ نے فرمایا جسے یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسولؐ اس سے محبت کریں یا جسے خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت کا دعویٰ ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے (مشکوٰۃ)

آپؐ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کے حق میں بہترین ہے اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہترین ہے (ترمذی)

نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ حضرت جبرائیلؑ آکر مجھے پڑوسی کے بارے میں اتنی زیادہ تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان ہوا کہ وہ ہمسایہ کو وارث ٹھہرا دیں گے (بخاری و مسلم)

حقوق ہمسایہ کی ادائیگی پر آپؐ نے اس قدر تاکید کی کہ فرمایا "تمہیں کیا معلوم ہمسایہ کا کیا حق ہے خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ہمسایہ کے حقوق ادا کرنے کی توفیق اسے ہی نصیب ہوتی ہے اللہ

کی رحمت جس کے شامل حال ہو (بخاری) ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا قیامت کے روز سب سے پہلے جن کا مقدمہ پیش ہوگا وہ دو ہمسائے ہوں گے نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز کتنے ہی پڑوسی اپنے پڑوسیوں سے گلے پڑیں گے اور کہیں گے کہ انہوں نے ہم پر بھلائی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

ہمسایہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسایہ کو انسانی اخلاق کی کسوٹی قرار دیا ہے ایک مرتبہ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہمارے اعمال اچھے ہیں یا بُرے ؟ آپؐ نے فرمایا کہ جب تم ہمسایہ کو اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ تمہارے اعمال اچھے ہیں اور جب بُرا کہتے سنو تو سمجھو کہ تمہارے اعمال بُرے ہیں۔

حقوق ہمسایہ

اسلامی تعلیمات کی رو سے ہمسایہ کے مندرجہ ذیل حقوق ثابت ہوتے ہیں۔

ا۔ حسن سلوک :- ہمسایہ کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ عمدہ سلوک کیا جائے اور خوشگوار تعلقات قائم کئے جائیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ اپنے پڑوسی سے حسن سلوک کرے"۔

ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کی دل داری کی جائے اور اسے کبھی بھی ناراضگی کا موقع نہ دیا جائے بلکہ اسے دکھ، تکلیف اور ایذا پہنچانے سے اجتناب کیا جائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے (بخاری) ایک دوسری حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ ہمسایہ کو ستانے اور تکلیف دینے والا دوزخ میں جائے گا۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ فلاں عورت نمازیں تو بہت پڑھتی ہے روزے بھی بہت رکھتی ہے اور خیرات بھی خوب کرتی ہے لیکن اس کی بدزبانی سے پڑوسی دکھی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ دوزخی ہے۔ پھر عرض کیا گیا کہ ایک دوسری عورت ہے جو نماز روزہ واجبی طور پر ادا کرتی ہے اور ضروری صدقہ بھی دیتی ہے لیکن وہ پڑوسیوں کے حق میں بدزبان نہیں۔ آپؐ نے فرمایا وہ جنت میں جائے گی۔ (مشکوٰۃ)

ایک مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں خدا کی قسم وہ مومن نہیں

خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ کون؟ فرمایا وہ شخص جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہیں (بخاری ومسلم)

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ پڑوسی کو اپنی دیوار پر شہتیر یا لکڑی ڈالنے سے مت روکو اور اپنا مکان اتنا اونچا نہ بناؤ کہ اس کے مکان میں ہوا کا داخلہ بند ہو جائے ہاں اگر وہ اجازت دے تو ٹھیک ہے۔

۲ صبر و تحمل: اسلام صرف ہمسایہ کو ضرر پہنچانے سے ہی نہیں روکتا بلکہ یہ بھی تقاضا کرتا ہے کہ اگر ہمسایہ کی جانب سے تکلیف پہنچے تو اس سے درگذر کیا جائے اور صبر و تحمل کا اظہار کیا جائے۔ ابتدائے اسلام میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کافر پڑوسی اس حد تک تنگ کرتے تھے کہ آپؐ کے گھر جا کر ہنڈیا میں گندگی ڈال دیتے تھے لیکن آپؐ اس سے زیادہ کچھ نہ کہتے کہ اے بنو عبد مناف! یہ کیسی ہمسائیگی ہے؟

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ صبر کرو۔ اس کے بعد وہ پھر شکایت لے کر آئے آپؐ نے پھر وہی نصیحت کی۔ تیسری مرتبہ وہ پھر وہی شکایت لائے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ اور اپنا سامان راستے میں ڈال دو جیسے گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ گزرنے والوں نے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے؟ تو انہوں نے پڑوسی کی بدسلوکی کا ذکر کیا۔ لوگوں نے پڑوسی کو برا بھلا کہا۔ وہ ان صحابیؓ کے پاس آیا اور کہا اب آپ مکان میں چلیں آئندہ مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو گی (ابو داؤد)

۳ امداد و اعانت: ہمسایہ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کی ضروریات کا خیال رکھا جائے اور ہر ضرورت میں اس کی امداد و اعانت کی جائے۔ اگر بھوکا ہو تو کھانا کھلایا جائے ضرورت مند ہو تو قرض دیا جائے۔ بیمار ہو تو عیادت کی جائے حتی کہ اگر فوت ہو جائے تو اس کے جنازے کے ہمراہ جایا جائے مختصر یہ کہ اس کے ہر رنج و غم میں شرکت کی جائے اور اس کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس ضمن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث مروی ہیں۔ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ "اگر ہمسایہ تجھ سے قرض مانگے تو اسے قرض دے اگر تجھ سے اعانت طلب کرے تو اس کی اعانت کر اور اگر اسے کوئی اور احتیاج و ضرورت ہو تو وہ بھی پوری کر۔"

ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ شخص کامل مومن نہیں جو خود تو سیر ہو کر کھائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہے" (مشکوٰۃ) ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاریؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب تم سالن پکاؤ تو اس میں پانی ذرا زیادہ ڈال دو اور اس میں سے کچھ پڑوسی کے گھر بھیج دو" (مسلم)

ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ "اگر ہمسایہ بیمار ہو تو اس کی تیمارداری کرو" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "اگر ہمسایہ مرجائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جائیے"

۴۔ تحفے تحائف: ہمسایہ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ وقتاً فوقتاً انہیں تحفے تحائف بھیجے جائیں کیونکہ اس طرح آپس میں الفت و محبت پیدا ہوتی ہے اور تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنے ہمسائے کو تحفے تحائف بھیجتے رہو اور اپنی خوشی کے موقعوں پر اسے بلایا کرو۔

ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تو میوہ خریدے اور استطاعت ہو تو پڑوسی کے گھر بھی بھیج اور اگر نہیں بھیج سکتا تو پوشیدہ رکھ۔ تیرے بچوں میں سے کوئی اس پھل کو باہر لے کر نہ نکلے تاکہ پڑوسی کے بچوں کو تکلیف نہ ہو۔ ہدیہ بیش قیمت چیز کا ہی بھیجنا ضروری نہیں بلکہ حسب استطاعت کوئی چیز بھی بھیجی جاسکتی ہے۔ کسی معمولی چیز کو ہدیہ بھیجتے ہوئے یا لیتے ہوئے عار و تردد نہیں ہونا چاہیئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان عورتوں سے ارشاد فرمایا کہ "تم میں سے کوئی پڑوسن کو ہدیہ دینے کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ وہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو" (بخاری و مسلم)

۵۔ تحفظ مال و عزت: ہمسایوں کا ایک حق یہ بھی ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا پاس کیا جائے۔ نہ خود کوئی ایسی بات کی جائے جس سے ان کی عزت پر حرف آئے اور نہ ہی کسی دوسرے کو ایسا کرنے دیا جائے۔ نیز پڑوسیوں کے جان و مال کا خیال رکھا جائے اور ان کی عدم موجودگی میں حفاظت کی جائے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "زنا حرام ہے اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسے حرام کیا ہے لیکن سب بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا ہے لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑا یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر میں چوری کرے۔

ثمرات و فوائد

حقوق ہمسایہ کی ادائیگی کے بہت سے فوائد ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں۔

۱۔ صحیح معاشرے کی تشکیل: حقوق ہمسایہ کی ادائیگی سے لوگوں کے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعلقات خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ رنج و راحت اور خوشی و مسرت میں

وہ ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور باہم امداد و تعاون کرتے ہیں۔ اس طرح بہت سے کٹھن معاملات باآسانی حل ہو جاتے ہیں۔ باہمی تنازعوں اور جھگڑوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ غریب، نادار اور حاجتمند لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح ایک صحیح اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں معاونت حاصل ہوتی ہے

۲۔ خدا اور رسول کی رضا:۔ ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک سے خدا اور اس کے رسولؐ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے جو اصل مدعائے حیات ہے اور انسان کی اخروی نجات کا موجب ہے چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسولؐ اس سے محبت کرے اسے چاہیئے کہ وہ پڑوسی کا حق ادا کرے (مشکوٰۃ)

شہری

مفہوم:

شہری کے لئے عربی زبان میں "مدنی" اور "حضری" کے الفاظ مستعمل ہیں اور اس کے لغوی معنی شہر کا رہنے والا ہیں۔ لیکن اصطلاح میں اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جو کسی مملکت یا ریاست کا باشندہ ہو۔ خواہ وہ شہر میں رہتا ہو یا قصبہ میں، دیہات میں رہتا ہو یا خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتا ہو۔ وہ ہر جگہ شہری متصور ہو گا۔

شہری کے لئے رنگ و نسل اور قوم و مذہب کی بھی کوئی قید نہیں بلکہ ایک مملکت کے تمام باشندے خواہ کسی رنگ، نسل، قوم اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ شہری کہلاتے ہیں۔ البتہ اسلامی حکومت میں غیر مسلم شہری کو ذمی کا نام دیا جاتا ہے۔

اہمیت

انسان مدنی الطبع ہے اور انسانی معاشرے کا قیام ناگزیر ہے، معاشرتی زندگی کی ابتدا گھر یا خاندان سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد اقارب اور ہمسایہ کے دائروں میں وسیع ہوتے ہوتے "شہری" کے دائرے میں پوری وسعت اختیار کر لیتی ہے۔

شہری کو معاشرے کی تشکیل اور ریاست کے قیام میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ کیونکہ ریاست یا مملکت کی نہ صرف تشکیل بلکہ کامیابی کا بھی انحصار اچھے شہریوں پر ہوتا ہے۔ شہریوں کے تعاون کے بغیر امور ریاست سرانجام نہیں دئیے جا سکتے۔ شہری اگر حساس، ذی فہم، حقوق و فرائض سے آشنا اور اچھے کردار کے حامل ہوں تو لازماً ایسی ریاست بہترین ہو گی اور اگر شہری نیک سیرت اور اعلیٰ اخلاق کے حامل نہ ہوں تو ریاست بھی اچھی نہ ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ شہری اور ریاست لازم و ملزوم ہیں۔

حقوق و فرائض

حقوق شہری سے مراد وہ مراعات ہیں جو ایک شخص کو کسی مملکت یا ریاست کا فرد ہونے

کی حیثیت سے حاصل ہوں اور فرائض شہری سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو کسی شخص پر کسی ریاست یا مملکت کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے لازم آتی ہوں۔

شہری کے حقوق: اسلامی ریاست میں شہری کے حقوق کو مندرجہ ذیل شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(ا) مذہبی (ب) معاشی (ج) معاشرتی (د) سیاسی

مذہبی حقوق

۱۔ آزادیٔ عقیدہ: اسلام تمام بنی نوعِ انسان کو مکمل آزادی مذہب و دین عطا کرتا ہے اور ہر ایک کو اختیار دیتا ہے کہ وہ جو بھی عقیدہ یا مذہب چاہے اختیار کرے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ ۲۵۶) دین میں کوئی جبر نہیں۔

اسلام رواداری سکھاتا ہے اور دوسرے عقائد و مذاہب کا وجود برداشت کرنے کی تعلیم دیتا ہے تاکہ تقابل کا پہلو موجود رہے اور اسلام کی فوقیت و برتری ثابت ہوسکے چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد اہل مدینہ کے ساتھ میثاقِ مدینہ طے کیا تو اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ تمام باشندگان کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔

اسلامی حکومت نہ تو خود کسی کو تبدیلیٔ عقیدہ و مذہب پر مجبور کرسکتی ہے اور نہ ہی اس کے بعض افراد دوسروں پر تبدیلی مذہب کے لئے دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں مختلف فقہی مسالک سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے اپنے نظریات پر قائم رہ سکتے ہیں اور کسی کو اپنا نظریہ یا عقیدہ بدلنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا البتہ تبلیغ و ترغیب کے ذریعے ہر شخص یا گروہ اپنے عقیدہ و مذہب کی طرف دوسروں کو مائل کرسکتا ہے۔ بلکہ حکومت غیر مسلموں کو تبلیغ دین کا حق دیتی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی واضح رہے کہ عقیدہ و مذہب اختیار کرنے کی بے شک آزادی ہے لیکن اس امر کی ہرگز اجازت نہیں کہ جب کسی کا جی چاہے اسلام قبول کرلے اور جب جی

چاہے اسے چھوڑ دے۔ بلکہ اگر کوئی اسلام کو قبول کرنے کے بعد اسے چھوڑ دے یعنی مرتد ہو جائے تو وہ سزا کا مستوجب ہوگا کیونکہ اس نے مسلمانوں میں بددلی اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۰۔ آزادی عبادت: عقیدہ و مذہب کی طرح اسلامی ریاست کے ہر شہری کو عبادت کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے۔ یعنی ہر شہری جس طرح چاہے اپنے مذہب و عقیدہ کے مطابق عبادات اور مذہبی رسومات کو انجام دے سکتا ہے۔ حکومت یا کسی دوسرے شخص کو اس میں دخل اندازی کا حق حاصل نہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے پیرؤوں کو بھی اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر کی پوری آزادی حاصل ہے اور ان کی تمام عبادت گاہوں اور مذہبی مقامات کے تقدس و احترام کو برقرار رکھا جائے گا بلکہ اسلامی حکومت ان کے تحفظ کی بھی ذمہ دار ہے۔ اسی احتیاط کے پیش نظر فتح بیت المقدس کے موقع پر حضرت عمرؓ نے عیسائیوں کے گرجا میں نماز ادا کرنے سے احتراز کیا مبادا ان کے ایسا کرنے سے مسلمان غیر مسلموں کے معبدوں کو مسجدوں میں بدلنے کا جواز پیدا نہ کرلیں۔

معاشی حقوق

۱۔ آمد و خرچ کا حق: ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ریاست کے تمام معاشی ذرائع سے استفادہ کرے اور اپنی آمد کو اپنی مرضی و منشاء کے مطابق خرچ کرے بشرطیکہ آمد و خرچ دونوں کے ذرائع جائز ہوں مثلاً ڈاکہ، چوری، جوا اور دھوکا دہی وغیرہ سے دولت حاصل نہ کی جائے اور زنا، شراب وغیرہ حرام جگہوں پر اسے خرچ نہ کیا جائے۔

حصول معاش کے لئے کسی شخص کو کوئی خاص پیشہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا بلکہ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور ملازمت وغیرہ میں سب شہریوں کو مساوی مواقع میسر ہوتے ہیں اور کسی کو اجارہ داری قائم کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ادنیٰ و علیٰ ملازمتوں کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوتے ہیں اور ہر شخص کو محض اس کی ذاتی اہلیت و صلاحیت کے مطابق ملازمت مہیا کی جاتی ہے۔

حق روزگار:- اسلامی ریاست کے ہر شہری کا حق یہ بھی ہے کہ اسے روزگار مہیا کیا جائے۔ ہر شہری کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنا روزگار خود کما سکے اور ہر ایک کو اس کی استعداد و قابلیت کے مطابق ذریعہ معاش مہیا کیا جائے۔ الغرض کسی شخص کو بے کار و بے روزگار نہ رہنے دیا جائے اور اگر کسی کو کام نہ مل سکے تو حکومت اپنے بیت المال سے اس کی بنیادی ضروریات پوری کرے۔

معاشرتی حقوق

۱۔ حق زندگی:- اسلامی ریاست کے ہر شہری کو آزاد و پر امن زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ کسی شخص کو نہ تو غلام بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی قید میں رکھا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ بغیر اثبات جرم حکومت بھی کسی کو قید میں نہیں ڈال سکتی۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کر دے تو اسلام قصاص کا مطالبہ کرتا ہے۔ الغرض ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ حکومت اس کی زندگی کی محافظ ہو۔

۲۔ حق عزت و آبرو:- معاشرتی اعتبار سے تمام شہری مساوی عزت کے مستحق ہیں، اور ہر ایک پر دوسرے کا احترام یکساں لازم آتا ہے۔ اس لئے کوئی شخص کسی دوسرے کو نہ تو گالی دے سکتا ہے۔ نہ ہی اس کی بے عزتی کر سکتا ہے اور نہ ہی بہتان طرازی کر سکتا ہے اور اگر کوئی ایسا کرے تو قانون کی نگاہ میں سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مسلمانوں پر ایک دوسرے کی ہتک عزت حرام ہے۔

۳۔ حق مساوات:- اسلامی ریاست کے ہر شہری کو قانون کی نگاہ میں مساوات و برابری حاصل ہے۔ عدالت کے سامنے مسلم و غیر مسلم، آقا و غلام، امیر و غریب کا کوئی تفاوت نہیں۔ سب کے لئے یکساں قانون ہے اور سبھی برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خلافت علیؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ کی گم شدہ زرہ ایک یہودی کے پاس دیکھی گئی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ خلیفۃ المسلمین اور یہودی عدالت میں برابر کھڑے ہوئے۔ عدم شہادت کی بنا پر فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف دیا گیا۔ لیکن آپ نے برا منایا نہ کیا اس بات سے یہودی اتنا متاثر ہوا کہ اسلام

لے آیا۔ تاریخ اسلام میں اس قسم کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں کہ عدالت کے سامنے شاہ و گدا ایک ہی حیثیت سے پیش ہوئے۔

۴۔ **حق ملکیت:** ہر شہری کو ریاست میں جائداد رکھنے کا بھی حق حاصل ہے۔ یعنی ہر شخص اس بات کا مجاز ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جائداد خریدے، رکھے۔ اس سے استفادہ کرے اور بوقت ضرورت فروخت بھی کرے۔

ہر شہری کا یہ حق بھی ہے کہ اس کو رہائش کے لیے مکان حاصل ہو۔ اگر کوئی شخص خود مکان حاصل نہیں کر سکتا تو حکومت کا فرض ہے کہ اس کی رہائش کا انتظام کرے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا مکان حادثہ وغیرہ سے تباہ ہو جائے تو اس کا متبادل انتظام بھی حکومت کے ذمہ ہے۔

نیز ہر شخص کی جائداد و مال کا تحفظ کا ذمہ بھی حکومت پر عائد ہوتا ہے۔

۵۔ **حق معاہدات:** اسلامی ریاست کے ہر شہری کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ باہمی معاملات کے متعلق معاہدے کر سکے۔ باہمی مفاہمت سے دونوں فریق ان معاہدوں کو منسوخ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایک معاہدہ توڑنے پر رضامند نہ ہو تو وہ دوسرے سے اپنا حق طلب کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسا معاہدہ نہ کیا جائے جو شریعتِ اسلامیہ یا حکومت کی سالمیت اور مفادِ عامہ کے منافی ہو۔ مثلاً غلاموں کی تجارت۔ اغوا اور منشی اشیاء کی خرید و فروخت وغیرہ۔

۶۔ **حق تعلیم:** ہر شہری کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ اسے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے مواقع میسر کئے جائیں۔ ہر شہری کے لئے ابتدائی تعلیم مفت ہونی چاہیئے اور ذہین و قابل افراد کے لیے اعلیٰ تعلیم کا بھی معقول انتظام ہونا چاہیئے۔ اسلام دینی و دنیاوی دونوں قسم کی تعلیم کا مطالبہ کرتا ہے اس لئے نصابِ تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جو دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم پر حاوی ہو

سیاسی حقوق

۱۔ **حق رائے دہی:** اسلامی ریاست میں ہر شہری حکومت میں حصہ دار ہوتا ہے اور حکومت کی تشکیل اور انتظام میں رائے دینے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ اسلامی

حکومت شوریٰ کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ جس کی تشکیل کے لئے ہر عاقل و بالغ کو رائے دہی کا حق ہے اور اس معاملہ میں کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی ریاست میں قوانین کے ماخذ کتاب و سنت اور اجتہاد ہیں۔ کتاب و سنت کے احکام تو طے ہیں لیکن اجتہاد کا حق صرف علماء اور فقہا کو حاصل ہے۔ البتہ بعض عام ضرورتوں اور رسم و رواج کے متعلق امور میں عوام کو بھی رائے دینے کا حق حاصل ہے۔

۲۔ حق منصب: ہر شہری کو یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ حسب استعداد و قابلیت حکومت کے کسی منصب پر فائز ہو سکے۔ اس میں کسی قسم کا امتیاز روا رکھنا درست نہیں۔ البتہ سربراہ حکومت کے عہدہ کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے۔ باقی عہدوں کیلئے منصب کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے قابلیت کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

۳۔ حق محاسبہ: ہر شہری کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ حکومت کے کاموں کا محاسبہ کرے اور حکومت کے سربراہ اور اس کے مشیروں پر تعمیری تنقید کر سکے۔ اسلامی نقطہ نظر سے حکومت اپنے امور کے لیے نہ صرف خدا تعالیٰ بلکہ عوام کے سامنے بھی جواب دہ ہوتی ہے۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے خطبہ خلافت میں عوام کے اس حق کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا "لوگو! اگر میں کتاب و سنت پر عمل کروں تو میری پیروی کرنا اور اگر اس سے بھٹک جاؤں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں" حضرت عمرؓ نے بھی ایک مرتبہ لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "لوگو! مجھ پر تمہارے متعدد حقوق ہیں جن کے بارے میں تمہیں مجھ سے باز پرس کرنی چاہئے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے مجلس میں بار بار آپ کو ٹوکا۔ دوسرے شخص نے اسے روکنا چاہا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اسے کہنے دو۔ اگر عوام ہمیں نہ ٹوکیں تو ان کا وجود بے کار ہے اور اگر ہم ان کی نہ سنیں تو ہم بے مصرف ہیں"۔

حکومت کا محاسبہ کرنے کے لیے ہر شہری کو تحریر و تقریر کی مکمل آزادی حاصل ہے عوام اخبارات و رسائل کے ذریعے حکومت پر تنقید کر سکتے اور مشورے دے سکتے ہیں۔ اسی طرح زبانی تنقید و مشورہ کے لیے عوام کے اجتماعات بھی منعقد کئے جا سکتے ہیں۔ اس

ضمن میں یہ بات مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ تنقید تعمیری ہو اور اس کا انداز بھی پر امن ہو۔ فتنہ و فساد اور بدامنی پھیلانا مقصود نہ ہو۔

فرائض شہری

اسلامی مملکت میں ہر ایک شہری پر حسب ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔

۱۔ **اطاعت و تعاون:** اسلامی ریاست کے ہر شہری کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ حکومت وقت کی اطاعت کرے اور اس کے ہر معاملے میں تعاون کا ثبوت دے۔

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (النساء ۵۹)

اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے حاکم ہو اس کی اطاعت کرو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں خدا سے تقویٰ رکھنے کی اور حکومت کا حکم سننے اور بجالانے کی چاہے کوئی غلام تم پر امیر ہو جائے۔ آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے کہ "جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی۔ اُس نے میری نافرمانی کی" (بخاری و مسلم)

ہر شہری پر لازم ہے کہ وہ حکومت کے تمام قوانین کی بھی پابندی کرے اور ملک میں امن وامان قائم کرنے اور اس کی ترقی و سلامتی کے لئے ہر قسم کے ایثار و قربانی سے دریغ نہ کرے۔ ذمیوں پر یہ بھی لازم ہے کہ انہوں نے حکومت سے جو معاہدات کر رکھے ہوں ان کی پابندی کریں۔

۲۔ **محصولات کی ادائیگی:** اسلامی مملکت میں ہر شہری کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ حکومت کے عائد کردہ محصولات کو باقاعدگی سے ادا کرے۔ بعض محصول مذہبی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً زکوٰۃ، عشر وغیرہ ان کا ادا کرنا خدا اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کا بھی موجب

ہے۔ اس کے علاوہ بعض محصول حکومت نظم و نسق چلانے ، رفاہِ عامہ کے کاموں اور دیگر ضروریات کے لئے بھی عائد کر سکتی ہے۔ ایک شہری کے لئے ان تمام محصولات کا برضا و رغبت ادا کرنا ضروری ہے تاکہ حکومت کے کاموں میں خلل واقع نہ ہو۔ ذمیوں پر یہ بھی لازم ہے کہ اگر وہ فوجی خدمت انجام نہ دیتے ہوں تو حکومت کو جزیہ بطور حق حفاظت جزیہ ادا کریں۔

۳۔ خدمتِ خلق: ہر شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ملک و قوم کی بے لوث خدمت کرے اور اپنے فارغ اوقات کو عوام کی خدمت میں صرف کرے۔ اپنی جائز ضروریات پوری کرنے کے بعد جو رقم بچے اس میں سے کچھ حصہ خدمت خلق کے کاموں میں خرچ کرے مثلاً سکول، ہسپتال، خیرات خانوں کے قیام میں رقم خرچ کرے۔

۴۔ فرض شناسی: شہری کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ فرض شناس ہو۔ اپنے اور دوسروں کے حقوق و فرائض سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اپنے پر ہمیشہ دوسروں کے حقوق کو ترجیح دے اور محض حقوق کا طلبگار ہونے کی بجائے فرائض کی انجام دہی پر توجہ دے۔ کیونکہ اسی پر معاشرے کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔

اچھے شہری کے اوصاف

اسلامی نقطہ نظر سے ایک اچھے شہری کے اہم اوصاف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ نیک سیرت: ایک اچھے شہری کے لیے ضروری ہے کہ نیک سیرت، عمدہ صفات اور اعلیٰ اخلاق کا مالک ہو۔ عبادت گذار، متقی و پرہیزگار ہو یا بالفاظ دیگر ایک اچھا انسان ہو۔

۲۔ پابند قانون: اچھے شہری کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ حکومت کا فرمانبردار ہو اور حکومت کے عائد کردہ احکام و قوانین کی پوری طرح پابندی کرتا ہو۔

۳۔ فرض شناسی: اچھے شہری کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ فرض شناس ہو۔ اپنے فرائض کو پہچانے اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری کرے۔

۴۔ مبلغ: ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کو نیکی کی تبلیغ کرتا ہو اور برے کاموں سے

روکتا ہو یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرتا ہو۔

۵۔ باشعور: ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ باشعور ہو، حکومت کے معاملات میں دلچسپی لیتا ہو اور حکام کو ضروری معاملات میں اپنی تجاویز دے۔

۶۔ روادار: اچھے شہری کے لیے رواداری ہونا بھی ضروری ہے یعنی دوسروں کے افکار و خیالات اور عقائد وغیرہ کو برداشت کرنے۔ مخالفین کے اعتراضات کو حوصلہ سے سنے اور ملکی مفاد پر اپنی خواہشات کو قربان کر دے۔

۷۔ محنتی: اچھے شہری کے لیے محنتی ہونا نہایت ضروری ہے یعنی اس میں اپنے ذاتی اور قومی امور کو انتہائی محنت و جانفشانی سے انجام دینے کا جذبہ ہونا چاہیئے۔

۸۔ صفائی پسند: اچھے شہری کے لئے ضروری ہے کہ وہ صفائی پسند ہو۔ اور حفظانِ صحت کے اصولوں کا پورا پورا خیال رکھتا ہو۔

۹۔ امن پسند: اچھے شہری کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ امن پسند ہو۔ صلح و صفائی کی زندگی بسر کرتا ہو اور لڑائی جھگڑا، فساد وغیرہ سے اجتناب کرتا ہو۔

ریاست

مفہوم: ریاست کا لفظ "راس" سے ماخوذ ہے جس کے معنی "رئیس" سوار یا حاکم ہیں اور ریاست سے مراد زمین کا وہ مخصوص خطہ یا علاقہ ہے۔ جہاں لوگ کسی خاص نظام حکومت کے تحت زندگی بسر کرتے ہوں۔ ریاست کے قیام کے لیے ایسی حکومت کا ہونا لازمی ہے جو ملک کے اندرونی و بیرونی معاملات میں مکمل اختیار رکھے۔ گویا ریاست کے چار ضروری عناصر ہیں:

(۱) آبادی یعنی لوگوں کا وجود۔ (۲) علاقہ یعنی جگہ جہاں لوگ آباد ہوں۔
(۳) حکومت یعنی اصلاح و فلاح کے لیے تنظیم (۴) اقتدارِ اعلیٰ یعنی حکومت کے کلی اختیارات
لہٰذا وہ جگہ ریاست نہیں کہلا سکتی جہاں ان چاروں عناصر میں سے کسی ایک کا بھی فقدان ہو۔

اسلامی ریاست سے مراد زمین کا وہ حصہ یا خطہ ہے جہاں اسلام کے قوانین نافذ ہوں اور اقتدارِ اعلیٰ خدا تعالیٰ کو حاصل ہو۔ ایسی ریاست کو خلافت یعنی خدا تعالیٰ کی نیابت بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں لوگوں کو اختیار صرف قوانین کے نفاذ کا ہوتا ہے اور قوانین بنانے کا اختیار صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے۔

۲۔ اقتدارِ اعلیٰ کا منصب: اصطلاحِ شریعت میں اسلامی ریاست یا حکومت کو "خلافت" اور اس کے سربراہ کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ خلافت کے لیے امامت

اور امارت کے الفاظ بھی مستعمل ہیں۔ اور انہی کی نسبت سے خلیفہ کو امام اور امیر بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن امارت اور امامت میں عمومیت ہے اور خلافت کا لفظ خاص مفہوم رکھتا ہے اور یہ صرف اسی امامت یا امارت کے لئے استعمال ہوتا ہے جو آنحضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل کی پیروی میں قائم کی گئی ہو۔

خلیفہ کے معنی نائب اور جانشین کے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ؕ (البقرۃ ۳۰)	بے شک میں تمہیں زمین میں نائب مقرر کرنے والا ہوں۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (الانعام: ۱۶۵)	اور وہی ہے جس نے تمہیں دنیا میں نائب مقرر کیا

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انسان بحیثیت مجموعی زمین پر خدا تعالیٰ کا خلیفہ یعنی نائب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اختیارات کو تصرف میں لا کر اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے۔ پس انسان کو چونکہ نیکی و بدی کا اختیار حاصل ہے اس لئے اسے نیکی کی طرف مائل کرنے اور برائی سے روکنے کے لئے کچھ قواعد و ضوابط مقرر کر دئیے گئے اور ان کی پابندی کرانے کے لیے بھی انسان ہی کو منتخب کیا گیا ہے گویا انسان خود ہی محکوم اور خود ہی حاکم ہے لیکن حاکم اعلیٰ نہیں بلکہ نائب حاکم یعنی خلیفہ ہے جاکم اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے جسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔ اس خلافت کے حقدار صرف وہی لوگ ہیں جو خدا پر ایمان رکھتے ہوں اور نیک اعمال کرتے ہوں جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۵۵)	اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک اعمال کئے کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو بنایا۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خلافت کا حق پوری ملتِ اسلامیہ کو عطا ہوا ہے لیکن ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لئے ملت کے افراد باہمی مشورہ سے اپنے کچھ اختیارات ایک دین دار اور اہل شخص کو سونپ دیتے ہیں جو اصطلاحاً ساری قوم میں خلیفہ کہلاتا ہے۔

اسلامی ریاست میں اصل حاکم اعلیٰ خدا تعالیٰ ہے اور خلیفہ کو ایک مخصوص دائرہ کار میں تصرف کا اختیار حاصل ہے جو اس کا ذاتی نہیں بلکہ خدا کا عطا کردہ ہے اس لئے اس کا وہی تصرف جائز ہے جو خدا کی مقررہ حدود کے مطابق ہو۔ اس نیابت کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ خلیفہ اپنے ہر قول و فعل کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

اہمیت

اسلامی ریاست کے قیام کی اہمیت مندرجہ ذیل باتوں سے واضح ہوتی ہے۔

1۔ حقوق کی حفاظت: کسی معاشرہ کے افراد کے حقوق کی حفاظت و نگہداشت کے لئے ریاست کا وجود ضروری ہے۔ ریاست قوم کو ایک اجتماعی تنظیم میں منسلک کرتی ہے اور یہی تنظیم جسے حکومت کا نام دیا جاتا ہے لوگوں کے حقوق کا تحفظ کرتی ہے۔ ان کے جان مال اور عزت و آبرو کا خیال رکھتی ہے اور ملکی نظم و نسق اور امن و امان قائم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کو بیرونی حملوں اور خدشوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ریاست کا قیام عمل میں نہ لایا جائے تو کسی قوم میں وحدت پیدا نہیں ہو سکتی اور زندگی کے ہر شعبہ میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ کبھی بھی دنیا میں باعزت مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

۲۔ قومی تعمیر و ترقی: ریاست کے قیام سے قوم تعمیر و ترقی کے راستے پر گامزن ہوتی ہے کیونکہ حکومت اپنے تمام وسائل کو ایک تنظیم میں لا کر اجتماعی قوت کے ذریعے قومی ترقی کے منصوبے تیار کرتی ہے اور سب افرادِ قوم باہم مل کر ان منصوبوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ان منصوبوں کو سرانجام دینا کسی ایک فرد کے بس کا روگ نہیں بلکہ حکومت ہی یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا سکتی ہے۔ اسلام سے قبل عرب کا معاشرہ ایک منظم حکومت کی عدم موجودگی کی بنا پر انتہائی پستی کی حالت میں تھا لیکن اسلام نے ریاست کے قیام سے اس معاشرے کو

نسقی دے کر بام عروج پر لا کھڑا کیا۔

۳۔ قرآن و سنت میں تاکید: ریاست کے قیام کی قرآن اور سنت نبوی میں تاکید موجود ہے۔ قرآن پاک میں خدا اور رسول کے بعد اطاعت امیر کو واجب قرار دیا گیا ہے اور ریاست کے قیام کے بغیر کسی امیر اور اس کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (نساء ۵۹)	اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو امیر ہو اس کی اطاعت کرو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی (مشکوٰۃ) ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی حاکم ہو جائے اور کتاب اللہ کے بموجب حکم چلائے تو اس کی بات سنو اور حکم مانو (مشکوٰۃ)۔ آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے کہ حکومت کا سربراہ ڈھال ہوتا ہے جس کی اوٹ میں دشمن سے جنگ کی جاتی ہے اور بچاؤ کیا جاتا ہے (مشکوٰۃ)۔ نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اس حال میں مرے کہ اس کے گلے میں کسی امام کی بیعت نہ ہو تو وہ کفر کی موت مرتا ہے۔

اسلامی حکومت کے فرائض

اسلامی حکومت کے فرائض سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو کسی اسلامی ریاست میں حکومت پر رعایا کے لئے عائد ہوتی ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر: اسلامی حکومت کا اولین فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی نیکیوں کو فروغ دینا اور برائیوں کا استیصال کرنا ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں نیکی کی اشاعت و تبلیغ کے لئے اپنے وسائل بروئے

کارلائے اور برائی اور فتنہ وفساد کو مٹانے کے لئے ہر وقت کوشاں رہے۔ کسی قوم کی قوت و طاقت کا انحصار اخلاق پر ہوتا ہے اگر کسی قوم کے اخلاق پست ہو جائیں تو نہ وہ قوم خود زندہ رہ سکتی ہے اور نہ ہی حکومت زندہ رہنے کی حقدار ہوتی ہے بلکہ خدا تعالیٰ کا عذاب اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا ہے۔ لہٰذا حکومت کو چاہیئے کہ وہ اپنے عوام کے اخلاق کی نگہداشت کرے۔ نیک کاموں کی تلقین کرے اور برائیوں کا سدِّ باب کرے۔

۲۔ تحفظ جان و مال: حکومت کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور ملک سے قتل، چوری، ڈاکہ، غنڈہ گردی وغیرہ کو دور کرے۔ ملک کے ہر فرد کا مال و اسباب محفوظ ہونا چاہیئے۔ لوگوں کی زندگی اور عزت و ناموس کو بھی تحفظ حاصل ہونا چاہیئے۔ شر و فساد پھیلانے والوں کو قرار واقعی سزائیں ملنی چاہئیں۔ اور اگر کسی شخص کی جان و مال اور عزت و ناموس کو نقصان پہنچے تو اس کی مناسب تلافی ہونی چاہیئے۔ اس غرض کے لئے پولیس کا خاطر خواہ انتظام بھی ضروری ہے تاکہ امن دشمن عناصر کا خاتمہ کیا جا سکے۔

۳۔ حفاظت بیت المال: اسلامی حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ قومی خزانہ یعنی بیت المال کی حفاظت کرے اور اس قومی امانت میں خیانت نہ ہونے دے۔ بیت المال کی آمد کو ریاست انتظاماتِ رعایا کی فلاح و بہبود اور دیگر جائز ضروریات پر خرچ کرے۔ نیز آمد و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھے۔ اس ضمن میں خلفائے راشدینؓ اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی روشن مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ انہوں نے کس انداز سے بیت المال کی حفاظت کا انتظام کیا۔

۴۔ قومی و ملکی دفاع: اسلامی حکومت پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ قوم و ملک کی سالمیت اور بقاء کے لئے کوشاں رہے اور اندرونی و بیرونی دشمنوں سے ریاست کا دفاع کرے۔ اس غرض کے لئے حکومت کو چاہیئے کہ بری، بحری اور ہوائی افواج کا قیام عمل میں لائے جو پوری طرح سے اسلحہ سے لیس ہوں اور ملکی سرحدوں کی حفاظت پر مامور ہوں۔ اس کے علاوہ ملک کے ہر فرد کو سپاہیانہ تربیت بھی دی جانی چاہیئے تاکہ بوقت ضرورت

وہ اپنا دفاع کر سکے۔ نیز حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ دیگر ممالک سے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات قائم رکھے تاکہ امن عالم کو استحکام حاصل ہو۔

۵۔ قومی و ملکی ترقی: اسلامی حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ملک و قوم کو معاشی اور معاشرتی لحاظ سے ترقی کی راہ پر گامزن کرے۔ اس غرض کے لئے تعلیمی، صنعتی زرعی اور تجارتی منصوبے بنائے اور عوام کو جدید معاشی و معاشرتی تقاضوں سے آگاہ کرے۔

۶۔ رعایا کی کفالت: اسلامی حکومت پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ رعایا کے ہر فرد کی ضروریات زندگی کا خیال رکھے اور ضرورت مند و محتاج لوگوں کی بیت المال سے کفالت کرے۔ اسلام میں زکوٰۃ کا ایک مصرف محتاجوں اور مسکینوں کی امداد کرنا بھی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "حکومت ہر اس شخص کی ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ "جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً بے سہارا کنبہ یا قرض) چھوڑا تو وہ ہمارے ذمے ہے"۔ (بخاری و مسلم)

۷۔ عہدیداروں کا تقرر: حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ حکومت کے مختلف عہدوں پر موزوں ترین اشخاص کا تقرر کرے اور اس ضمن میں سفارش اقربا نوازی اور دیگر جذبات کو دخل نہ ہونا چاہیئے۔ درحقیقت کسی حکومت کی کامیابی کا دارومدار متقی و پرہیزگار اور امانتدار و دیانتدار حکام پر ہی ہوتا ہے اور اگر حکام ناکارہ، نااہل اور بددیانت ہوں تو حکومت کی سالمیت ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔

۸۔ ذمیوں کی نگہداشت: ذمّی سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جو اسلامی مملکت میں مستقلاً رہتے ہوں۔ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان کے خصوصی حقوق کی نگہداشت کرے۔ ذمیوں کو مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ یہ بھی معاشی اور معاشرتی مساوات کے حقدار ہوتے ہیں۔ ان کی جان مال اور آبرو کی حکومت محافظ ہوتی ہے اور عدالت کے سامنے مسلمان اور ذمی میں کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ البتہ ذمیوں کے ذاتی معاملات میں اسلامی حکومت مداخلت نہیں کرتی۔ ذمیوں کے لیے فوجی خدمت لازمی نہیں اس کے عوض انہیں ایک معمولی سا ٹیکس

ادا کرنا ہوتا ہے جسے جزیہ کہتے ہیں۔ جزیہ سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو فوجی خدمت انجام دینے کے قابل نہ ہوں مثلاً بوڑھے، معذور و بیمار وغیرہ یا وہ لوگ جو فوج میں شریک ہو جائیں۔ اس کے برعکس جو معذور د حاجتمند ہوں اسلامی حکومت انہیں بیت المال سے وظیفہ دیتی ہے۔

اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد

اسلام کے نقطۂ نظر سے ریاست کے قیام کا مقصد محض قوم کی اجتماعی تنظیم قائم کرنا ہی نہیں بلکہ اصل مقصد خدا تعالیٰ کی حاکمیت میں خلافت ارضی کا قیام ہے۔ انسان چونکہ اپنی محدود عقل وفہم سے اپنے برے بھلے میں تمیز نہیں کرسکتا اور صحیح قانون سازی کا اہل نہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے۔ خدا کی حاکمیت کو قرآن حکیم میں یوں واضح کیا گیا ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف: ۴۰) — حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهٗ لِلّٰهِ (آل عمران: ۱۵۴) — وہ پوچھتے ہیں کیا اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے۔ آپ کہہ دیجئے بیشک اختیارات تو سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۚ (المائدۃ ۴۵) — اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قوانین کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ حاکمیت فقط خدا تعالیٰ کی ہے اور ریاست کے قیام کا مقصد اسی حاکمیت کے تحت خلافت ارضی کو قائم کرنا ہے تاکہ خدا تعالیٰ کے قوانین

کا دنیا میں نفاذ کیا جا سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست کا سربراہ خلیفہ یعنی نائب خدا کہلاتا ہے کیونکہ وہ اپنی جانب سے قانون بنانے اور نافذ کرنے کا مجاز نہیں بلکہ وہ خدا کے نائب کی حیثیت سے اس کے قوانین کو ریاست میں نافذ کرتا ہے اور بطور فرض معاشرے سے برائیوں کا استیصال کر کے نیکیوں کو فروغ دیتا ہے ۔

درحقیقت خلافتِ اسلامیہ کے قیام کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے قوانین کا نفاذ کیا جائے اور لوگوں کو ان پر عمل کرنے کے لئے تبلیغ و تلقین، تعلیم و تربیت، ترغیب و تحدید اور حدود و تعزیرات کے ذریعے آمادہ کیا جائے تاکہ معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ ہو اور نیکیوں کا فروغ ہو اور انسانی زندگی میں خدا تعالیٰ کی منشا و رضا کے مطابق پاکیزگی اور ترقی و فلاح کا دور دورہ ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (الحج)	یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم دنیا میں ان کو حکومت عطا کر دیں تو یہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے ۔ نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے ۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات: اسلامی ریاست کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اسے دیگر اقسام حکومت سے نمایاں کرتی ہیں ۔ یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں :

۱۔ طرزِ حکومت: اسلامی طرزِ حکومت نہ تو دورِ حاضر کی جمہوریت ہے کہ جس میں عوام حکومت کا قانون بناتے ہیں اور اس میں رد و بدل اور ترک و اختیار کا پورا حق رکھتے ہیں اور نہ ہی یہ آمریت و بادشاہت ہے کہ جس میں ایک شخص مطلق العنان حیثیت رکھتا ہے ۔ وہی قانون بناتا ہے اور وہی اس میں رد و بدل کرتا ہے ۔ بلکہ اسلامی طرزِ حکومت پابند آئین بندگی ہے جس میں انسان خدا تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات کو اس کی ہدایات کے مطابق اس کی مقررہ حدود کے اندر رہ کر استعمال کرتا ہے ۔ اسلامی حکومت دراصل حکومت الٰہی ہوتی ہے کہ جس میں لوگ خدا کی حاکمیت کے تحت محدود عمومی حاکمیت اختیار کرتے ہیں جیسے

بالفاظِ دیگر خلافت کہا جاتا ہے۔

۲۔ دستور و آئین: اسلامی ریاست کے اصول و قوانین کا اولین سرچشمہ قرآن حکیم اور دوم سنت رسول اللہ ہے اور یہی وہ دستور و آئین ہے جس پہ اسلامی حکومت کی تشکیل ہوتی ہے۔ قرآن و سنت کے احکام جنہیں شریعت کہا جاتا ہے نہ تو بدلے جا سکتے ہیں اور نہ ہی منسوخ ہو سکتے ہیں۔ البتہ علماء و فقہاء قرآن و سنت کی روشنی میں مزید قوانین وضع کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ قرآن و سنت میں موجود نہ ہوں اور ان میں قرآن و سنت سے تجاوز بھی نہ کیا گیا ہو۔

۳۔ شوریٰ: اسلامی ریاست میں اگرچہ ہر فرد کو مشورہ دینے کا حق ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں آنحضور کو حکم دیا گیا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ — اور معاملات میں ان سے مشورہ کیجئے۔

اور مسلمانوں کے متعلق کہا گیا۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ — اور وہ اپنے معاملات میں باہمی مشورہ کرتے ہیں۔

لیکن حکومت کے لیے ہر فرد سے انفرادی طور پر مشورہ لینا ممکن نہیں۔ اس لئے ایک مجلس شوریٰ کی تشکیل ضروری ہے جو عوام کے منتخب کردہ اہل الرائے افراد پر مشتمل ہوتی ہے خلیفہ انتظام مملکت میں اس مجلس سے مشورہ حاصل کرتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ شوریٰ کے ہر فیصلہ پر عمل کرے بلکہ صرف وہی فیصلے قبول کئے جائیں گے جو قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے اور خلاف شریعت امور میں خلیفہ حق تنسیخ استعمال کرتا ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر عہد اور ہر ملک میں شوریٰ پر عمل ایک ہی صورت میں ہو بلکہ اصل مقصد اس کے تقاضے پورے کرنا ہے۔ خلافت راشدہ میں اس زرین اصول کا مکمل احترام نظر آتا ہے۔

۴۔ انتخاب خلافت: اسلامی ریاست میں خلیفہ کا انتخاب عام طور پر مجلس شوریٰ کرتی ہے جس کے ارکان کی قابلیت اور امانت و دیانت مسلّم ہوتی ہے لیکن انتخاب

کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کو سقیفہ بنی ساعدہ میں موجود انصار و مہاجرین نے خلیفہ چنا۔ حضرت عمرؓ کو حضرت ابو بکر صدیق نے لوگوں کے مشورے سے نامزد کیا۔ حضرت عثمانؓ کو حضرت عمرؓ کی مقرر کردہ اہل الرائے کی مجلس نے چنا اور حضرت علیؓ کو اہل مدینہ نے منتخب کیا۔ محدود انتخاب کے بعد عوام سے بیعت عامہ لی جاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدینؓ کا طریقہ انتخاب گو جدا گانہ تھا لیکن عوامیت کی مشترکہ روح ہر انتخاب میں کارفرما تھی۔ یہی اصل مقصود بھی ہے۔

خلافت کا منصب کسی خاص طبقہ یا گروہ کو حاصل نہیں بلکہ ہر مسلمان مرد جو اس کے لیے اہلیت و صلاحیت رکھتا ہو اور سیرت و کردار کے اعتبار سے اسے عوام کا اعتماد حاصل ہو، خلیفہ منتخب ہو سکتا ہے۔

۵۔ انتظامیہ و عدلیہ: اسلامی ریاست میں دو بنیادی شعبے عدلیہ اور انتظامیہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں بالکل الگ الگ اور ایک دوسرے کے اثر سے آزاد ہوتے ہیں۔ انتظامیہ میں سب لوگ خلیفہ کے ماتحت ہوتے ہیں اور عدلیہ میں خلیفہ کو بھی عوام کی سی حیثیت حاصل ہوتی ہے یہاں تک کہ اگر خلیفہ خود ماخوذ ہو تو اسے بھی عدلیہ میں عام شہری کی طرح حاضر ہونا پڑتا ہے نیز عدلیہ ہر قسم کے اثر سے بے نیاز ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست بطور فلاحی ریاست: فلاحی ریاست سے مراد وہ ریاست ہے جو صرف عوام سے ٹیکس وصول کر کے نظم و نسق اور امن و امان برقرار رکھنے اور قومی دفاع کی ذمہ دار نہ ہو بلکہ عوام کو جملہ بنیادی ضروریات مہیا کرے اور زندگی کے تمام شعبوں میں حقیقی معنوں میں عدل و مساوات قائم کرے "تاکہ غربت و افلاس، فقر و فاقہ اور ہر طرح کے ظلم و ستم کا خاتمہ ہو کر رعایا مکمل طور پر خوشحالی و فارغ البالی سے ہمکنار ہو"۔ اسلامی ریاست کے قیام کے مقصد اور مندرجہ بالا خصوصیات پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام فلاحی ریاست کا علمبردار ہے۔ اسلامی ریاست کے قیام

کا مقصد فقر و فاقہ اور غربت و افلاس کو دور کرنا ہے ۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھوک ننگ افلاس کے خاتمے کے لئے مثبت اقدام کرے ۔ اسلام ہر شخص کو بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری قرار دیتا ہے ۔ مگر یہ بھی لازم ٹھہراتا ہے کہ ہر شخص اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لئے سعی و کوشش اور جد و جہد کرے ۔ محنت سے پاک اور طیب روزی کمائے اور اسے جائز اور حلال ضروریات پر خرچ کرے ۔ پھر جو بچ رہے اس سے غریبوں، ناداروں اور حاجتمندوں کی کفالت کرے ۔ اسی سے فلاحی ریاست وجود میں آتی ہے ۔

عالم اسلام

اُمّت

امت کے لغوی معنی نسل، خاندان، گروہ، جماعت وغیرہ کے ہوتے ہیں اور اس

مفہوم: سے مراد وہ جماعت ہے جس کے افراد میں مذہبی، جغرافیائی، عصری یا کوئی اور مشترک رابطہ موجود ہو۔ اصطلاحاً امت لوگوں کی اس جماعت کو کہا جاتا ہے جو کسی نبی کے پیرو ہوں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا — اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ — اور کوئی امت ایسی نہیں مگر یہ کہ اس میں ڈرانے والا بھیجا گیا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:-

وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ (المومن ۵) — اور اس طرح ہر امت نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے رسول کو پکڑے اور امر باطل کے ساتھ جھگڑا کرے۔

"امت مسلمہ" یا امت محمدیہ" سے مراد وہ مسلمان ہیں جو سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں رہتے ہوں اور کسی رنگ و نسل یا قوم و وطن سے تعلق رکھتے ہوں۔

قوم اور امت میں فرق: قوم سے مراد عموماً ایسی جماعت ہوتی ہے جس کی بنیاد رنگ، نسل، زبان یا وطن وغیرہ محدود تصورات پر استوار ہوتی ہے۔ اسی

لئے اس کے افراد میں اصول ونظریات کا اختلاف باقی رہتا ہے چونکہ اس کی شیرازہ بندی محدود ومخصوص مفاد پر ہوتی ہے اس لئے قوم کو کبھی ہمہ گیر نصب العین کی علمبرداری حاصل نہیں ہوتی بلکہ اکثر قومیں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہتی ہیں۔

اس کے برعکس امت سے مراد وہ جماعت ہوتی ہے جس کی بنیاد ہی اصول ونظریاتی اتحاد واشتراک پر ہوتی ہے کیونکہ امت کے سب افراد ایک نبی اور ایک دین کے پیرو ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امت نسلی، لسانی، وطنی اور طبقاتی وغیرہ محدود تصورات سے بالاتر ہوتی ہے اور اس میں عالمگیر ہونے کی لچک موجود ہوتی ہے۔ امت کے افراد اصول ومسلک پر اپنے ہر خونی وجذباتی تعلق کو قربان کر کے زندگی میں اتحاد پیدا کر دیتے ہیں۔

ہجرت مدینہ کے بعد بیٹا باپ سے، بیٹی ماں سے، بیوی خاوند سے اور بھائی بھائی سے جدا ہو گئے اور امت مسلمہ کے افراد نے دنیا کے سامنے ثابت کر دیا کہ اسلام کا رشتہ سب رشتوں سے عزیز و برتر ہے۔ امت کا اختلاف زندگی کی راہیں بدل دیتا ہے۔ اگر بیٹا اسلام چھوڑ دے تو باپ کی وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر خاوند و بیوی دونوں میں سے ایک اسلام چھوڑ دے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس قوم کے افراد میں کتنا ہی اصولی ونظریاتی اختلاف کیوں نہ ہو وہ ایک ہی قوم متصور ہوتے ہیں۔

اہمیت

امت مسلمہ کی اہمیت مندرجہ ذیل دلائل سے واضح ہوتی ہے۔

۱۔ **وحدت اسلامی:** امت مسلمہ کے قیام سے تمام عالم اسلام میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ دین اسلام کسی خاص قوم و وطن یا رنگ ونسل کے دائرہ تک محدود نہیں بلکہ یہ دین ساری دنیا کے لئے پیغام ہدایت ہے اور اس دین کے تمام پیروکار یعنی امت مسلمہ کے افراد دنیا کے کسی ملک میں رہتے ہوں اور کسی بھی قوم یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں اپنے فکری وعملی اتحاد کی بدولت ایک اسلامی برادری کے رکن ہیں۔ زندگی کے تقاضوں نے

انسانوں کو اگرچہ سب بنی آدم ہیں مختلف قوموں اور ملکوں میں منقسم کر دیا ہے لیکن اسلام سب بنی نوع انسان کو متحد ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

امت مسلمہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہدایت و فلاح کا بہترین نمونہ ہے

۲ نمونہ ہدایت: خدا تعالیٰ نے اس امت کے قیام کا مقصد یہ بتایا ہے کہ دوسرے لوگوں کو اپنی مثال پیش کرتے ہوئے نیکی کی تلقین کرے اور برائی سے روکے جیسا کہ فرمان ربانی ہے

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ۔ (آل عمران) تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہو تاکہ تم نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔

اس آیت کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امت مسلمہ تمام بنی نوع انسان کے لئے امامت و پیشوائی کا شرف رکھتی ہے اور تمام دنیا کو تبلیغ حق کا فریضہ اسی امت کو سونپا گیا ہے

رکنیت

امت مسلمہ کی رکنیت حاصل کرنے کے لئے صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ کلمہ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی دل و زبان سے شہادت دی جائے یعنی بنیادی عقیدہ توحید و رسالت پر ایمان لایا جائے اس میں کسی ذات برادری رنگ نسل اور قوم و ملک کی کوئی قید نہیں ہے ہر کلمہ گو شخص امت مسلمہ کا رکن ہے۔

حضرت اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں روانہ فرمایا اور ہم دشمن قبیلہ پر حملہ آور ہوئے۔ میں ایک شخص کے سر پر پہنچا تو اس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دیا تاہم میں نے اس پر وار کیا لیکن میرے دل میں شبہ پیدا ہو گیا۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا آپ نے فرمایا کیا اس کے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے کے باوجود تو نے اسے مار دیا؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ اس نے محض اسلحہ کے خوف سے کلمہ پڑھا۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے اس کا دل چیر

کر دیکھا تھا کہ اس کے دل سے آواز نکلی یا نہیں۔ آپ بار بار یہ جملہ دہراتے رہے اور میری حالت یہ ہو گئی کہ میں نے چاہا کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ (مسلم)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ہر کلمہ گو شخص خواہ وہ کسی خوف و ڈر سے ہی کلمہ کیوں نہ پڑھ لے، مسلمان ہے اور امت مسلمہ کا رکن متصور ہوتا ہے۔

خصوصیات

قرآن و حدیث سے امت مسلمہ کی بہت سی خصوصیات ثابت ہوتی ہیں۔ جن میں سے بعض اہم خصوصیات درج ذیل ہیں۔

۱۔ **بہترین امت:** امت مسلمہ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بہترین امت قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۱۰)	تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کی طرف نکالی گئی ہو تاکہ تم نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور اللہ پر ایمان لاؤ۔

امت مسلمہ کو بہترین امت اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ یہ سب سے افضل اور آخری نبی آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے اور اس امت کو سب سے مکمل، وہ آخری ضابطہ حیات یعنی قرآن مجید دیا گیا ہے۔ پھر اس امت کو سب سے مکمل اور آخری دین اسلام بھی دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ: ۳)	آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا ہے۔

۲۔ امت وسط: امت مسلمہ کی دوسری اہم خصوصیت امت وسط ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ (البقرہ ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک وسطی امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں

امت وسط کے معنی درمیانی یا اعتدال کی امت ہے اور اس سے مراد اعلیٰ واشرف لوگوں کی وہ جماعت ہے جو عدل وانصاف اور اعتدال و توسط کی روش پر قائم ہو۔ جو ہر معیار سے افراط و تفریط سے پاک غایت درجہ اعتدال پر ہو اور دنیا کی دوسری قوموں اور امتوں کے لئے نمونے کی حیثیت رکھتی ہو۔

۳۔ عالم گیریت: امت مسلمہ کی تیسری خصوصیت اس کا عالمگیر ہونا ہے۔ دنیا کی دوسری تمام قوموں اور امتوں کے برعکس جن کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل سے تھا، امت مسلمہ ایک ہمہ گیر حیثیت کی حامل ہے کیونکہ اس امت کے قائد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لئے مبعوث کئے گئے۔ آپؐ کا پیغام عرب وعجم اور حبشہ و روم ساری دنیا کے لئے ہے اور آپؐ کا خطاب بلا تخصیص رنگ ونسل اور زبان ووطن ہر ایک کے لئے ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (الاعراف: ۱۵۸)

اے نبیؐ! کہہ دیجئے کہ اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسولؐ ہوں۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (سبا: ۲۸)

اور (اے نبیؐ) ہم نے آپؐ کو تمام لوگوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ آپؐ انہیں خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے ہیں لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۴۔ اطاعت ربانی: امت مسلمہ کی ایک خصوصیت خدا تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے یعنی اس امت کے تمام افراد ایک خدا تعالیٰ کے ماننے والے اور اس کے احکام پر چلنے والے ہیں امت مسلمہ کی یہ خصوصیت اسی کے نام سے ہی ظاہر ہے کیونکہ اسلام کے معنی گردن جھکانا، اطاعت کرنا اور فرمانبرداری اختیار کرنا ہیں اور امت مسلمہ کے معنی ہی فرمانبردار و اطاعت گذار امت کے ہیں۔ امت مسلمہ کی یہ خصوصیت امام الانبیاء حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا نتیجہ ہے جو قرآن پاک میں مذکور ہے:

وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (البقرۃ ۱۲۸) اور میری نسل میں سے ایک امت پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو۔

۵۔ اتحاد: امت مسلمہ کی ایک اہم خصوصیت اتحاد ہے یعنی اس امت کے تمام افراد میں باہمی ربط و اتحاد پایا جاتا ہے جو اس کی تعلیمات و عبادات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً نماز سے جماعتی تنظیم و اتحاد کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح حج کے موقع پر تمام مسلمان بلا امتیاز رنگ و نسل، قوم و ملک اور طبقہ و قبیلہ سب ایک ہی لباس میں ملبوس ہو کر انسانی اتحاد کا بے مثال نمونہ پیش کرتے ہیں۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کو ایک برادری قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (حجرات ۱۰) مسلمان تو ایک برادری ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حجۃ الوداع کے موقع پر اس امر کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ "اے لوگو! میری بات سنو اور سمجھ جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان ایک برادری ہیں۔

۶۔ خصوصی شعائر: امت مسلمہ کی ایک خصوصیت اس کے شعائر ہیں۔ شعار کے معنی علامت اور نشانی ہیں اور اس سے مراد وہ شے ہے جو کسی مسلک یا عقیدہ یا نظام کی نمائندگی کرتی ہو۔ دنیا کی ہر قوم اور امت کا اپنا الگ شعار ہوتا ہے جو اس کی نمائندگی کرتا ہو مثلاً کسی قوم کا جھنڈا یا سکہ اس کا شعار ہوتا ہے۔

امت مسلمہ کے بھی بعض مخصوص شعائر ہیں جن سے اس کے افراد کی پہچان

ہوتی ہے مثلاً "سلام" امت مسلمہ کا ایک اہم شعار ہے یعنی جب دو مسلمان آپس میں ملیں تو ایک السلام علیکم کہے اور دوسرا وعلیکم السلام سے جواب دے۔ اسی طرح مساجد، اذان، نماز، قرآن حکیم، حج اور قربانی وغیرہ اسلامی شعائر ہیں اور امت مسلمہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان شعائر کی قدر و منزلت اور احترام ہر مسلمان پر واجب ہے۔

حقوق و فرائض

امت مسلمہ کے تمام افراد کو ایک دوسرے کی طرف سے بعض مراعات حاصل ہوتی ہیں اور ہر ایک پر دوسرے کے لئے بعض ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ان مراعات اور ذمہ داریوں کو امت مسلمہ کے حقوق و فرائض کا نام دیا جاتا ہے ان حقوق و فرائض کو نہایت جامع طور پر مندرجہ ذیل عنوانات میں جمع کیا جا سکتا ہے:-

۱۔ اخوت یعنی اسلامی برادری کا تصور۔

۲۔ تبلیغ یعنی نیکی کی تلقین اور بدی کی ترہیب۔

۳۔ جہاد یعنی حق کا دفاع۔

اخوّت

مفہوم : اخوت کا لفظ "اَخ" سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی بھائی بھائی اور رفیق کے ہیں اور اخوت کے معنی بھائی چارہ، بھائی بندی، برادری اور رفاقت کے ہیں۔ اخوت سے مراد افراد کا وہ باہمی تعلق ہے جو خاندان قوم مذہب یا کسی اور مشترک رابطہ و تعلق کی بنا پر قائم ہوتا ہے۔ اصطلاحاً امت مسلمہ کے افراد کا باہمی بھائی چارہ اور رفاقت کا تعلق اخوت اسلامی کہلاتی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد انصار و مہاجرین میں جو بھائی چارہ قائم کیا اسے 'مواخات' کا نام دیا گیا۔

اخوت اسلامی میں رنگ و نسل قبیلہ و خاندان یا قوم و ملک کی کوئی تخصیص نہیں اسی طرح امیر و غریب، اعلیٰ و ادنیٰ اور آقا و غلام کی بھی کوئی تمیز نہیں بلکہ دنیا بھر کے تمام مسلمان خواہ وہ کہیں رہتے ہوں اور کسی بھی قوم، نسل یا رنگ سے تعلق رکھتے ہوں عام شخص سے لے کر خلیفہ تک سب ایک رشتۂ اخوت میں منسلک ہوتے ہیں۔

اہمیّت

اخوت اسلامی کی اہمیت مندرجہ ذیل امور سے واضح ہوتی ہے :-

۱- امت مسلمہ کی رکنیت کا تقاضا : امت مسلمہ کی رکنیت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ تمام افراد امت آپس میں ایک برادری و بھائی چارے یعنی اخوت اسلامی کا تعلق رکھیں۔ اخوت کا رشتہ اگرچہ خاندانی معاشرتی اور قومی تعلقات پر بھی استوار ہوتا ہے لیکن یہ نہایت محدود ہوتا ہے پھر یہ تعلق اتنا مضبوط و مستحکم بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات دو رشتہ دار بھائیوں کے تعلقات آپس میں منقطع بھی ہو جاتے ہیں اور عمر بھر درست نہیں ہوتے پھر ایسے اشخاص کا تعلق آپس میں منقطع ہو جانے

کے باوجود باقی رشتہ داروں سے برابر قائم رہتا ہے۔ اس کے برعکس اخوتِ اسلامی کی بنیاد اسلام کے رشتہ پر ہے۔ جو ناقابلِ شکست ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان اس دینی تعلق کو توڑ دے تو اس کا تعلق باقی سب مسلمانوں سے بھی خود بخود ٹوٹ جاتا ہے۔ بدرحقیقت یہی وہ رشتہ ہے۔ جو ایک طرف مسلمان کا تعلق خدا اور اس کے رسولؐ سے قائم کرتا ہے۔ تو دوسری طرف تمام مسلمانوں کو آپس میں ملا کر ایک امت بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کی موالات یعنی قلبی رفاقت صرف اللہ تعالےٰ اس کے رسولؐ اور مسلمانوں ہی سے ہوسکتی ہے مسلمان کے لئے قطعاً جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر غیر مذہبوں سے قلبی تعلقات و روابط قائم کرے۔

۲۔ قرآنِ پاک کی تاکید:- قرآنِ پاک میں مختلف انداز میں اخوت اسلامی کی اہمیت و فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اور اس جذبہ کے استحکام کی تاکید کی گئی ہے۔ ایک مقام پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب مسلمان بھائیوں میں کوئی بگاڑ یا رنجش پیدا ہو جائے تو ان میں اصلاح کرا دیا کرو جیسا کہ فرمایا:-

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ (الحجرات: ۱۰)	مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں پس اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔

اسلام سے قبل عرب قبائل ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے لوٹ مار، خون ریزی اور قتل و غارت ان کے روزمرہ کے مشاغل تھے۔ اسلام نے ان کی باہمی عداوتوں اور کینوں کو دور کر کے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ اخوت میں منسلک کر دیا یہ خدا تعالےٰ کا بہت بڑا احسان تھا جس کا ذکر قرآن پاک میں یوں کیا گیا ہے:-

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران: ۱۰۳)	اور خدا تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور تم اس کے احسان سے بھائی بھائی بن گئے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا :۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا	(اے نبیؐ) اگر آپؐ زمین کی ساری
مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِہِمْ وَ	دولت خرچ کر دیتے تب بھی ان کے دلوں میں
لٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَہُمْ	الفت و محبت پیدا نہ کر سکتے مگر خدا نے انہیں
اِنَّہٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ (الانفال ۶۳)	الفت پیدا کر دی بیشک وہ زبردست
	حکمتوں والا ہے۔

۳۔ احادیث نبویؐ : آنحضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں اخوت اسلامی کی اہمیت بیان فرمائی ہے اور مسلمانوں کو آپس میں اخوت کا رشتہ قائم رکھنے کی تاکید کی ہے۔

آپؐ نے فرمایا خدا تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہ باہم محبت رکھنے والے کہاں ہیں! مجھے اپنی عظمت کی قسم آج میں انہیں اپنے سایہ میں جگہ دونگا اور آج میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مسلمان آپس میں ایک عمارت کی مانند ہیں جس کا ایک حصّہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔ (اربعین نووی) ایک اور حدیث میں فرمایا کہ مسلمان باہمی رحمدلی شفقت اور ارتباط میں ایک جسم کی مانند ہیں جس کا ایک عضو بیمار ہو تو سارا جسم بیداری و بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "اے لوگو! میری بات سنو اور غور سے سنو! جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ سب اہل اسلام ایک برادری ہے۔" نیز آپ کا ارشاد ہے کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ اس سے خیانت نہیں کرتا اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور وقت پڑنے پر اس سے کنارا نہیں کرتا ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی آبرو، مال اور خون حرام ہے (ترمذی)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتہ اخوت قائم رکھنے پر اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں کو آپس میں قطع تعلق رکھنے سے منع فرمایا جیسا کہ ارشاد ہے "کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین راتوں سے زیادہ قطع تعلق رکھے کہ وہ دونوں آمنے

سامنے آئیں تو یہ ادھر منہ پھیر لے اور وہ ادھر منہ موڑ لے اور ان میں سے بہترین وہ ہے جو سلام سے ابتدا کرے (بخاری ومسلم)

۴۔ مواخاتِ صحابہؓ: اخوت اسلامی کی بہترین مثالیں مواخاتِ صحابہؓ ہیں جن سے اخوت اسلامی کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ یوں تو ابتدائے اسلام ہی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں مواخات یعنی بھائی چارہ قائم کر دیا تھا لیکن ہجرت کے بعد مدینہ پہنچ کر آپؐ نے اس پر وسیع پیمانے پر عمل کیا۔ ہر مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی قرار دیا حتیٰ کہ آپؐ نے خود بھی حضرت علیؓ کو اپنا دینی بھائی قرار دیا۔ ہر انصاری نے اپنا مال واسباب، زمین وزر اور دیگر جائیداد اپنے مہاجر بھائی کے ساتھ نصف نصف بانٹ لی حتیٰ کہ اگر کسی کے پاس دو بیویاں تھیں تو اس نے ایک کو طلاق دے کر اپنے دینی بھائی کے حوالے کر دیا۔ حضرت سعد بن ربیع اپنے دینی بھائی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو اپنے گھر لے گئے اور اپنی دونوں بیویوں کو عبدالرحمٰن کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان میں سے جو بھی پسند ہو بتا دیں تاکہ وہ اسے طلاق دے دیں اور عبدالرحمٰن اس سے شادی کر لیں۔ یہ رشتہ اخوت اس قدر مضبوط تھا کہ جب دونوں بھائیوں میں سے ایک فوت ہو جاتا تو دوسرا بھائی اس کے ترکہ میں سے حصہ دار ہوتا تھا حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب اور دنیا کی کوئی قوم اس قسم کی اخوت و بھائی چارے کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

خصوصیات

قرآن وسنت سے اسلامی اخوت کی درج ذیل خصوصیات ثابت ہوتی ہیں:۔

۱۔ رحمدلی وشفقت: اخوت اسلامی کی اولین خصوصیت رحمدلی وشفقت ہے یعنی تمام مسلمان آپس میں الفت ومحبت اور رحمدلی و شفقت سے ملتے جلتے اور زندگی بسر کرتے ہیں اگر کسی سے کوئی لغزش یا غلطی ہو جائے تو درگذر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ نرمی ورحمدلی کا برتاؤ کرتے ہیں

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح ۲۹) وہ آپس میں بڑے رحمدل ہیں

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں مسلمانوں کی اس خصوصیت کو واضح کیا ہے ۔ آپؐ نے فرمایا " تو دیکھتا ہے مومنوں کو ان کی باہمی رحمدلی، محبت اور ارتباط میں ایک جسم کی طرح ہیں کہ جب کوئی عضو بیمار ہوا تو سارے جسم نے بے خوابی اور بخار کی طرف باہم دعوت دی " (بخاری و مسلم) نیز ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک تم ایمان نہ لاؤ جنت میں داخل نہ ہوگے اور جب تک تم میں باہمی محبت نہ ہو مومن نہ ہوگے ۔

اسلام میں زکوٰۃ و صدقات کا حکم اور تحفہ و ہدایا کی ترغیب اسی لئے دی گئی ہے کہ مسلمان بھائیوں میں ایک دوسرے کے لئے الفت و محبت اور رحم دلی و شفقت پیدا ہو ۔

۲۔ خیر خواہی و بھلائی : اخوت اسلامی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لئے خیر خواہی کرے اور بھلائی چاہے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی وہ نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے یعنی مومن کو چاہئے کہ وہ دل، زبان اور عمل سے ہر وقت دوسرے کی خیر خواہی پہ آمادہ رہے

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بیعت لیتے وقت دوسرے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی کی بھی بیعت لیتے تھے چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کے ہاتھ پر نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے کی بیعت کی (بخاری و مسلم) نیز آپ کا فرمان ہے کہ لوگوں کے درمیان اصلاح کرانا، نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے افضل ہے ۔

باہمی خیر خواہی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے بھائیوں کے لئے ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے لئے دعائے خیر کرتا رہے ۔ قرآن حکیم میں ایسی دعا کا ذکر کیا گیا ہے :۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (الحشر) — اے ہمارے پروردگار! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخشدے جو ہم سے پہلے ایمان لائے :

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں ارشاد فرمایا ہے کہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کے لئے دعا کرتا ہے۔ تو فرشتے کہتے ہیں تیرے لئے بھی ایسا ہو۔

اسلام میں خیر خواہی کی کوئی حد نہیں۔ معمولی سے معمولی کام بھی خیر خواہی میں شمار ہوتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ کسی اندھے شخص کو یا بھولے بھٹکے کو راستہ دکھانا بھی کار خیر ہے حتیٰ کہ آپؐ کا فرمان ہے کہ اگر کوئی شخص راستے سے کانٹا ہٹا دے تو خدا تعالیٰ اس کام کی بھی قدر کرتا ہے۔

۳۔ امداد و اعانت : اسلامی اخوت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کی امداد و اعانت اپنا فرض سمجھتا ہے۔ قولی، عملی اور مالی ہر قسم کی امداد پر آمادہ رہتا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ تو وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی مشکل میں بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کا مددگار ہے اللہ تعالیٰ اس کا مددگار رہتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی سے ایک دکھ دور کرے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے قیامت کے دن اس سے ایک مصیبت دور کرے گا۔ اور جو شخص دنیا میں اپنے بھائی کی ستر پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر بروز قیامت پردہ ڈالے گا (مسلم)

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ ہی اس کی تحقیر کرتا ہے نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ مدد کرنے والے مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا جہاں وہ مدد کا محتاج ہوگا۔

مدد و اعانت ہر مسلمان بھائی کے لئے لازمی ہے۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا اور خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ اپنے مسلمان

کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم اگر وہ ظالم ہو تو اسے اس کے ظلم سے باز رکھ اور اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کر (دارمی) دراصل ظالم کو ظلم سے روکنا بھی خیر خواہی میں شامل ہے کیونکہ اس طرح وہ قیامت کے خوفناک عذاب سے بچ جائے گا۔

اسی امداد و اعانت کے پیش نظر اسلام نے زکوٰۃ و صدقات کا نظام جاری کیا ہے تاکہ امیر مسلمان اپنے غریب بھائیوں کی مالی امداد کریں اور اسلامی معاشرے میں کوئی حاجتمند نہ رہے۔

۴۔ ایثار و قربانی: اسلامی اخوت کی ایک بڑی خصوصیات ایثار و قربانی ہے یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنی ذات پر ترجیح دیتا ہے اور اس کی خاطر ہر طرح کا ایثار کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔

ایثار و قربانی کی درخشاں مثال مؤاخات کی ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر مسلمان مہاجرین و انصار میں قائم کی۔ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ اس قدر ایثار و قربانی کا سلوک کیا کہ اپنی جائیداد اور کاروبار کا نصف انہیں دے دیا حتیٰ کہ اگر کسی کے پاس دو بیویاں تھیں تو اس نے ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کو دے دیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انصار کی اس صفت کا ذکر کیا ہے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔

اور وہ ان (مہاجرین) کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود تنگی ہی میں کیوں نہ ہوں۔

تاریخ اسلام میں ایثار و قربانی کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ غزوہ تبوک کے موقع پر ایک صحابیؓ اپنے بھائی کی تلاش میں نکلے کہ زخمی ہوں تو پانی پلائیں۔ بڑی تلاش کے بعد جب زخمی بھائی کے پاس پہنچ کر پانی پیش کیا تو ایک دوسرے زخمی کے کراہنے کی آواز آئی۔ اس زخمی نے پانی دوسرے زخمی کی طرف پھیر دیا۔ وہ اس کے پاس پانی لے کر پہنچے اور ابھی پلانے ہی والے تھے کہ ایک تیسرے زخمی کی صدا کانوں تک پہنچی چنانچہ اس

نے بھی پانی تیسرے کی طرف پھیر دیا وہ اس کے پاس پانی لے کر پہنچے تو یہ جان بحق ہو چکا تھا لوٹ کر دوسرے کے طرف آئے تو اس کی روح بھی پرواز کر چکی تھی انہیں چھوڑ کر اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے یہ تھا اسلامی جذبہ ایثار و قربانی کہ عین موت کے منہ میں ہوتے ہوئے بھی مسلمان بھائی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دی -

ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک صحابیؓ کو کسی نے بھُنی ہوئی سری بھیجی - انہوں نے سوچا کہ میرا فلاں بھائی زیادہ ضرورت مند ہے اس لئے بہتر ہو گا کہ اسے بھیج دی جائے جب اس کے پاس وہ پہنچی تو اس نے آگے ایک اور مسلمان کو بھیج دی اور اس طرح وہ سری کئی ہاتھوں میں پھر کر پہلے مسلمان کے پاس ہی آگئی -

- اتحاد و تعاون : اخوت اسلامی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مسلمان آپس میں متحد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ نیکی و بھلائی میں تعاون کرتے ہیں قرآن پاک میں بھی مسلمانوں کو اپنے اندر یہی صفت پیدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا :-

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ	اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے
جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا	پکڑے رہو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو -

آنحضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں مسلمانوں کو اتحاد و تعاون اور جماعت سے وابستگی کی تاکید فرمائی ہے - آپؐ کا ارشاد ہے کہ تین چیزوں پر مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا اطاعت الٰہی کا خلوص، ائمہ مسلمین سے خلوص اور جماعت سے وابستگی نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنی جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اور اسی حالت میں مر گیا تو اس نے جاہلیت یعنی کافروں کی موت پائی (بخاری)

مسلمانوں میں اتحاد و تعاون پیدا کرنے کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو آپس میں راہ و رسم کے بعض حقوق متعین کر دیئے ہیں چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں - جب ملے تو سلام کرے - جب اسے دعوت دی جائے

تو قبول کرے جب اس سے خیر خواہی چاہے تو خیر خواہی کرے، جب اسے چھینک آئے تو تشمیت کرے (یعنی یرحمک اللہ کہے) جب بیمار ہو تو عیادت کرے اور جب مر جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو۔

۶۔ جدال و قتال سے اجتناب: اسلامی اخوت کی ایک خصوصیت جدال و قتال سے اجتناب ہے یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان سے لڑنے جھگڑنے، گالی گلوچ کرنے اور قتل کرنے سے گریز کرتا ہے اور دوسرے کی جان و عزت کو محترم سمجھتا ہے قرآن پاک میں مسلمانوں کو آپس میں جھگڑنے اور تنازعہ پیدا کرنے سے منع کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا:۔

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (الانفال ۴۶)	اور آپس میں مت جھگڑو ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

ایک دوسرے مقام پر جھگڑا ہو جانے کی صورت میں صلح کرانے کی ترغیب دی گئی ہے، فرمایا:۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (الحجرات: ۹)	اور اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں صلح کراؤ

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف لڑنے جھگڑنے بلکہ ان باتوں سے بھی اجتناب کا حکم دیا ہے جن سے جھگڑا پیدا ہوتا ہو مثلاً کسی کا تمسخر اڑانا طعنہ دینا اور برے ناموں سے چڑانا وغیرہ جیسا کہ ارشاد فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ (الحجرات ۱۱)	اے ایمان والو! تم سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔

اور فرمایا:۔

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط (الحجرات: ١١) — اور آپس میں ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو اور نہ ہی ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارو۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو جدال وقتال اور گالی گلوچ سے منع فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "مسلمان کو گالی دینا فسق اور قتل کرنا کفر ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں" ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ "مومن نہ طعنہ زنی کرنے والا نہ بددعا دینے والا نہ فحش گو اور نہ گندہ زبان ہوتا ہے (ترمذی) آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ یقیناً بدترین شخص وہ ہے جسے لوگ اس کی بدزبانی سے بچنے کیلئے چھوڑ دیں (بخاری ومسلم) نیز آپؐ کا فرمان ہے۔ کہ مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور آبرو حرام ہے حتیٰ کہ آپؐ نے فرمایا مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ آنکھ سے بھی ایسا اشارہ کرے جس سے کسی مسلمان کو رنج پہنچے۔

۷۔ بدگمانی وغیبت سے گریز: اخوت اسلامی کی ایک بڑی خصوصیت بدگمانی و غیبت سے بھی گریز ہے۔ یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے حق میں برا گمان کرنے اور اس کی عیب جوئی اور غیبت کرنے سے گریز کرتا ہے قرآن پاک میں مسلمانوں کو اس امر کی تاکیدیں کی گئی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا (الحجرات ١٢) — اے ایمان والو! بہت سی بدگمانی سے بچو۔ یقیناً بعض بدگمانیاں گناہ ہیں اور ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو اور تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے۔

قرآن پاک نے غیبت کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ اسے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے

مترادف کہا ہے جیسا کہ فرمایا :۔

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ (الحجرات:۱۲)	کیا تم سے کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے تو اس سے تم نفرت کرتے ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بدگمانی، تجسس اور بغض کی ممانعت فرمائی ہے آپؐ کا ارشاد ہے کہ "بدگمانی سے بچو بیشک بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور نہ کسی کی رازجوئی کرو اور نہ کسی کی جاسوسی کرو اور نہ قیمت بڑھانے کو بولی دو اور نہ باہم بغض رکھو اور نہ باہم روگردانی کرو اور اے اللہ کے بندو! سب بھائی بھائی ہو جاؤ (بخاری وسلم) بدگمانی سے بچنے کی آپؐ نے اس قدر تاکید فرمائی کہ آپؐ نے فرمایا "جب تم تین آدمی ہو تو تم میں سے دو تیسرے سے الگ ہوکر سرگوشی نہ کریں یہاں تک کہ تم لوگوں میں مل جاؤ تاکہ یہ بات اسے رنجیدہ نہ کرے"۔
(بخاری وسلم)

تبلیغ

مفہوم: تبلیغ کا لفظ بلغ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پہنچانا اور تبلیغ کے معنی انتہا اور آخری ٹھکانے تک پہنچانا ہے۔ اصطلاح شریعت میں تبلیغ سے مراد خدا تعالیٰ کا پیغام اور اس کے احکام وضاحت کے ساتھ اس کے بندوں تک پہنچا دینا ہے نیز لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنا اور برائی سے روکنا ہے۔

قرآن پاک میں تبلیغ کے لئے متعدد الفاظ استعمال ہوئے ہیں مثلاً بلاغ جس کے معنی خدا کا پیغام پہنچانا ہے۔ دعوت جس کے معنی خدا کے راستے کی طرف بلانا ہے۔ انذار جس کے معنی عذاب خداوندی سے خبردار کرنا ہے اور تذکیر جس کے معنی پیغام اور اس کے احکام پہنچائے جائیں اور انہیں راہ ہدایت پر چلنے کی ترغیب دی جائے اور ضلالت و گمراہی کے راستے سے روکا جائے۔

تبلیغ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے ضروری ہے۔ غیر مسلم کو تبلیغ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول اس کے سامنے وضاحت سے پیش کر کے اسے غور و فکر کی دعوت دی جائے تاکہ وہ اسلام کی طرف راغب ہو۔ مسلمان کو تبلیغ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے نیکی کی طرف راغب کیا جائے تاکہ وہ رضائے الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرے۔

اہمیت و ضرورت

تبلیغ کی ضرورت و اہمیت مندرجہ ذیل دلائل و براہین سے ثابت ہوتی ہے

فلاح انسانی: اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور سب بنی نوع انسان کی فلاح و کامرانی کا علمبردار ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ کوئی بڑی خوبی نہیں کہ انسان محض اپنی نجات کی فکر کرے بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ وہ دوسروں کی نجات کے لئے بھی کوشاں رہے۔ جیسے قرآنی اصطلاح میں "فلاح" کہا جاتا ہے۔

دنیا کے تمام حکماء اور فلسفی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ہر انسان کا اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ دوسروں کو کسی دکھ و مصیبت اور نقصان و خسارے میں مبتلا دیکھے تو اسے نجات دلانے کی کوشش کرے چنانچہ دنیا کے ہر مذہب میں دکھیا اور مصیبت زدہ افراد کی امداد و اعانت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جب دنیاوی مصائب سے لوگوں کو بچانا ضروری ٹھہرا تو انہیں ان گمراہیوں سے کیوں نہ بچایا جائے جو ان کی ابدی زندگی کی تباہی و بربادی کا باعث ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے ہر پیروسے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ خود بھی راہِ راست پر چلے اور دوسروں کو بھی راہ ہدایت پر چلنے کی تلقین کرتا رہے تاکہ تمام بنی نوع انسان فلاح حاصل کرے۔

پھر یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب، تحریک یا قوم صرف اسی وقت تک زندہ رہ سکتی ہے جب تک اس کا نظریہ حیات زندہ و قائم رہے اور کسی نظریہ حیات کو صرف اسی وقت دوام حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اس کی اشاعت اور تبلیغ کی جاتی رہے۔ لہٰذا اشد ضروری ہے کہ اسلام جو تمام نوع انسانی کی فلاح کا ضامن ہے اسے تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ زندہ رکھا جائے۔ چنانچہ خود خدا تعالیٰ نے اسی مقصد کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے رسول اور پیغمبر بھیجے اور انہیں تبلیغ حق کا فریضہ سونپا۔

۲۔ قرآن پاک کی تاکید: تبلیغ اسلام کی اہمیت و ضرورت کے پیش نظر قرآن پاک میں مختلف انداز میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ جناب ہادی برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ دین کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ

(المائدہ ۵: ۶۷)

اے رسولؐ۔ آپؐ کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ آپؐ پر نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیجئے اور اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ

اے چادر میں لپٹے ہوئے اٹھ اور

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (المدثر: ۱) — لوگوں کو ڈرا اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کر ۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا ۔

فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (الشوریٰ ۱۵) — پس لوگوں کو دعوت دے اور استقامت اختیار کر جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے ۔

قرآن پاک نے نبیوں اور رسولوں کی بعثت کا مقصد یہی قرار دیا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچائیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے ۔

إِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (المائدہ ۹۲) — ہمارے رسولوں کے ذمہ تو صرف وضاحت کے ساتھ پہنچا دینا ہے ۔

اگرچہ نیکی کی ترغیب اور برائی کی ترہیب تمام الہامی مذاہب کا جزو رہی ہے لیکن خدا تعالیٰ نے تبلیغ دین کو خصوصیت کے ساتھ امت مسلمہ کا طرۂ امتیاز قرار دیا ہے جیسا کہ فرمایا ۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران ۱۱۰) — تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہو تاکہ تم نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو اور خدا پر ایمان لاؤ ۔

پھر خدا تعالیٰ نے تبلیغ کو ایک غیر معمولی فریضہ قرار دیتے ہوئے اس کی انجام دہی کے لئے امت مسلمہ میں ایک تبلیغی جماعت کا وجود ضروری قرار دیا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران ۱۰۴) — اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے ۔ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ۔

تبلیغ کی اہمیت و فضیلت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تبلیغ دین کا فریضہ ادا کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد ہے ۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں اطاعت کرنے والوں میں سے ہوں۔

۳۔ اسوۂ رسولؐ: تبلیغ دین کی اہمیت اسوہ رسولؐ سے بھی واضح ہوتی ہے کہ آپؐ نے کس محنت و کاوش اور جانفشانی سے پیغام ربانی کو لوگوں تک پہنچایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب منصب نبوت پر سرفراز ہوئے تو آپؐ کو سب سے پہلے یہ حکم ہوا کہ اپنے خاندان کو اسلام کا پیغام دیں اور انہیں شرک و بت پرستی پر عذاب الٰہی سے ڈرائیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء: ۲۱۴)

اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذاب الٰہی سے ڈرا

چنانچہ آپؐ نے اپنے خاندان کے لوگوں کو صفا کی گھاٹی پر جمع کیا اور انہیں خدا کا پیغام سنایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپؐ کا سارا خاندان آپؐ کا مخالف ہو گیا۔ اور آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں دی جانے لگیں۔ لیکن آپؐ نے اپنا تبلیغی مشن جاری رکھا اور اپنے حلقہ اثر میں فرداً فرداً پیغام ربانی پہنچایا۔ کچھ عرصہ بعد آپؐ کو علانیہ تبلیغ کا حکم ملا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر: ۹۴)

(اے نبیؐ) تبلیغ کا جو حکم دیا گیا ہے اب اسے علانیہ بیان کرو

اس کے بعد آپؐ کو تبلیغ کے سلسلے میں وہ وہ مصائب و تکالیف پیش آئیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ آپؐ مکہ کے گلی کوچوں سے گذرتے تو لوگ آپؐ کو راستے میں کانٹے بچھاتے اور آپؐ پر کوڑا کرکٹ ڈالتے آپؐ کو برا بھلا کہتے اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے۔ ان مصائب سے تنگ آکر آپؐ طائف تشریف لے گئے لیکن وہاں کے لوگوں نے بھی

آپ سے برا سلوک کیا اور پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا اور آپ بمشکل جان بچا کر واپس لوٹے۔ لیکن آپ کے پائے ثبات اور سرگرمی عمل میں ذرا فرق نہ آیا۔ حج کے موقع پر آپؐ مختلف قبیلوں کے پاس جاتے اور خدا کا پیغام پہنچاتے۔ جب کفارِ مکہ کی اذیتیں اور ظلم و ستم حد سے بڑھ گئے تو خدا تعالیٰ نے آپؐ کی دلجوئی کے لئے یہ آیت نازل کی۔

فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (الشوریٰ[۱۵])

(اے نبیؐ) لوگوں کو دعوت دے اور استقامت اختیار کر جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے تیرہ برس کفار و مشرکین مکہ کی اذیتیں و مصیبتیں نہایت خندہ پیشانی و استقامت سے برداشت کیں اور تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ حتیٰ کہ آپؐ کو ہجرتِ مدینہ کا حکم ملا۔ مدینہ پہنچنے پر اگرچہ کفارِ مکہ نے آپؐ کے خلاف پے در پے جنگوں کا جال بچھا کر انتہائی مصروف کر دیا لیکن آپؐ نے تبلیغ کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ مدینہ اور آس پاس کے قبائل کو دعوتِ حق دیتے رہے۔ ۶ھ میں کفارِ مکہ کے ساتھ صلح نامہ حدیبیہ طے ہوا تو آپؐ نے تمام قبائل عرب کی طرف مبلغ بھیجے اور عرب سے باہر دوسرے ممالک کے سربراہوں کو بھی تبلیغی خطوط روانہ کئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹ھ میں اسلام قبول کرنے والے قبائل کی آمد کا اس قدر تانتا بندھا کہ اس سال پہلے آپؐ حج بیت اللہ کے لئے بھی تشریف نہ لے جا سکے۔ تاریخ اسلام میں اس سال کو عام الوفود یعنی وفدوں کی آمد کا سال کہا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ آپؐ کے سرگرمی عمل اور جذبہ تبلیغ کی بدولت صرف تئیس سال کے قلیل عرصہ میں پورا عرب حلقہ گوشِ اسلام ہو گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم۔ کا اس دنیا سے پردہ پوشی کے بعد تبلیغ اسلام کا کام رک نہیں گیا۔ بلکہ آپؐ کے خلفاءؓ، صحابہؓ، تابعینؒ اور دیگر امتیوں نے اسے برابر جاری رکھا۔ وہ جہاں بھی گئے خواہ ایک تاجر کی حیثیت سے یا مجاہد بن کر یا عالم کی صورت میں یا ایک عامی کی حیثیت سے انہوں نے اس مقدس فریضے پر ہمیشہ عمل کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وقت ایسا آیا کہ افریقہ سے چین تک اسلام ہی اسلام نظر آنے لگا۔

۴۔ ارشاداتِ نبویؐ: تبلیغ کی اہمیت و فضیلت سے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار ارشادات کتبِ احادیث میں مذکور ہیں۔ آپؐ کا مشہور ارشاد ہے کہ

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

مجھ سے سن کر دوسروں کو پہنچاؤ خواہ ایک ہی آیت ہو۔

حجۃ الوداع کے موقع حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت مبسوط خطبہ ارشاد فرمایا جو تعلیماتِ اسلامی کا نچوڑ ہے اس موقع پر آپؐ نے مسلمانوں کو یہ تاکید بھی فرمائی کہ "دیکھو! جو لوگ موجود ہیں وہ ان کو جو موجود نہیں ہیں یہ باتیں پہنچا دیں۔ ممکن ہے لوگ ان باتوں کی تم سے زیادہ حفاظت کرنے والے اور یاد رکھنے والے ہوں"۔

تبلیغ کسی ایک فرد یا جماعت کا ہی فریضہ نہیں بلکہ سب مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے اس کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس شخص کی مثال جو حدود اللہ پر قائم ہے اور اس کی جو حدود اللہ میں پڑنے والا ہے اس قوم کی سی ہے جو ایک جہاز میں سوار ہوں بعض اوپر کے حصہ میں اور بعض نیچے کے حصہ میں۔ جب نیچے والوں کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اوپر کے حصہ میں آکر پانی لیتے ہیں۔ اگر وہ یہ خیال کریں کہ ہمارے بار بار اوپر جانے سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ نیچے کے حصہ میں سوراخ کر لیں اور اوپر والوں کو تکلیف نہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر اوپر والے ان کو نہ روکیں تو سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر روک دیں تو سب بچ جائیں گے۔ (بخاری و ترمذی)

فریضۂ تبلیغ انجام دیتے ہوئے اگر کوئی شخص قتل کر دیا جائے تو وہ بہت بلند مرتبہ شہادت حاصل کر لیتا ہے۔ حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابیؓ نے پوچھا۔ یا رسول اللہؐ! شہداء میں سے خدا کے نزدیک بزرگ تر کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا وہ عالم جو بادشاہ کے سامنے کھڑا ہوا اور اسے اچھی بات کا امر کیا اور بری بات سے منع کیا اور اگر حاکم نے اسے مار ڈالا تو وہ افضل تر شہداء میں شامل ہوگا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف تبلیغ دین انجام دینے کی تاکید فرمائی ہے بلکہ اس فریضہ کے ترک کرنے پر بہت سی وعیدیں فرمائی ہیں۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ کسی جگہ

اور قوم میں کوئی شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور وہ جماعت و قوم باوجود قدرت کے اس شخص کو اس گناہ سے نہیں روکتی تو ان پر مرنے سے پیشتر دنیا میں عذاب الٰہی ڈال دیا جاتا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے تبلیغ ترک کرنے والے کو یوں وعید فرمائی ہے جب میری امت دنیا کو بڑی چیز سمجھنے لگے گی تو اسلام کی ہیبت اس کے دل سے نکل جائے گی اور جب نیکی کی تلقین اور برائی سے روکنے کو چھوڑ بیٹھے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہو جائے گی۔ اور جب آپس میں گالی گلوچ اختیار کرے گی تو خدا تعالیٰ کی نگاہ سے گر جائے گی۔ نیز آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ لوگو! اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ نیکی کی تلقین اور برائی سے اجتناب کا حکم دیتے رہو۔ مبادا کہ وہ وقت آ جائے کہ تم دعا کرو اور وہ قبول نہ ہو۔ تم سوال کرو اور وہ پورا نہ کیا جائے۔ تم اپنے دشمن کے خلاف مجھ سے مدد چاہو اور میں تمہاری مدد نہ کر سکوں۔

تبلیغ کا مقصد

یہ دنیا ایک دارالامتحان ہے اس لئے نیکی کے ساتھ بدی کو بھی پیدا کیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو نیکی و بدی میں امتیاز کرنا اور دونوں کے اختیار کرنے کا پورا پورا ملکہ عطا کیا ہے تاکہ انسان بھلائی کو اختیار کرے اور بدی سے اجتناب کرے اور اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت دے۔ لیکن چونکہ شیطانی قوتیں ہر وقت انسان کو بہکاتی رہتی ہیں اور طرح طرح کی رنگینیوں اور دلفریبیوں سے بھٹکانے میں کوشاں رہتی ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے انسان کو نیکی و بھلائی کی ترغیب دینے کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے انبیاء اور رسول بھیجے تاکہ روز قیامت لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ ان کو اللہ کی طرف سے ہدایت نہیں پہنچی ورنہ وہ ضرور سیدھی راہ پر چلتے۔ درحقیقت تبلیغ کا بنیادی مقصد اتمام حجت یعنی دلیل پوری کرنا ہے۔ چنانچہ خود خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ مُنْذِرِيْنَ
لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى
اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

سب رسول خوشخبری دینے والے
اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تاکہ
لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ

کے سامنے کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ (النساء: ۱۶۵)

تبلیغ کے مدارج

تبلیغ دین کے تین مدارج ہیں۔ سب سے بلند مرتبہ قوت و طاقت سے برائی کو روکنے کا ہے اور یہ صاحب اختیار کو ہی لازم ہے۔ دوسرا درجہ زبان سے برائی کو روکنے کا ہے یہ ماسوائے کمزوروں کے سب پر لازم ہے اور آخری درجہ برائی کو دل سے برا جاننے کا ہے یہ مجبور و ناچار لوگوں کے لئے ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو شخص بری بات دیکھے اسے چاہیئے کہ اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو کم از کم دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ (مسلم)

تبلیغ کے اصول

قرآن و حدیث سے تبلیغ دین کے مندرجہ ذیل اصول ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ **اخلاقی کشش:** سب سے زیادہ موثر تبلیغ عمل کے ذریعہ ہو سکتی ہے کیونکہ جس قدر عمدہ نتائج عمل سے پیدا ہوتے ہیں وہ دلائل و براہین سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتے اس لئے اگر مبلغ کا کلام کتنا ہی مدلل و شیریں کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر اس کا اپنا عمل اس کی تائید نہیں کرتا تو وہ بے اثر ہے۔ البتہ اگر وہ خود لوگوں کے سامنے اپنے اخلاق و کردار کا عملی نمونہ پیش کرے تو یقیناً لوگ متاثر ہوں گے۔ قرآن پاک یہود کے قول و فعل کے فرق کی یوں نشاندہی کرتا ہے۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ (البقرۃ: ۴۴) کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے اس کا عملی نمونہ بھی پیش کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ لوگ خود بخود آپ کی طرف کھچے چلے آتے تھے اور تئیس سال کے قلیل عرصہ میں

پورا عرب آپؐ کے گرد جمع ہو چکا تھا۔ آپؐ نے مسلمانوں کو بھی قول و عمل میں یکسانیت پیدا کرنے اور دوسرے کے لئے خود کو عملی نمونہ بنانے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔

۳۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج آسمانوں پر تشریف لے گئے تو وہاں دیکھا کہ ایک جماعت کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کترے جاتے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا کہ کون لوگ ہیں؟ حضرت جبرائیل نے عرض کیا کہ یہ آپؐ کی امت کے واعظ اور مقرر ہیں کہ دوسروں کو نصیحت کرتے تھے اور خود عمل نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسری حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ بدکار علماء کی طرف عذاب جہنم زیادہ سرعت سے چلے گا وہ اس پر تعجب کریں گے کہ بت پرستوں سے بھی پہلے انہیں عذاب دیا جاتا ہے تو جواب ملے گا کہ جاننے کے باوجود کسی جرم کا کرنا انجان ہو کر کرنے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ نیز آپؐ نے فرمایا ہے کہ جنتیوں میں سے چند لوگ بعض جہنمیوں سے جا کر پوچھیں گے کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے ہم تو جنت میں تمہاری بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرنے کی بدولت پہنچے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہم تم کو بتلاتے تھے مگر خود عمل نہیں کرتے تھے۔

ان احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دوسروں کو تبلیغ کرنے سے پیشتر خود کو باعمل بنانا اشد ضروری ہے۔ اشاعت اسلام کی تاریخ دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ زبانی ہدایت کی نسبت مسلمانوں کی اخلاقی کشش تبلیغ اسلام میں زیادہ اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔ بہت سے ایسے ممالک ہیں کہ جہاں محض اسلامی افواج کے اخلاق سے متاثر ہو کر لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور فی الواقع دنیا میں بہت سے ایسے خطے ہیں کہ جہاں مسلمان فاتح کی حیثیت سے کبھی نہیں پہنچے لیکن وہاں مسلمان تاجر یا صوفیاء پہنچے اور اپنی اخلاقی کشش سے لوگوں کو قبول اسلام پر آمادہ کر دیا۔

۲۔ **حکمت و موعظت:** تبلیغ دین کا دوسرا اہم اصول تعلیمات اسلام کو نہایت دلنشین اور حکیمانہ انداز میں پیش کرنا ہے۔ تبلیغ کرتے وقت سننے والے کی ذہنی استطاعت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ اسی کے مطابق دلائل و براہین پیش کئے جائیں اور وہ شخص بآسانی سمجھ لے اور قبول کر لے۔ دراصل فریق مخالف کو موثر انداز میں نیکی اور بدی

کی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہیئے اور گفتگو اس انداز سے کرنی چاہیئے کہ عقل تسلیم کرلے اور ہر بات کا معقول و مدلل جواب دینا چاہیئے۔ لیکن اگر سننے والا عقلی دلائل نہ سمجھ سکتا ہو تو اسے مخلصانہ نصیحت کی جائے۔ گذشتہ عوام کے عبرت آموز واقعات کی مثالیں دے کر نیکی و بدی کے انجام سے آگاہ کیا جائے اور اگر فریق مخالف خواہ مخواہ الجھے تو ایسے لوگوں کو ان کی بدکلامی کا جواب بدزبانی و بد اخلاقی سے نہیں بلکہ نہایت تہذیب و شائستگی سے دینا چاہیئے۔ حتیٰ کہ اگر الزام بھی دینا ہو تو بہترین اسلوب اختیار کیا جائے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ (الخ) النحل ۱۲۹

تم اپنے پروردگار کے راستے کی طرف۔ حکمت و دانائی اور عمدہ کلام سے بلاؤ۔ اور ان سے اچھے طریقے سے بحث کرو۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

وَقُلْ لَّھُمْ فِیْ اَنْفُسِھِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا:

اور (اے نبیؐ) آپؐ ان سے ایسی بات کہئے جو انہیں عاجز کر دے۔

۳۔ تدریج: تبلیغ کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ شریعت کے احکام آہستہ آہستہ پیش کئے جائیں تاکہ سننے والا وقت اور بوجھ محسوس نہ کرے کیونکہ اگر ابتدا ہی میں تمام تفصیلات و جزئیات کا بوجھ ڈال دیا جائے تو نفسیاتی طور پر طبیعت میں گھبراہٹ و وحشت پیدا ہوتی ہے لہذا سب سے پہلے توحید و رسالت کی تعلیم دی جائے پھر اہم و ضروری عبادات مثلاً نماز اور زکوٰۃ۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے احکام بتانے چاہئیں۔ بلکہ فریق مخالف کے سامنے جو مشترک اقدار ہوں۔ آغاز انہی سے کیا جائے۔ کیونکہ اس طرح فریقین ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آجاتے ہیں اور باقی اختلاف کا ختم کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اہل کتاب کو تبلیغ دین کا طریقہ یہ بتایا ہے۔

قُلْ یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ

(اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور

اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

(آل عمران)

تمہارے درمیان مشترک ہے یہ کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں

آنحضور صلی اللہ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو جب یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا

"اے معاذ! تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے اس بات کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتانا کہ خدا نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتانا کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے۔ صدقہ ان کے دولتمندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دینا"

اسی ضمن میں یہ بات بھی ضروری ہے کہ دین کو آسان صورت میں پیش کیا جائے اور مشکل طریق اختیار کرنے سے گریز کیا جائے۔ لوگوں کو بشارت اور خوشخبری سنائی جائے اور انہیں متنفر نہ کیا جائے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجتے وقت یہ بھی نصیحت کی کہ "دین الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا۔ سخت بنا کر نہیں اور لوگوں کو خوشخبری دینا اور متنفر نہ کرنا"۔ (بخاری)

۴۔ **نرم گفتاری:** تبلیغ کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ بات کہتے ہوئے نہایت نرمی و حلیمی اختیار کی جائے اور درشتی و سخت کلامی سے اجتناب کیا جائے تاکہ طبیعت جلد نصیحت قبول کرے۔ خدا تعالیٰ نے جب موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرعون کی طرف تبلیغ کے لئے بھیجا تو فرمایا

فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوۡ يَخۡشٰى ۔

پس تم دونوں اس سے نرمی سے گفتگو کرنا۔ شاید وہ نصیحت حاصل کر لے یا خدا سے ڈر جائے۔

اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کے مذہب پر ناروا حملے کئے جائیں اور برا بھلا کہا

جائے جس سے دوسروں کے جذبات مجروح ہوں اور وہ جواباً اسلام کے بارے میں لب کشائی کرے بلکہ اسلام کے نزدیک تمام مذاہب، ان کے ہادی۔ مذہبی کتابیں اور دینی شعار سب قابلِ احترام ہیں۔ اس لئے کسی مذہب یا اس کے ہادی کو برا بھلا کہنے اور طعن و تشنیع کی اجازت نہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ۔

اور تم ان کو برا نہ کہو جو وہ خدا کے سوا پکارتے ہیں پس وہ اپنی جہالت میں اللہ تعالیٰ کو برا کہیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر جماعت کے اعمال اسے خوبصورت بنا کر دکھائے ہیں۔

اس سلسلے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ زندہ مثال ہے۔ آپؐ کی خدمت میں ایک نوجوان حاضر ہوا اور زنا کی اجازت چاہی۔ صحابہ کرامؓ اس بات کی تاب نہ لاسکے اور ناراض ہونے لگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو فرمایا قریب ہو جاؤ اور پھر کہا کیا تو چاہتا ہے کہ کوئی تیری ماں کے ساتھ زنا کرے۔ کہا کہ میں آپؐ کے قربان جاؤں ہرگز نہیں۔ فرمایا اس طرح اور لوگ بھی نہیں چاہتے کہ ان کی ماؤں کے ساتھ زنا کیا جائے۔ پھر فرمایا کیا تو پسند کرتا ہے کہ کوئی تیری بیٹی سے زنا کرے۔ عرض کیا میں آپؐ کے قربان جاؤں نہیں۔ فرمایا اسی طرح اور لوگ بھی نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹیوں سے زنا کیا جائے۔ غرض اس طرح آپؐ نے بہن خالہ اور پھوپھی کے بارے میں پوچھ کر اپنا دستِ مبارک اس شخص کے سینے پر رکھا اور دعا فرمائی کہ اے اللہ! اس کے دل کو پاک کر، گناہ معاف فرما اور شرمگاہ کو معصیت سے محفوظ رکھ۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد زنا کے برابر کوئی چیز اس شخص کے نزدیک مبغوض نہ تھی۔

۵۔ تالیفِ قلوب: تبلیغ میں حصولِ کامیابی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نومسلموں کی تالیفِ قلوب یعنی دلداری و دلجوئی کی جائے اور ان پر مال خرچ کیا جائے۔ تاکہ وہ صحیح معنوں میں اسلام کے وفادار بن جائیں۔ قرآن پاک میں مؤلفۃ القلوب کو بیت المال سے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مولفۃ القلوب یعنی نومسلموں کی بہت دلجوئی فرمایا کرتے تھے اور انہیں بہت بڑے عطیے دیا کرتے تھے۔ غزوہ حنین کے موقعہ پر آپؐ نے سارا مال غنیمت نومسلموں میں تقسیم کر دیا۔ حدیث ہے کہ ایک مرتبہ ایک بدو نے حضورؐ سے عرض کیا کہ ان دو پہاڑیوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں مجھے عطا کر دیئے جائیں آپؐ نے وہ سب اسے دے دیئے یہ فیاضی دیکھ کر وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے قبیلہ والوں سے کہا: "بھائیو اسلام قبول کرو۔ محمدؐ اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر نہیں رہتا۔"

مبلغ کے اوصاف

تبلیغ دین کے سلسلہ میں مبلغ کی اپنی شخصیت بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لئے اسے مندرجہ ذیل اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔

۱۔ عالم: مبلغ کو کتاب و سنت اور دیگر تعلیمات اسلامی سے واقفیت ہونی چاہیئے۔

۲۔ متقی: مبلغ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ متقی و پرہیزگار ہو۔ خود تعلیمات اسلامی کا عملی نمونہ پیش کرے۔

۳۔ حلیم و شفیق: اسے لوگوں کے لئے حلیم و شفیق ہونا چاہیئے۔ درشتی و سختی اور نخوت و تکبر سے پیش نہ آئے اور دوسروں کی سختی و درشتی کا جواب رفق و نرمی سے دے۔

۴۔ حق گو و بیباک: اسے حق گو، جرأت مند اور بیباک ہونا چاہیئے تاکہ جابر سے جابر سلطان کے سامنے بھی کلمۂ حق کہنے سے گریز نہ کرے۔

۵۔ غیر متعصب: یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تعصب سے بالاتر ہو اور کسی گروہ یا جماعت کی دوستی یا دشمنی اسے حق گوئی سے باز نہ کرے۔

۶۔ مخلص: اسے اپنے کام میں مخلص ہونا چاہیئے اور کوئی بھی ذاتی غرض مقصود نہ ہو بلکہ محض خدا کی رضا جوئی کے لئے تبلیغ کرے۔

۷۔ **حکمتِ عملی:** یہ بھی لازمی ہے کہ وہ تبلیغ میں حکمت و دانائی سے کام لیتا ہو اور سامعین کی عقل و فہم کے معیار کے مطابق گفتگو کرتا ہو۔

۸۔ **خود کفیل:** اسے اپنی روزی کا خود کفیل ہونا چاہیئے تا کہ وہ دوسروں کا دستِ نگر بن کر احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو۔

۹۔ **امارت:** اس میں امارت کے تمام اوصاف مثلاً شجاعت، سخاوت، تدبر، سیاست وغیرہ ہونے چاہیئیں تا کہ وہ صحیح طور پر فریضہ تبلیغ انجام دے سکے۔

۱۰۔ **مجاہد:** اس میں مجاہد کے اوصاف ہونا بھی ضروری ہیں۔ یعنی دلیری، بہادری، جوانمردی وغیرہ کیونکہ معلوم نہیں اسے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔

جہاد

مفہوم: جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے جس کے معنی محنت، مشقت اور کوشش کے ہیں اور جہاد کے معنی مشقت اٹھانا اور کوشش کرنا ہیں۔ اصطلاح میں جہاد خدا کی رضا جوئی کی خاطر حق کی حفاظت، سربلندی اور اشاعت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد کرنا اور باطل طاقتوں کا پوری قوت وطاقت کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔

قرآن پاک میں جہاد کے لئے "قتال" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے لیکن جہاد و قتال میں بڑا فرق ہے۔ قتال کے معنی دشمنانِ اسلام سے جنگ و جدل کرنا ہے جب کہ جہاد کے معنی دین حق کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی کوشش وکاوش کرنا ہے۔ اس لئے ہر جہاد قتال نہیں ہوتا بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں ان دونوں الفاظ کے استعمال میں بھی اس فرق کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

دراصل جہاد کا مفہوم نہایت وسیع ہے اور ایک مسلمان کی ساری زندگی پر حاوی ہے۔ اس میں فکری، قولی، مالی اور جانی ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے۔ دین حق کی اشاعت اور حفاظت و سربلندی اور امت مسلمہ کے دفاع کے لئے غور وفکر کرنا، زبان وقلم سے کوشش کرنا، اپنا مال و دولت خرچ کرنا یا دشمن کے مقابلہ پر خود سینہ سپر ہو جانا سب جہاد ہے۔ مختصر یہ کہ خداتعالیٰ کے راستے میں ہر قسم کی کوشش وکاوش اور ایثار و قربانی جہاد کو جہاد کہتے ہیں۔

جنگ کے لئے عربی میں لفظ حرب مستعمل ہے اور اس سے مراد

جہاد اور جنگ میں فرق: قوموں اور سلطنتوں کی وہ لڑائیاں ہیں جو محض افراد یا جماعتوں کے نفسانی اغراض کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ ان جنگوں اور لڑائیوں کا سبب اقتدار و دولت کا حصول اور ملک گیری کی ہوس ہوتا ہے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی سنگدلی و وحشت کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضورؐ نے اس لفظ کو بنظر کراہت دیکھا اور اس کی بجائے جہاد کا لفظ استعمال کیا جس سے مراد وہ جنگ ہے جو حق کے دفاع اور نوعِ انسا

کی فلاح کیلئے لڑی جائے ۔ جنگ اور جہاد کا فرق حسب ذیل ہے ۔

۱ ۔ جنگ ۔ صرف دنیاوی مقاصد کی تکمیل کے لئے لڑی جاتی ہے جبکہ جہاد خدا کی خوشنودی ورضا کے حصول کے لئے کیا جاتا ہے ۔

۲ ۔ جنگ کا مقصد دنیاوی اقتدار و دولت کا حصول اور ملک گیری کی تمنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جہاد محض حق کے دفاع اور نیکی کی اشاعت و سربلندی کیلئے کیا جاتا ہے ۔

۳ ۔ جنگ میں ہر قسم کا ظلم و ستم، سنگدلی و وحشت اور لوٹ کھسوٹ جائز ہے جب کہ جہاد میں جنگ پر انسانیت، شرافت اور نیکی و اخلاق کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور صرف اسی کو قتل کیا جاتا ہے جو مقابلہ پر آتا ہے ۔

۴ ۔ جنگ کا نتیجہ تباہی و بربادی ہے لیکن جہاد کا نتیجہ امن عالم کا قیام اور فلاح انسانی کا پیغام ہے ۔

جہاد کا مقصد: اسلام اور دوسرے مذاہب میں نمایاں فرق یہ ہے کہ اسلام محض مذہب ہی نہیں بلکہ ایک اجتماعی تحریک بھی ہے جس کا مقصد بنی نوع انسان کے لئے پر امن زندگی کی فضا قائم کرنا اور فلاح انسانی کا انتظام کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی فکری، قولی، مالی اور جانی کوششوں کو اسلام جہاد کے نام سے تعبیر کرتا ہے ۔ چونکہ یہ ساری کوششیں کسی دنیاوی لالچ کے تحت نہیں بلکہ محض خدا تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے کی جاتی ہیں اس لئے جہاد کو صرف جہاد نہیں بلکہ "جہاد فی سبیل اللہ" (اللہ کے راستے میں جدوجہد) کہا جاتا ہے ۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جہاد کا اصلی مقصد دنیا سے فتنہ و فساد دور کر کے خدا کا قانون نافذ کرنا ہے تاکہ اس کی رضا حاصل ہو ۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ	جو ایمان لائے وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ شیطان کے راستے میں لڑتے ہیں ۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا کہ راہ خدا میں جنگ کرنے سے

کیا مراد ہے؟ ایک شخص مال کے لئے جنگ کرتا ہے دوسرا بہادری کی شہرت حاصل کرنے کے لئے اور تیسرا کسی سے عداوت یا قومی حمیت کے جوش میں لڑتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "اللہ کے راستے میں صرف اسی شخص کی جنگ ہے جو خدا کا بول بالا رکھنے کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا۔" نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی شخص نے جنگ کی اور اس کے دل میں اونٹ باندھنے کی ایک رسی حاصل کرنے کی بھی نیت ہوئی تو اس کے لئے وہی ہے جس کا اس نے ارادہ کیا۔

اہمیت و فضیلت

جہاد کی ضرورت، اہمیت اور فضیلت درج ذیل ہے۔

۱ ناگزیر ضرورت: امن عالم کے قیام اور فلاح انسانی کے لئے جہاد ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ کائنات کا نظام تضاد اور مسابقت کے اصول پر چل رہا ہے۔ ہر قوت کے لئے ایک نہ ایک مخالف قوت اور ہر قوم کے لئے مخالف قوم ضرور ہوتی ہے۔ روشنی کے مقابلہ پر تاریکی، نرمی کے بالمقابل سختی، صحت کے مقابلہ پر بیماری اور نیکی کے مقابل بدی روز اول سے چلی آتی ہے۔ اسی طرح حق اور باطل دو مقابل قوتیں ہیں جو ابتدا ہی سے ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں۔ حق و باطل کی جنگ میں حق کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے ہمیشہ دفاعی پہلو اختیار کیا ہے اور کبھی جارحانہ اقدام نہیں اٹھایا لیکن باطل کا یہ وصف ہے کہ ہمیشہ سے حق کو مٹانے کے درپے ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ حق و باطل کا تصادم ہے۔ باطل قوتیں ہر وقت دنیا میں فتنہ و فساد پھیلاتی رہتی ہیں اور حق کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لہٰذا روئے زمین سے فتنہ و فساد دور کرکے امن عالم کے قیام اور حق کی حفاظت و سربلندی کے لئے ضروری ہے کہ حق پرست لوگ باطل طاقتوں کے مقابلہ پر سینہ سپر ہوں تاکہ باطل طاقتوں کا خاتمہ کیا جاسکے اور بنی نوع انسان کو فلاح حاصل ہو۔

۱۰۲ افضل ترین عبادت: جہاد کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جہاد اعلیٰ ترین عبادت ہے۔ تمام عبادات سے بڑھ کر اس کا ثواب ہے بلکہ دیگر عبادات کا مقصد بھی جہاد ہی کی تربیت دینا ہے۔ نماز جہاد بالنفس کی تربیت دیتی ہے۔ زکوٰۃ سے جہاد بالمال کی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ روزہ جہاد بالنفس سکھاتا ہے اور حج سے جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں کی تربیت ملتی ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "خدا کی راہ میں لڑنے والا ایسا ہے جیسا روزہ رکھنے والا عبادت گذار اور قرآن خواں جو کبھی روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے سے نہیں تھکتا۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا ایک شب و روز کی نگرانی ایک مہینے کے مسلسل روزوں اور نمازوں سے بھی افضل ہے۔ (مسلم) نیز فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے ایک صبح یا شام کا سفر دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے اور راہ خدا میں دشمن کے بالمقابل ٹھہرنا گھر کی ستر برس کی نمازوں سے بہتر ہے۔

۳۔ قرآن پاک کی تاکید: قرآن پاک میں جہاد کرنے کی بہت تاکید و تلقین کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ. (حج ۷۸)	اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ (بقرہ ۱۹۰)	اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ. (بقرہ ۲۱۶)	تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے اگرچہ وہ تمہیں ناپسند ہے اور ممکن ہے تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو۔

ایک مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دلائی گئی ہے جیسا کہ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (انفال: ٦٥)

(اے نبی) مومنوں کو جہاد پر ابھارئیے اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے سو ہوں گے تو کافروں میں سے ہزار پر غالب آئیں گے کیونکہ وہ ایسی قوم ہے کہ سمجھ نہیں رکھتے۔

ایک جگہ جہاد کی غرض و غایت اور ضرورت یہ بیان کی گئی ہے کہ دنیا میں فتنہ و فساد ختم کرنے اور امن و امان قائم کرنے کے لئے رحمت خداوندی از بس ضروری ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:۔

لَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (البقرة: ۲۵۱)

اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے باز نہ رکھتا تو زمین میں فساد پیدا ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ سب جہانوں پر رحم کرنے والا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر یہ بتایا گیا ہے کہ اگر جہاد نہ کیا جائے تو نیکی کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ (الحج)

اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے۔ سب منہدم ہو گئے ہوتے۔

جہاد کی اہمیت و فضیلت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ میدانِ جہاد میں کام

آنے والے کو خدا تعالیٰ نے مردہ کہنے کی اجازت نہیں دی بلکہ انہیں دائمی وابدی زندگی عطا کی ہے جیسا کہ فرمایا:

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (البقرۃ ۱۵۴)

اور خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں. لیکن تمہیں اس بات کا شعور نہیں ہے۔

نیز فرمایا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ.

(آل عمران: ۱۶۹)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دئے جاتے ہیں۔

اللہ کی راہ میں مالی وجانی جہاد کرنے والوں کے متعلق فرمایا:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (الحجرات: ۱۵)

مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے شک نہ کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

۴۔ **احادیث نبوی:** آنحضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جہاد کی بہت زیادہ اہمیت وفضیلت بیان فرمائی ہے۔ ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ "جو شخص اللہ کے راستے میں ایک تیر چلاتا ہے اسے ایک غلام آزاد کرنے کا بدلہ ملتا ہے"

نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر کے عوض جو اس کے راستے میں چلایا گیا ہے تین شخصوں کو جنت میں داخل کرتا ہے ایک اس کا بنانے والا، دوسرا چلانے والا اور تیسرا اس کا مہیا کرنے والا

آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاؤں خدا کی راہ میں غبار آلود ہو جائیں پھر ان کو دوزخ

کی آگ نہیں چھوئی (بخاری) آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جہاد کے لئے اللہ پاک کے راستے میں ایک صبح یا شام چل دینا اس کی ساری دولت سے بہتر ہے (بخاری شریف)

جہاد کی فضیلت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خدا کے راستے میں شہید ہونے والا بار بار دنیا میں آنے اور مرتبہ شہادت حاصل کرنے کی تمنا کرے گا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص دنیا میں اس خیال سے واپس آنے کو پسند نہیں کرے گا کہ زمین میں جو کچھ ہے اس کو پھر مل جائے گا مگر شہید کی آرزو ہو گی کہ وہ دنیا میں واپس ہو جائے اور دس مرتبہ مارا جائے اس لئے کہ وہ شہادت کی عظمت اور ثواب کو جانتا ہے (بخاری و مسلم)

پھر خدا کی راہ میں جان دینے والے کا عمل کبھی منقطع نہیں ہوتا جیسا کہ آپ نے فرمایا "ہر مرنے والے کا عمل اس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن اس شخص کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں جنگی پڑاؤ ڈالنے والا ہوتا ہے کیونکہ اس کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے۔

حدیث ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پھر پوچھا گیا اس کے بعد کیا؟ فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں سے کونسا افضل ہے! فرمایا وہ مومن جو خدا کے راستے میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرتا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ مجاہدین کے لئے اللہ تعالیٰ نے جنت میں سو درجے رکھے ہیں۔

اقسام جہاد

جہاد فی سبیل اللہ کی مختلف قسمیں یا صورتیں مندرجہ ذیل ہیں:

1. جہاد بالنفس (قلبی و نفسانی جہاد) جہاد بالنفس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر اور نفسانی خواہشات سے جہاد کرے اور اپنے دل کو تمام آلائشوں اور برائیوں سے پاکیزہ رکھے۔ اسے تزکیہ نفس بھی کہا جاتا ہے۔ اور علماء و صوفیاء کے نزدیک یہ جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ درحقیقت جہاد کا اصل مقصد بھی نفس انسانی کو اندرونی و بیرونی

برائیوں سے محفوظ رکھنا اور احکام الٰہی کا پابند کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (العنکبوت: ۶)

اور جو کوئی جہاد کرتا ہے تو وہ اپنے لئے کرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جہان والوں سے بے نیاز ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے جہاد کرو۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ مجاہد ▪ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے جہاد کرے۔

ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ فرمایا "ہم جہادِ اصغر سے اب جہادِ اکبر کی طرف جا رہے ہیں" آپؐ کی یہ مراد تھی کہ کفار سے جنگ کرنا جہادِ اصغر ہے بلکہ تزکیہ نفس کی خاطر مسلسل جدوجہد کرنا جہادِ اکبر ہے کیونکہ یہ جنگ سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

۲۔ جہاد بالعلم (ذہنی و فکری جہاد) جہاد بالعلم سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی عقل و معرفت اور حکمت و دانش کو بروئے کار لا کر حق و صداقت اور نیکی و بھلائی کی اشاعت و سربلندی کے لئے مختلف تدابیر سوچے نیز عملی جہاد کرنے والوں کو دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کی تدابیر بتائے۔

درحقیقت علم حاصل کرنا بذاتِ خود ایک جہاد ہے بشرطیکہ اس کا مقصد نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود اور حق کی نشر و اشاعت اور نصرت و تائید کرنا ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ طالب علم کی موت شہادت ہے۔

۳۔ جہاد بالقلم یا جہاد باللسان (قولی و لسانی جہاد): جہاد بالقلم سے مراد یہ ہے کہ خدا کے راستے میں زبان و قلم کی کوششوں کو صرف کیا جائے۔ دینِ اسلام کے خلاف جن جن شبہات و اعتراضات اور دلائل کو پیش کیا جائے ان کا مناسب جواب دیا جائے۔ نیز حق اور نیکی کی اشاعت و ترویج کے لئے زبان و قلم سے جدوجہد کی جائے۔ قرآن پاک کے احکامات کی تقریر و تحریر کے ذریعے نشر و اشاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان: ۵۲)

پس ان کافروں کا کہا مت ماننے اور بذریعہ قرآن پاک ان سے جہاد کیجئے جو بڑا جہاد ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "مشرکین کے ساتھ اپنے مالوں، جانوں اور زبانوں کے ساتھ جہاد کرو۔" ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے پیشتر اللہ تعالی نے جس نبی کو بھیجا اس کو اپنی امت سے ایسے ساتھی اور رفیق ملے جو اس کے طریقے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے اور احکام کا اتباع کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ایسے نافرمان آگئے۔ جن کا یہ حال تھا کہ جو کچھ کہتے اس پر عمل نہ کرتے تھے اور وہ کرتے جس کا حکم نہ دیتے تھے۔ پس جس شخص نے بھی اپنے ہاتھ کے ذریعے ان سے جہاد کیا وہ مومن ہے۔ جس نے اپنی زبان کے ساتھ جہاد کیا وہ بھی مومن ہے جس نے اپنے دل کے ساتھ جہاد کیا وہ بھی مومن ہے۔ اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔ (مشکوٰۃ)

۴۔ جہاد بالمال (مالی جہاد): جہاد بالمال کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر اس کے راستے میں اپنا مال صرف کیا جائے۔ دین وملت کے تحفظ میں خرچ کیا جائے اور جانی جہاد میں شرکت کرنے والوں کی ضروریات اسلحہ و رسد وغیرہ مہیا کرنے میں لگایا جائے۔

جہاد بالمال کی اہمیت ظاہر ہے۔ جنگ کی تیاری اور اسلحہ و رسد کی خرید کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر جہاد پر جانے والوں کے لواحقین کے لئے مالی امداد درکار ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اس کڑے وقت میں قوم وملت کی خاطر مال خرچ نہ کیا جائے تو دشمن سے ہزیمت اٹھانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ پھر مالی جہاد میں شرکت کرنا اور ثواب حاصل کرنا نسبتاً آسان ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق مالی جہاد میں حصہ لے سکتا ہے نیز بوڑھے، مریض اور اپاہج جو جانی جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے مالی جہاد کا ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔ مالی جہاد کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ہی قرآن پاک نے جہاں جانی جہاد کا حکم دیا مالی جہاد کا پہلے ذکر کیا ارشاد ہوتا ہے:۔

جَاهِدُوا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ — اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ — تم اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو گے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مالی جہاد کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "تم مشرکین کے ساتھ اپنے مالوں، جانوں اور زبانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ جس نے اللہ کی راہ میں مجاہد کو سامان مہیا کیا اس نے گویا خود جہاد کیا اور جس نے کسی مجاہد کے اہل و عیال کی اس کی عدم موجودگی میں دیکھ بھال کی وہ گویا خود شریک جہاد رہا۔ (مشکوٰۃ)

۵۔ جہاد بالجسم (جانی یا بدنی جہاد یا قتال) جہاد کی سب سے اعلیٰ صورت جانی یا بدنی جہاد کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خود عملاً میدانِ جہاد میں دشمن کے مقابلہ پر سینہ سپر ہو جائے۔ اسے قتال بھی کہتے ہیں اور عام طور پر جہاد سے مراد بدنی جہاد ہی ہوتا ہے قرآنِ پاک میں اس کی بہت ہی زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ط — ان لوگوں کو جہاد کی اجازت دی گئی جن سے لوگ لڑتے ہیں اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (البقرۃ: ۱۹۰) — اور اللہ کے راستے میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جانی جہاد کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے مال بھیجے اور خود گھر میں رہے اس کو ہر درہم کے بدلے سو درہم ملیں گے اور جو شخص خود خدا کی راہ میں لڑا اور جہاد میں اپنا مال بھی خرچ کیا اس کو ہر

درہم کے بدلے سات لاکھ درہم ملیں گے۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ (بقرہ ۲۶۱) اور اللہ جسے چاہے کئی گنا بڑھا کر دیتا ہے۔

جانی جہاد کی اقسام

جانی جہاد کی دو قسمیں ہیں ۔ ۱۔ دفاعی ۲۔ اقدامی

۱۔ دفاعی جہاد: جب دشمن مملکت اسلامیہ پر حملہ کر دے اور اہل اسلام کو امن وسکون کی زندگی بسر کرنے میں حائل ہو تو اس وقت مسلمانوں کا اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لئے لڑنا دفاعی جہاد کہلاتا ہے۔ اس صورت میں دین اسلام اور ملت اسلامیہ کی حفاظت مسلمان پہ فرض ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے اسی جہاد کا حکم دیا گیا تھا اور عہد رسالتؐ کی تمام جنگیں غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ احزاب وغیرہ جہاد کی اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔

۲۔ اقدامی جہاد: جب غیر مسلم حکومتیں اسلام کی تبلیغ واشاعت میں رکاوٹیں پیدا کریں اور اپنے ملک میں مسلمانوں پر ظلم وستم کریں تو مسلمانوں کا ان رکاوٹوں کو دور کرنے اور اپنے مسلمان بھائیوں کو ظلم وستم سے نجات دلانے کے لئے جنگ کرنا اقدامی جہاد کہلاتا ہے۔ خدا کا پیغام تمام بنی نوع انسان تک پہنچانا اور اپنے مسلمان بھائیوں کی حفاظت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس لئے ان صورتوں میں کہ خدا کا پیغام پہنچانے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے یا مسلمان زیر ستم ہوں تو اقدامی جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

شرائطِ جہاد

جہاد اندھا دھند شمشیر زنی اور قتل وغارت کا نام نہیں بلکہ جہاد کے آغاز کے لئے بعض مخصوص شرائط ہیں۔ ان شرائط میں سے کسی ایک کے پورا ہونے کی صورت میں جہاد فرض ہو جاتا ہے اس کے بعد رکنا کفر ہے۔ البتہ جہاد فرض کفایہ ہے یعنی اتنے آدمی جہاد کے لئے نکل پڑیں جو دشمن کے مقابلہ پر کافی ہوں تو یہ فرض سب کی طرف سے ادا ہو جاتا

ہے لیکن اگر اتنے آدمی مقابلہ کے لئے نہ نکلیں تو یہ فرض عین یعنی سب پر فرض رہتا ہے۔ جہاد کے فرض ہونے کی شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱۔ دشمن اسلامی مملکت پر حملہ آور ہو۔

۲۔ غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں پر ظلم وستم کیا جاتا ہو اور ان کے جان و مال غیر محفوظ ہوں۔

۳۔ دشمن مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو تباہ و برباد کرے اور مسلمانوں کو خدا کی عبادت اور اسلامی رسوم کی ادائیگی سے روکے۔

۴۔ دشمن وعدہ خلافی کرے اور فتنہ و فساد پھیلانے کا موجب ہو۔

۵۔ دشمن تبلیغ اسلام کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرے۔

جب جہاد کی فرضیت کا اعلان ہو جائے تو دشمن سے برسر پیکار ہوتے ہوئے مندرجہ ذیل شرائط کو مدنظر رکھا جائے گا۔

۱۔ جہاد میں تامل کرنا، دشمن کو پیٹھ دکھانا اور فرار کرنا سخت گناہ ہے اور اس کی سزا جہنم ہے۔

۲۔ جہاد سے قبل لڑائی کے لئے ضروری سامان اسلحہ، رسد وغیرہ تیار کر لینا چاہیئے۔

۳۔ دشمن کے مقابلہ پر اپنی قلت کے باوجود جاں نثاری اور سرفروشی سے لڑنا چاہئے۔

۴۔ جنگ کے دوران وحشیت و بربریت سے اجتناب کیا جائے۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، زخمیوں وغیرہ پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، دشمن کا مثلہ نہ کیا جائے اور کھیتوں اور مویشیوں کو تباہ نہ کیا جائے۔

۵۔ جہاد فقط اللہ کی خاطر کیا جائے اور دوران جہاد اسی سے فتح و نصرت مانگی جائے۔

۶۔ اگر دشمن صلح کرنے پر آمادگی ظاہر کرے تو فوراً جہاد سے رک جانا چاہئے۔

۷۔ فتح و کامیابی کی صورت میں مال غنیمت کو حسب شریعت تقسیم کر لیا جائے اور قیدیوں کا بھی شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔

مال غنیمت: غنیمت اس مال و متاع کو کہتے ہیں جو دشمن کے خلاف جہاد کرنے کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ آئے اس میں مال، اسباب، زر نقد،

اسلحہ، قیدی وغیرہ سب شامل ہیں۔ اسلام سے پہلی امتوں کے لئے یہ حلال نہ تھا۔ لیکن امت مسلمہ کے لئے اسے حلال قرار دے دیا گیا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہم سے پہلے کسی کے لئے غنیمت حلال نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ نے ہمارا ضعف و عجز دیکھ کر اسے ہمارے لئے حلال کر دیا (بخاری و مسلم) ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کو تمام امتوں سے افضل کیا اور ہمارے لئے غنیمت حلال کی (ترمذی)

عہدِ رسالت میں جب مال غنیمت آتا تو اسے مسجد نبوی کے صحن میں جمع کر دیا جاتا۔ اور آپ ؐ اسی وقت یہ مال حاجتمندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ قیدیوں کو کبھی فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ لئے رہا کر دیا جاتا یا انہیں بصورت دیگر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور وہ ان سے بہت عمدہ سلوک کرتے تھے۔

قرآن و سنت کے مطابق مال غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ چار حصے مجاہدین میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ مجاہدین میں مال تقسیم کرتے وقت عدل و انصاف کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے اور سوار کو پیدل کی نسبت دگنا ملتا ہے۔ کیونکہ ایک حصہ سواری کا خرچ ہے۔ غنیمت کا پانچواں حصہ یتیموں، مسکینوں، مسافروں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب اور رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ ہوتا ہے۔ آپ ؐ کے اقارب پر اس لئے کہ وہ زکوٰۃ و صدقات کے حقدار نہیں ہیں۔

جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً رہا کیا جا سکتا ہے۔ اگر انہیں غلام بنا لیا جائے تو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا لازمی ہے۔ ان کا مسلمان قیدیوں کے ساتھ تبادلہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ نیز قید میں بھی رکھا جا سکتا ہے اور سنگین مجرموں کو قتل کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

تاریخِ اسلام

قدیم تہذیبیں

طلوع اسلام کے وقت دنیا میں جہالت و تاریکی کا دور دورہ تھا انسانی معاشرہ متعدد خطوں میں منقسم تھا۔ تاہم زمانہ قبل از اسلام میں مختلف ادوار میں دنیا میں متعدد تہذیبیں عروج پر آئیں ذیل میں ان تہذیبوں کا سرسری خاکہ دیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اسلام نے آکر دنیا میں کیا انقلاب عظیم برپا کیا۔

آشوری یا بابلی تہذیب

قدیم زمانہ میں عراق دنیا کی تہذیب کا مرکز ہے۔ اور یہاں آشوری اور بابلی تہذیبیں جلوہ گر ہوئیں۔ کوئی ۴۰۰۰ ق م میں بابلی سلطنت قائم ہوئی۔ پھر دو ہزار قبل مسیح کے قریب آشوریوں نے سارے عراق پر قبضہ کر لیا۔ آشوریوں نے بابلی تہذیب کو اپنایا۔ اور اس میں بہت سے نئے اضافے کیے

ابتدا میں سمیری اور آشوری دونوں تہذیبوں میں ہر شہر میں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم تھیں۔ جو بالکل آزاد اور خود مختار ہوتی تھیں شہروں کے درمیان برابر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ کمزور حکمرانوں کو طاقت ور حکمران فتح کر کے اپنا باجگزار بنا لیتے ہیں۔ اس طرح بادشاہوں کا ظہور ہوا۔ لڑائیوں میں فاتح قوم مفتوح پر عموماً بہت ظلم ڈھاتی تھی۔ فوجیں بڑی منظم اور مستعد ہوتی تھیں۔ بادشاہ اور امرا رتھوں پر سوار ہو کر میدان جنگ میں جاتے تھے بابلی تہذیب کا سب سے بڑا کارنامہ ضابطہ قانون تھا۔ جو بادشاہ حمورابی نے تعمیر کیا۔ اگرچہ

اس میں قانون شکنی کی جو سزائیں درج تھیں۔ وہ بہت سخت تھیں مگر اس دور میں امن برقرار رکھنے کے لیے۔ یقیناً ایسی سزاؤں کی ضرورت ہوگی

بابلی اور آشوری لوگ فن تعمیر میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ ہر شہر کی سب سے زیادہ خوب صورت عمارت شہر کا مندر ہوتا تھا۔ مندر کے علاوہ بادشاہ کا محل بھی بہت خوب صورت ہوتا تھا۔ شہری باشندے تین طبقوں میں تقسیم تھے۔ امراء، غرباء اور غلام، غلام، امیروں کی نسبت غریبوں کو جرموں کی سزا زیادہ دی جاتی تھی۔ عورتوں کو کافی آزادی تھی۔ وہ جائداد کی مالک بن سکتی تھی۔ اور خود تجارت کر سکتی تھی۔ شادی ایک مقدس رسم تھی۔ ہر عورت کو شادی کے وقت جہیز دیا جاتا تھا۔ اگرچہ غلاموں کی حفاظت اور ان سے اچھے برتاؤ کے قوانین موجود تھے۔ مگر ان کی حالت اچھی نہ تھی۔

اہل بابل زراعت پیشہ لوگ تھے۔ ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کاشت اور مویشی تھے۔ انہوں نے دریائے دجلہ اور فرات سے نہریں نکال کر آب پاشی کا عمدہ بندوبست کر لیا تھا۔ ان کی خاص صنعت عمدہ کپڑا بننا تھی۔ یہ لوگ وسیع پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔ غلہ اور دیگر مصنوعات باہر بھیجی جاتی تھیں۔ تجارتی سامان کی نقل و حرکت کے لیے کشتیاں اور باربرداری کے جانور استعمال ہوتے تھے۔ تجارتی معاہدوں کا احترام کیا جاتا تھا۔ اور ان کو ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کیا جاتا تھا۔

اہل بابل نے لکھنے کا طریقہ ایجاد کر لیا۔ اس سے ان کی علمی و ادبی ترقی میں بہت مدد ملی، یہ تحریریں مٹی کی تختیوں پر ہوتی تھیں۔ نجی خطوط، تجارتی معاہدے حساب کتاب، رسیدیں، شاہی فرمان، قوانین، اور دستاویزیں وغیرہ انہی پر لکھی جاتی تھیں، مندروں میں سکول قائم تھے۔ جہاں لکھنا سکھایا جاتا تھا علم حساب علم ہیئت، علم نجوم، شاعری، فلسفہ، وغیرہ میں بھی یہ لوگ مہارت رکھتے تھے۔ ان کے شاعرانہ کمال کو دیکھ کر بہت حیرت ہوتی ہے۔ بابلی لوگ ہر قسم کے زیورات

بنالتے تھے۔ سنگ تراشی میں اتنے ماہر نہ تھے۔ مگر پتھر کی عمدہ تصویریں بنالیتے تھے۔ وہ برتن بھی بہت عمدہ بناتے تھے۔ جنہیں نقش و نگار سے سجا لیا کرتے تھے۔

مصری یا اسرائیلی تہذیب

مصر میں فرعون کی سختیوں سے عاجز آ کے یہودی (اسرائیلی) حضرت موسیٰ کی سرکردگی میں کنعان آ گئے۔ اور وہاں انہوں نے اسرائیلی حکومت قائم کر لی۔ ان کے دو مشہور حکمران گزرے حضرت داؤد اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان ان کی وفات کے بعد یہودی دو حصوں میں بٹ گئے۔ اور ان کو آشوری اور بابلی لوگوں نے اپنا محکوم بنالیا۔ آخر ایرانیوں نے ان کو آزادی دلائی اگرچہ وہ عرصہ تک یہودیوں کے باجگزار رہے۔ انہوں نے علیحدہ قومیت کو نشوونما دی۔ اور اپنے مذہبی پیشوا کے ملکت ایک حد تک خودمختاری حاصل کر لی۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے عہد حکومت میں یہودیوں نے ایک بلند پایہ نظم حکومت قائم کر لیا حضرت سلیمان نے یروشلم میں ایک محل اور عبادت گاہ تعمیر کرائی۔ اگرچہ یہودیوں نے سیاست معیشت اور فنون لطیفہ میں کوئی قابل قدر اضافے نہیں کیے۔ تاہم انہوں نے مذہب اور الٰہیات کے معاملے میں دنیا کی بڑی رہنمائی کی اور اہل علم کو متاثر کیا۔

تمام شامی لوگوں کی طرح یہودی بھی شروع میں بہت سے دیوتاؤں کو پوجتے تھے۔ مگر حضرت موسیٰ نے ان کو وحدانیت کے اصول سکھائے ان پر توریت نازل ہوئی۔ موسیٰ نے اپنے خدا کو "یہواہ" یا "جہواہ" کے نام سے پکارا۔ یہواہ کی پرستش کے باعث یہ لوگ یہودی کہلائے۔ حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد اسرائیلیوں میں اس میں بہت سی ترمیمیں کر لیں، مگر بہت سے پیغمبروں نے جو بعد میں آتے رہے۔ ان کی غلط رسوم کو مٹانے اور ان کو وحدانیت کے اصول پر قائم رکھنے کی کوشش کی۔ یہودیت کا سب سے بڑا اصول ایک خدا کی پرستش ہے۔

وہ فضول رسومات کے بہت خلاف ہے۔ اس میں نیک اعمال اور صالح کردار پر زور دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ مذہب محض عقائد کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ ایک نظام حیات ہے۔ تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کوشش کرتا ہے۔ یہ مذہب مجلسی زندگی کی ترغیب دیتا ہے۔ اور قوم اور خاندان کی اہمیت سکھاتا ہے۔ یہودیت زمین پر خدائی بادشاہت قائم کرنے کی آرزومند ہے۔

طلوع اسلام سے قبل یہودی مذہب بہت پستی کی حالت میں تھا۔ اس کی عمدہ تعلیمات کو یہودیوں نے فراموش کر دیا تھا۔ اور رسوم پرستی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ یہودی علماء نے اپنے مذہب کے تمام قوانین اور رسومات کو ایک ضابطے کی شکل دے دی تھی۔ مگر بعد میں بے شمار روایات کو بھی وہ مذہبی اصولوں کے ہم پلہ تصور کرنے لگے۔ اس طرح اس مذہب کی اصل شکل دے دی تھی۔ بہرحال عیسائیت کی بنیاد اس مذہب کے اصولوں اور رسومات پر رکھی گئی۔ اس لیے یہودیوں کی تاریخ عالم میں بڑی اہمیت ہے۔

بازنطینی یا رومی تہذیب

اپنے عروج کے زمانہ میں سلطنت روما یورپ، ایشیا اور افریقہ کے حصوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری صدی عیسوی میں اس سلطنت کو زوال آنے لگا۔ مگر چوتھی صدی عیسوی میں قسطنطین اول نے سلطنت کو مستحکم کیا۔ اس نے مشرقی حصے پر حکومت کرنے کے لیے ترکی میں آبنائے باسفورس پر ایک نیا شہر قسطنطنیہ آباد کیا اور وہاں سکونت اختیار کی۔ ۳۹۵ء میں جب رومی سلطنت مشرقی اور مغربی حصوں میں صاف طور پر بٹ گئی تو قسطنطنیہ مشرقی حصے کا صدر مقام بن گیا۔ کیونکہ یہ شہر یونانیوں کے شہر بازنطینی کے کھنڈروں پر بنایا گیا تھا۔ اس لیے یہ سلطنت بازنطینی سلطنت کہلائی۔ پانچویں صدی عیسوی میں جرمن وحشیوں نے مغربی سلطنت روما پر قبضہ کر لیا۔ مگر بازنطینی سلطنت اس کی دسترس سے باہر رہی۔

چھٹی صدی میں بازنطینی شہنشاہ جسٹینین نے اٹلی، سپین، اور شمالی افریقہ گاتھ اور ونڈال لوگوں سے جیت لیا۔ مگر آٹھویں صدی عیسوی میں اٹلی کا تمام علاقہ پھر بازنطینیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ جسٹینین کے بعد رومی حکومت یونانی رنگ میں رنگی گئی۔ ان کی سرکاری زبان یونانی ہو گئی۔ اگرچہ وہ خود کو رومی کہتے رہے مگر وہ ہر طرح سے یونانی بن چکے تھے۔ ظہور اسلام کے وقت بازنطینی رومی حکومت خانہ جنگی اور بیرونی حملے کے باعث زوال پذیر تھی۔ ایرانیوں نے ان سے مصر، فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک کے علاقے چھین لیے تھے۔ بیت المقدس میں لوٹ مار کر کے وہ صلیب مقدس بھی لے گئے تھے۔ مگر ۶۲۸ء میں رومی بادشاہ ہرقل نے ایران پر حملہ کر کے ایرانیوں کو مار بھگایا۔ اور صلیب بھی واپس لے لی تھی۔

بازنطینی حکمرانوں نے ایک مطلق العنان حکومت کی۔ شہنشاہ اور آقا ان کا لقب تھا۔ اپنے اقتدار کی نمائش کے لیے وہ سر پہ تاج اور عالیشان گلابی خلعت پہنتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ایرانیوں کی طرز پہ دربار سجانا شروع کر دیا تھا جس کے آداب و رسومات بھی ایرانی تھے۔ اور بادشاہ خود کو خدا کا مقرر کیا ہوا حکمران سمجھتا تھا۔ اور سوائے اعلیٰ حکام کے اس سے کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ اس کے اختیارات لامحدود تھے۔ اس پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی۔ ملک کی جس عورت کو وہ چاہتا نکاح کر سکتا تھا۔ وہ اپنی فوج اور حکام کے ذریعے حکومت کا کاروبار چلاتا تھا۔ رومی فوج زیادہ تر وحشی لوگوں پر مشتمل تھی۔ جن کو فوج میں بھرتی کر کے تربیت دی جاتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں رومی جرنیل سست اور عیاش ہو گئے تھے۔ اور رومی فوج کا معیار بہت گھٹ گیا تھا۔ دربار میں بہت سے وزیر ہوتے تھے۔ جو شہنشاہ کی انتظامی کونسل کے ممبر تھے۔ ہر وزیر ایک محکمہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اور صوبوں میں اس کے نائب ہوتے تھے۔ سرکاری ملازمین کو بھی فوجیوں کی طرح وردیاں، تنخواہ اور الاؤنس ملتا تھا۔ اور ان کی ترقی اور برطرفی کے بھی ویسے ہی اصول تھے۔ لیکن چونکہ ان کی تنخواہ کم تھی اس لیے وہ رشوت خور تھے۔ اس طرح انتظامی عملہ غیر تسلی بخش تھا۔ ملک کی اقتصادی

حالت اچھی نہ تھی۔ تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کا حال خراب تھا۔ ملک میں جاگیرداری نظام رائج تھا۔ اور کاشت کار غلاموں سے بدتر زندگی بسر کرتے تھے۔ لوگوں کو زبردستی مختلف پیشوں میں لگایا جاتا تھا۔ اور پیشہ تبدیل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی ایسا کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔ لوگوں پر ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔ عورتوں کو کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ کنیزیں رکھنا عام بات تھی خاص طور پر متوسط طبقہ بہت پریشان حال تھا۔ ان حالات میں بازنطینوں کی قابلیت اور صلاحیت بڑی حد تک برباد ہو گئی تھی۔ مدرسے اور سکول قائم تھے۔ جہاں پرانے علوم بڑے ذوق و شوق سے اور احترام سے پڑھائے جاتے تھے۔ علم و ادب میں جو کچھ ترقی کی گئی۔ وہ راہبوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مگر ان کی تصنیفات زیادہ تر عیسائی مذہب کے متعلق تھیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قانون کے میدان میں ہے۔ انہوں نے رومی قانون کو از سر مرتب کیا۔ اور اس کو تمام سلطنت میں نافذ کیا۔ فن تعمیر ہی ایک ایسا فن ہے جس میں رومیوں نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ انہوں نے بے شمار خوبصورت عمارتیں اور گرجے تعمیر کئے۔ یہ لوگ اپنی عمارتوں میں بہت ہی عمدگی سے رنگوں کا استعمال کرتے تھے۔ سینٹ صوفیہ کا گرجا گھر جو ۵۳۲ء اور ۵۳۷ء کے درمیان تعمیر ہوا تھا ان کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ بازنطینی فن معتوری کے ماہر تھے۔ اور شیشے کے ٹکڑوں پر خوب صورت تصاویر بناتے تھے۔ لہٰذا چھوٹے مجسمے بھی تراشتے تھے۔ بازنطینی ریاست کا سرکاری مذہب عیسائیت تھا۔ مگر اس کا روم کے پادری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ لوگ یونانی چرچ کے ماننے والے تھے۔ ان کا مذہب توہم پرستی کا مجموعہ تھا۔ یہ لوگ بہت سے فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جو ایک دوسرے کو کافر کہتے تھے۔ یسوع مسیح اور مریم کے مجسمے بنا کر گرجوں اور گھروں میں رکھتے تھے۔ ان کی خانقاہیں اخلاق سوز اور ناجائز حرکتوں کی آئینہ دار تھیں۔

ساسانی یا ایرانی تہذیب

ساسانی خاندان کی ابتدا تیسری صدی عیسوی میں ہوئی۔ اس سلطنت کا بانی اردشیر بابگان تھا۔ اس نے ۲۲۴ء میں ایران کے حکمران پارتھی کو شکست دے کر ایران پر قبضہ کر لیا۔ ساسانی خاندان نے چار سو سال حکومت کی اس خاندان کی بادشاہت ایرانی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ ان کی حکومت کے قیام سے ملک متحد ہوا۔ اور مرکزی حکومت قائم ہوئی یزدانیوں نے زرتشتی مذہب کو فروغ دیا۔ انہوں نے رومیوں پر حملہ کر کے ان سے وسیع علاقے چھین لیے۔ اور رومیوں کی مشرق میں پیش قدمی کو مؤثر طریقے سے روکا۔ ساسانی حکمران مطلق العنان بادشاہ تھے۔ ان کی حیثیت دیوتا اور اوتاروں کی سی تھی۔ لوگ ان کو پوجتے تھے۔ ان کی زبان ان کا قانون تھا۔ کسی کو اس میں حیل و حجت کی گنجائش نہ تھی۔ ان کا دربار بہت پرشکوہ ہوتا تھا۔ ہال کو خوبصورت اور قیمتی قالینوں سے سجایا جاتا تھا۔ امراء کے لیے ان کے مرتبے کے لحاظ سے نشستیں مخصوص تھیں۔ بادشاہ سے گفتگو کے دوران از حد مؤدب رہنا پڑتا تھا۔ بادشاہ ناچ رنگ کی محفلوں میں شریک ہو کر داد عیش دیتا تھا۔ بادشاہ جشن نوروز بڑے تزک و احتشام سے مناتا تھا۔ اس کی فیاضی ضرب المثل خیال کی جاتی تھی۔ اس موقع پر بادشاہ مالیہ کے تمام جمع شدہ رقوم۔ بادشاہ کے حضور پیش کی جاتی تھیں۔ نئے سکے جاری ہوتے تھے۔ اور نئے گورنر مقرر ہوتے تھے۔ بادشاہ انصاف کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اکثر منصف اعلیٰ کے فرائض انجام دیتا تھا۔ خاص موقعوں پر وہ لوگوں کی شکایات سنتا تھا۔ شاہی دربار میں نجومی، طبیب، شاعر اور خواجہ سرا موجود رہتے تھے۔ شاہی خاندان کے افراد اور حکام حکومت کے کام میں بادشاہ کی مدد کرتے تھے۔ ان کو بڑا اقتدار حاصل تھا۔ اور وہ لوگوں پر بڑا ظلم کرتے تھے

ساسانی عہد میں معاشرہ چار طبقوں میں منقسم تھا۔ مذہبی رہنما۔ امراء و حکام فوجی۔ عوام۔ امراء اور حکام اور شاہی خاندان کے تمام افراد کو تمام حقوق

اور مراعات حاصل تھیں۔ مگر عوام ہر قسم کی رعایت سے محروم تھے۔ ان کی حالت غلاموں کی طرح تھی۔ کاشت کار ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ بادشاہ اور امراء کی زندگیاں تمام اخلاقی خرابیوں کی ذمہ دار تھیں۔ عورتوں کی شخصیت حد درجہ پست تھی۔ وہ مردوں کے رحم و کرم پر تھیں۔ اور ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ ایک شخص جتنی چاہے بیویاں کر سکتا تھا۔ کنیزیں رکھنے کا طریقہ عام تھا۔ ایرانی اس عہد میں بڑے اچھے فارغ تھے۔ اور تہذیب و تمدن میں دنیا کی تمام قوموں سے آگے تھے۔ وہ لوگ آتش پرست تھے۔ آگ کے علاوہ اپنے بادشاہ کو بھی پاک ہستی تصور کرتے تھے۔ ان کا مذہب زرتشتی کہلاتا تھا۔ جسے اردشیر نے سرکاری مذہب قرار دیا تھا۔

اس مذہب کا بانی زرتشت تھا۔ جو ۶۰۰ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ زرتشتی مذہب کی بنیاد تہذیب پر تھی مگر بعد میں اس کی تعلیمات مسخ ہو گئیں۔ ان کا سب سے بڑا عقیدہ یہ ہے کہ ازل سے نیکی اور بدی میں کشمکش جاری ہے نیکی کا دیوتا یزدان ہے۔ اور بدی کا اہرمن۔ یزدان آگ اور روشنی میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اہرمن تاریکی میں۔ ان دونوں دیوتاؤں میں جنگ کا آخر کار نتیجہ یہ ثابت ہو گا کہ یزدان کامیاب ہو گا کہ یزدان کامیاب ہو گا۔ زرتشتی لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کو نیکی کی طرفداری کرنی چاہیئے۔ صداقت، خوش اخلاقی اور وطن کی خدمت انسان کا سب سے بڑا فریضہ ہونا چاہیئے۔ زندگی میں نجات کی راہ تلاش کرنے کے لیئے۔ تین اصولوں پر عمل ہونا چاہیئے۔ نیک پند، نیک گفتار، اور نیک کردار۔ جو ان اصولوں پر عمل کرے گا۔ جنت میں داخل ہو گا۔ ورنہ سخت عذاب میں گرفتار ہو گا۔ اس طرح زرتشتی مذہب سچائی اور ایمانداری پر زور دیتا ہے۔

طلوع اسلام کے وقت زرتشتی مذہب اپنی تعلیمات کو چھوڑ کر توہم پرستی اور رسوم پرستی میں مبتلا تھا۔

عرب قبل از اسلام

جغرافیائی حالت

ملک عرب پاکستان کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور دونوں دوست ملکوں کے ساحلوں سے ایک ہی سمندر کی لہریں آکر ٹکراتی ہیں جسے بحرِ ہند کہتے ہیں۔ جہاں تک بری راستے کا تعلق ہے پاکستان اور عرب کے درمیان ایران کی مسلم مملکت واقع ہے عرب کا بیشتر حصہ ریگستان اور صحرا ہے وہاں حدِ نظر تک ریت ہی ریت دکھائی دیتی ہے ملک کا کل رقبہ تقریباً دس لاکھ مربع میل ہے۔

قدیم عرب کے سات صوبے تھے جن کے نام یہ ہیں:۔ یمن۔ حضرموت۔ بحرین۔ یمامہ۔ عمان۔ نجد اور حجاز موجودہ مملکتِ سعودیہ کی حدود اس سے مختلف ہیں۔

یمن کا صوبہ بحرِ احمر کے کنارے حجاز سے عدن کی خلیج تک پھیلا ہوا تھا یہ عرب کا سب سے ہرا بھرا اور سرسبز علاقہ ہے۔ یہاں بیسیوں نخلستان ہیں اور کئی قسم کے پھل اور میوے ہوتے ہیں یمن کے باغات اور چشمے اپنی خوبصورتی میں اور اس کے صحت افزا مقامات اپنی آب وہوا کے اعتبار سے ملک بھر میں مشہور ہیں۔

یمن سے ملحقہ صوبہ حضرموت کا ہے جس کا زیادہ حصہ بنجر اور غیر آباد ہے ایک طرف پہاڑیوں کا سلسلہ جال کی طرح پھیلا ہوا ہے اور دوسری طرف بے آب وگیاہ صحرا ہے۔ جس میں راہ گم کردہ مسافر پیاس کے مارے لبا اوقات جان بحق ہو جاتے تھے۔ دریائے عمان کے غربی کنارہ پر عمان اور خلیج فارس کے کنارے پر بحرین اور اس سے ملا ہوا یمامہ ہے۔ ان تینوں علاقوں کا زیادہ تر حصہ ریگستانی ہے۔ جہاں کھجور سب سے بڑی پیداوار ہے ان کے بعض حصوں میں مکئی اور جو اور بعض دوسرے پھل بھی پیدا ہوتے ہیں۔

دریائے عمان کے آس پاس میلوں تک کھجوروں کے جھنڈ قطار اندر قطار کھڑے نظر عجب دلکش منظر پیش کرتے ہیں اور ان مناظر پر صحرائی عرب جان دیتا ہے وہ ان کا شیدائی ہے۔ ملک کا وسطی علاقہ جو عراق تک پھیلا ہے نجد کہلاتا ہے۔ یہ حصہ بدوی عربوں کا محبوب گھر ہے بحر احمر کے کنارے کنارے شام کی سرحد سے یمن تک جو حصہ ہے اس کو حجاز کہتے ہیں۔

حجاز میں تین شہر مشہور تھے .... ایک مکہ دوسرا طائف اور تیسرا یثرب۔

مکہ اسلام سے قبل بھی کعبہ کی وجہ سے ملک عرب کا صدر مقام تھا یہاں ہر سال ملک کے گوشے گوشے سے لوگ آکر جمع ہوتے تھے طائف حجاز کا سرسبز اور شاداب نخلستان ہے۔ گرمیوں میں جب صحرا کا سینہ سورج کی تیز شعاعوں کے باعث آگ کی طرح جل رہا ہوتا ہے۔ تو مکہ اور گرد ونواح کے امیر لوگ طائف میں یہ موسم بڑے مزے اور لطف و آرام سے گزارتے ہیں۔ مدینہ کا اصلی نام یثرب تھا جب حضور نبی اکرم ﷺ ہجرت فرما کر یہاں تشریف لائے اور مقیم ہوگئے تو آپ کی نسبت سے اس شہر کو لوگوں نے مدینۃ النبی (نبی کا شہر) کہنا شروع کیا اور بعد میں اختصار کے طور پر صرف مدینہ کہنے لگے۔ مدینہ شہر مکہ کے شمال میں پونے تین سو میل کے فاصلے پر ہے۔

سیاسی حالت عرب قوم مختلف قبائل میں بٹی ہوئی تھی اور ہر قبیلہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا آپس کے لڑائی جھگڑے قبیلے کے سردار مل کر آپس میں طے کر لیتے ہر شخص اپنے قبیلے کا وفادار تھا اور اس کی عزت و آبرو کی خاطر مرنے مارنے پہ تیار رہتا تھا۔

حکومت کوئی نہ تھی اور نہ کوئی قانون رائج تھا طاقت ور کمزور کو جس وقت چاہتا دبا سکتا تھا زور والے جب چاہتے ظلم کا ہاتھ بڑھا سکتے تھے۔ مسافر کو اگر کوئی لوٹ لیتا تو اس کی کہیں دادرسی ممکن نہ تھی ہر قبیلہ اپنی برادری کے لوگوں

کے حقوق کی حفاظت کرنا اور ان سے کی گئی زیادتی کا بدلہ لینا اپنا مقدس ترین فرض سمجھتا تھا۔ خانہ بدوش عرب کے لئے کسی کو جان سے مار ڈالنا یا اسے لوٹ لینا معمولی بات تھی مگر وہ مخالف قبیلہ کے جذبۂ انتقام سے ڈر جاتا تھا۔

قبائل کی آپس میں ٹھنی ہی رہتی معمولی معمولی رقابتیں خوفناک لڑائیوں کا سبب بن جاتیں۔ مثلاً دو قبیلوں کے چند آدمی گھوڑوں پر سوار چشمے تک جا رہے ہیں ان میں ایک قبیلے کا فرد بازی لے گیا دوسرے قبیلے کے کسی فرد کی غیرت اور حمیت کو ٹھیس لگی اور اس نے بازی لے جانے والے کا سر قلم کر دیا پھر کیا تھا لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ اور دونوں قبیلوں نے دل بھر کر تلوار کے جوہر دکھائے بارہا ایسا ہوا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے پیدا شدہ لڑائیاں سالوں جاری رہیں اور ان میں کئی کئی قبیلوں کی صفائی ہو گئی۔

جب کسی قبیلے کا کوئی فرد کسی دوسرے قبیلے والے کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا یا اس کا مال لوٹ لیا جاتا تو اس کا بدلہ لینا بے حد ضروری ہو جاتا۔ مقتول کا بدلہ قاتل یا قاتل کے قبیلے کے کسی شخص کو قتل کر کے لیا جاتا تھا۔ بدلہ کی دوسری صورت خون بہا تھی اس طرح کہ قتل کے بدلہ میں قاتل سے مقتول کی جان کی قیمت وصول کی جاتی۔

تمدنی حالت عرب کے باشندوں کی اکثریت خانہ بدوش تھی وہ کسی خاص شہر دیہات یا آبادی سے تعلق نہ رکھتے تھے جہاں اونٹوں اور بکریوں کے لئے سبزہ اور پانی دیکھا۔ خیمے گاڑ دیئے۔ مرد تو دن بھر چراگاہوں میں اپنے مویشی چراتے اور عورتیں گوشت، کھجور اور اناج سے کھانا تیار کرتیں جب پانی کی قلت کے باعث ان کے پڑاؤ کے آس پاس کی چراگاہیں خشک ہو جاتیں اور ان کے مویشیوں کے لئے پیٹ بھرنے کا سامان نظر نہ آتا تو بدو عرب اپنے خیموں کو اکھاڑ کر اپنے کاندھوں پر رکھ کر یا اونٹوں پر لاد کر کسی اور چراگاہ کی راہ لیتے اور جہاں پانی اور گھاس میسر آتا وہاں ڈیرے ڈال لیتے۔

تعلیم اور لکھنے پڑھنے کا رواج بالکل نہ تھا وہ تہذیب و تمدن کے الفاظ تک

سے نا آشنا تھے ان کی زندگی سادہ سے بے تکلف، غیر مہذب اور دلیرانہ تھی۔

شہروں میں مختلف قبیلے اور گھرانے مل جل کر اور دوستانہ فضا میں زندگی بسر کرتے تھے اور گو وہ صحرائی عربوں سے نسلاً مختلف نہ تھے لیکن مزاج کے اعتبار سے شہری اور صحرائی عرب میں بہت فرق تھا شہر کے لوگ دوسرے ملکوں میں سفر کرتے اور بیرونی ممالک کے لوگ ان کی تجارتی منڈیوں میں آتے جاتے تھے اس آمد و رفت کی مدد سے ان کے خیالات شستہ اور تجربات وسیع ہوتے تھے اور وہ نسبتاً مہذب طریق پر رہتے تھے شہروں میں خال خال کوئی لکھا پڑھا آدمی بھی مل جاتا تھا پڑھے لکھوں میں کچھ لوگ عربی کے علاوہ عبرانی اور لاطینی زبانوں سے بھی واقف مل جاتے۔ مگر سارے ملک میں چند گنے چنے۔

شہری عورتیں بھی صحرائی اور خانہ بدوش عورتوں کی نسبت بہتر حالت میں تھیں بعض آزادانہ تجارت کرتی تھیں اور سوسائٹی میں بہت نام اور عزت پاتی تھیں عرب میں ہر طبقہ کی عورت کھلے بندوں چلتی پھرتی تھیں۔ شہر کی عورت نسبتاً مرد کے جور و ظلم سے محفوظ تھی۔ بہادری اور جرأت مندی میں عرب کی عورتیں اپنی مثال نہ رکھتی تھیں مگر اس کے باوجود یہ کہنا غلط ہو گا کہ سوسائٹی میں عورت کسی معزز مقام پر کھڑی تھی بہت سے قبیلوں میں تو بچی کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا کیوں کہ ان کی غلط قسم کی غیرت برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی شخص ان کا داماد کہلائے عربوں میں ایک رواج یہ تھا کہ باپ کے مر جانے پر اس کی متعدد بیویاں اسی طرح بڑے بیٹے کی جائداد سمجھی جاتی تھیں جس طرح نقدی، اونٹ اور گھوڑے وغیرہ اور بسا اوقات وہ اپنی سوتیلی ماؤں کو بیوی بنا کر رکھ لیتے۔

عرب سوسائٹی میں جادو بیان مقرر اور فصیح زبان شعراء کی بڑی قدر کی جاتی تھی حج کے موقعہ پر عکاظ کے نام سے ہر سال ایک بھاری میلہ لگتا جہاں ملک کے منتخب شاعر اور مقرر اپنا اپنا کلام پیش کر کے دادِ تحسین حاصل کرتے اور انعام پاتے تھے سال کی بہترین نظموں اور تقریروں کو لکھ کر کعبہ کی دیواروں پر لٹکا دیا جاتا اور انعام پانے والوں کی شہرت آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل جاتی۔

شاعر قبیلہ کا واجب الاحترام فرد سمجھا جاتا تھا وہ اپنے قبیلہ کی تعریف میں نظمیں کہتا اپنے بزرگوں کے کارناموں کو گنواتا اور ان کی عظمت کے گیت گاتا تھا وہ قبیلے کے نوجوانوں میں بہادری اور جوانمردی کے جذبات اُبھارتا اور انہیں بزدلی اور غداری سے نفرت دلاتا۔ دشمن قبیلوں کی ہجو لکھتا اور انہیں کمینہ جھگڑا ثابت کرنا بھی شاعر کے فرائض سے تھا۔ شاعر عظمت رفتہ کی داستانیں سُنا سُنا کر فوج کے حوصلے بڑھاتا۔

اخلاقی حالت: ہمارے مورخوں اور سیرت نگاروں کا عام طور پر اندازِ خیال یہ ہے کہ قبل از اسلام کے عربوں میں دنیا بھر کی برائیاں اور قباحتیں پائی جاتی تھیں۔ خوبی اور وصف ان میں نام کو نہ تھا۔ لیکن انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو یہ کہنا پڑے گا کہ عرب قوم گو غیر متمدن اور جاہل تھی اور اس میں بیسیوں قسم کی معاشرتی اور اخلاقی برائیاں موجود تھیں مگر ان کا کردار یکسر تاریک اور سیاہ نہ تھا نہ تھا۔ ذیل میں ہم ان کی برائیوں کو مختصراً ترتیب وار درج کرتے ہیں۔

معائب: عرب قوم میں علم و فن کی روشنی نہ تھی۔ اُن کے ہمسایہ ملک اس اعتبار سے نسبتاً ترقی یافتہ تھے۔ لیکن عرب ان ترقیوں سے بالکل بے خبر اور غافل پڑے تھے: اُن کا باقی دنیا سے کوئی رابطہ و ضبط نہ تھا بلکہ وہ ساری دنیا سے الگ تھلگ ایک غیر متمدن زندگی بسر کر رہے تھے۔

(۲) عربوں میں اتحاد نام کو نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہوتے تھا۔ کوئی ایک دوسرے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس ذہنیت نے ایک دوسرے کا دشمن بنا رکھا تھا۔

(۳) لڑنے جھگڑنے اور خون خرابے کے عادی تھے اور ذرا ذرا سی بات پر تلواریں سونت کر میدان میں اتر آتے تھے۔ انسانی زندگی کی اُن کے نزدیک کوئی قیمت

نہ تھی ۔

(۴) لوٹ مار اور ڈاکہ زنی ان میں بعض کا مستقل پیشہ تھا ۔ اکثر کے نزدیک یہ ظلم وستم معیوب نہ تھا بلکہ مستحسن اور قابل تعریف فعل متصور ہوتا تھا ۔ محض اس لیے کہ اس میں جرأت کی پڑتی تھی ۔

(۵) عرب شراب کے رسیا اور جوئے کے دلدادہ تھے ۔ ان دو بری عادتوں کے نتیجہ میں افلاس بے حیائی اور دوسری بے شمار اخلاقی اور معاشرتی برائیاں ان کے اندر پیدا ہو گئی تھیں بیوی تک داؤں پر لگا دیتے تھے ۔

(۶) زناکاری ان کی محبوب تفریح تھی ایک عرب جس قدر عورتوں سے چاہتا بیاہ کر لیتا باپ کے مرنے پر سوتیلی ماؤں کو بیوی کی جگہ رکھ لیتے ۔ لونڈی اور باندیاں تو کسی حساب وشمار میں نہ تھیں ۔

۷۔ بچیوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیا جاتا جو ان کی غلط حمیت کا ایک بدترین مظاہرہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ داماد کا آنا بے عزتی کی نشانی ہے ۔

(۸) جب ایک بار بگڑ بیٹھتے تو سنبھلنے میں نہ آتے ۔ ضد ہٹ دھرمی اور انتقام پسندی کے باعث وہ درندگی کی حد تک بے رحم اور سنگدل بن چکے تھے ۔

(۹) سیاسی نقطۂ نظر سے عرب کی سب سے بڑی خرابی کسی منظم اور باقاعدہ مرکزی حکومت نہ ہونا تھا ۔ وہاں ہر قبیلہ آزاد اور ہر شخص حقیقی معنوں میں بالکل شتر بے مہار تھے ۔ یہ صورت حال جہاں بھی ہو حد درجہ خطرناک ہوتی ہے ۔

(۱۰) مذہبی اعتبار سے اُن کی بت پرستی حد درجہ شرمناک تھی خصوصاً ایک باغیرت قوم کی خودداری سے گری ہوئی ایسی حرکت بہت ہی عجیب معلوم ہوتی ہے ۔

محاسن:

عربوں کی خوبیاں حسب ذیل ہیں

(۱) عرب بہادر اور نڈر تھے اور وہ بڑی سے بڑی انسانی قوت کے سامنے جھکنا نہ جانتے تھے ۔ وہ تلوار کے دھنی تھے اور شمشیر آبدار ان کی محبوب شے تھی ۔

(۲) عرب قول کے پکے اور وعدے کے سچے تھے ۔ ایک بار جو عہد کر لیا اس سے پھر جانا

ان کے ہاں بدترین برائی تھی ۔ وہ اگر دشمن کو بھی امان دیتے تو اس پر ہرگز ہاتھ نہ اٹھاتے اس کی خاطر اپنی جان تک کی بازی لگا دیتے تھے ۔

(۳) مہمان نوازی میں وہ بے مثال تھے اور مہمان کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے گریز نہ کرتے تھے ۔ عرب ۔ امیر ہو یا غریب مہمان نوازی میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرنا عین شرافت اور بزرگی خیال کرتا تھا ۔

۴ ۔ عرب ڈاکو تھے ۔ مگر ٹھگ اور دھوکا باز نہ تھے ۔ وہ شیر کی طرح اپنے شکار پر سامنے سے جھپٹتے ۔ لومڑی کی طرح حیلہ سازی سے کام نہ لیتے اور اسی طرح معاملات کے صاف اور سچے تھے ۔

۵ ۔ ان کی زبان فصیح ، مکمل ، وسیع ، شیریں اور ایک مثالی زبان تھی ان کا اسلوب بیان دلاویز اور رواتی دلپسند تھی ۔ اسی لئے اپنے مقابلہ میں وہ دوسروں کو "عجم" یعنی گونگا کہتے تھے ۔

۶ ۔ عرب شاعر گو خودستائی میں کبر و غرور کی حدوں سے تجاوز کر جاتا تھا ۔ اور دوسروں کی تحقیر اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا مگر اس میں ایک خوبی تھی کہ اس کی محبوبہ عورت ہوتی ۔ ہمارے فارسی اور اردو کے شاعروں کی طرح وہ غیر فطری اظہار محبت نہ کرتا ۔ پھر اس کی محبوبہ عام طور پر اس کی بیوی یا منگیتر ہوتی ۔ ورنہ وہ ایک فرضی محبوبہ کے گرد اپنی شاعری کو رکھتا ۔

۷ ۔ عرب شاعری کی تاثیر آج بھی بے مثال مانی جاتی ہے ان کے شعر میں جادو کا اثر اور طلسم کی کیفیت ہے ۔ انسان تو انسان وہ اونٹ جیسے وحشی جانور کو اپنی "حدی" سے مسحور کر لیتے ہیں ۔

۸ ۔ علم الانساب میں عرب کو کمال حاصل تھا ۔ وہ ننھیال اور ددھیال کی طرف سے پشت ہا پشت تک آباد اجداد کے نام نوک بر زبان رکھتے اور شرافت نسبی پر فخر کرتے اور بزرگوں کے کارناموں سے حال و مستقبل

کو بہتر بنانے کا جذبہ حاصل کرتے۔

۹۔ وطنیت۔ قومیت اور قبائلی جنبہ داری کے جذبے اگر اخلاقی قیود سے متجاوز نہ ہوتے تو یقیناً بہت ہی مبارک جذبات ثابت ہوتے۔

۱۰۔ شجاعت۔ صداقت۔ مہمان نوازی، حوصلہ مندی اور فصاحت لسانی ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسلام کی بدولت وہ ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور ان کی جاہلیت کی رسمیں جاتی رہیں تو وہ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کے مالک بن گئے۔

یہ کہنا غالباً مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ عربوں کی ان گوناگوں خصوصیات کی بنا پر ہی انہیں دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے آخری نبیؐ سے نوازا گیا اور اللہ کا آخری پیغام ان کے سپرد ہوا۔

مذہبی حالت: ظہور اسلام کے وقت عرب میں مندرجہ ذیل مذاہب کے پیروکار موجود تھے۔

بت پرستی عرب کی اکثریت کا مسلک تھا ملک کے طول و عرض میں ہزاروں بت خانے تھے۔ جہاں عرب مرد اور عورتیں بے جان اور بے زبان پتھروں کے آگے سجدہ ریز ہوتے اور دکھ درد میں ان سے مدد مانگتے، بتوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور منتیں مانتے تھے۔ کسی کو اولاد چاہیے تو اولاد کا بت موجود ہے اور اس کے سامنے ماتھا رگڑا جا رہا ہے۔ کسی کو افلاس اور غربت نے گھیر رکھا ہے۔ تو وہ دولت کے بت کے آگے عاجزی کا بت بنا کھڑا ہے۔ بارش نہ ہونے پر بارش بر سانے والے بت کی خوشامدیں ہو رہی ہیں۔ دشمن پر غلبہ پانے لوٹ مار کی مہم میں کامیاب ہونے اور مدیہ کو حاصل کرنے کے لیے بت خانوں میں جا جا کر دعائیں کی جاتی ہیں اور آرزو بر آنے پر ان بتوں کے نام پر قربانیاں کی جاتی ہیں۔ وہ جنوں کے نام پر جانور ذبح کرتے اور ان کو اپنے بھی

بتوں کے نام پر قربان کر دیتے۔

کعبہ جو خدا کا سب سے پہلا گھر تھا اور جسے خدا کے حکم کے مطابق خدائے واحد کی عبادت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیلؑ نے تعمیر کیا تھا سب سے بڑا بت کدہ بن چکا تھا جس میں سینکڑوں چھوٹے بڑے بت رکھے تھے اس کے بت دوسرے سب بتوں سے زیادہ طاقت ور اور قدرت والے سمجھے جاتے تھے۔ حج کی پاکیزہ رسم بھی جشن کی یاترا کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

قریشیوں کی جلیس کعبہ میں چڑھائی جانے والے نذرانوں، قربانیوں اور منتوں سے خوب پُر ہوتیں۔ وہ بڑے مزے اور عزت سے زندگی بسر کر رہے تھے ملک کے محنت کش بت پرست اپنی کمائیوں کا بڑا حصہ بتانِ کعبہ کی نذر کر جاتے۔

(ب) ابراہیمی شریعت کے پیرو بھی عرب میں ابھی باقی تھے گو ان لوگوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ وہ ابھی تک خدا کے برگزیدہ نبی ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی شریعت کی پیروی کرتے تھے۔ وہ اپنی جگہ ڈٹے ہوتے تھے۔ تاریخ کے سفینے میں ان چند لوگوں کے مبارک نام آج تک محفوظ ہیں جیسے قس بن ساعدہ۔ حضرت عمرؓ کے چچا ابو سعید سعید بن زید۔ اُمیہ بن ابی الصلت ثقفی۔ عثمان بن حویرث اور زید ابن عمرو وغیرہ۔

(ج) دینِ عیسوی کی ابتدا کو چھ سو سال ہونے کو آئے تھے عرب کی سرحدوں پر ایک کثیر آبادی عیسیٰ کے دین کو مان چکی تھی لیکن اس مذہب کو عرب میں کوئی نمایاں شخصیت کا ذکر پہنچ سکا ہے۔ لیکن ورقہ بن نوفل (رسول پاک کی خاتون حضرت خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی) دینِ عیسوی کے عالم اور عیسیٰ کے پرستار تھے۔ جب آنحضرتؐ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی۔ تو آپ ہی تھے۔ جنہوں نے آنے والے مبارک دور کی بشارت دی۔

(د) صابی عرب کا ایک مختصر سا مذہبی گروہ تھا یہ لوگ ستاروں کی پوجا کرتے اور اجرام سماوی کی بزرگی و عظمت کو خدائی حدوں تک پہنچاتے تھے۔ عام عرب انہیں بے دین اور گمراہ سمجھتے۔ اس لیے انہیں صابی یعنی بے دین کہتے۔

(۷) یہودی ملک عرب میں ایک کثیر تعداد میں تھے۔ خاص طور پر مدینہ میں ان کی اکثریت تھی اور مدینہ کے اردگرد ان کی بہت سی نو آبادیاں تھیں۔ اس شہر کے آس پاس انہوں نے بہت سے باغات لگائے ہوئے تھے اور قلعے تعمیر کئے ہوئے تھے یہودی شام اور فلسطین کے علاقوں سے آکر یہاں آباد ہوتے تھے۔ چونکہ انہوں نے اپنی مذہبی نوشتوں میں پڑھا تھا کہ نبی آخر الزماں ریگستان اور نخلستان والے علاقے میں مبعوث ہوگا اور وہی انہیں ذلت و ادبار اور غلامی و افلاس سے نجات دلائے گا ان کے تین مشہور قبیلے تھے (۱) بنو نضیر خیبر میں (۲) بنو قریظہ فدک میں (۳) بنو قینقاع مدینہ میں۔

قبیلہ قریش

عرب کے معزز قبیلوں میں ایک قبیلے کا نام قریش تھا جو صدیوں سے مکہ میں آباد تھا اس قبیلے کے آباد اجداد نے شہر مکہ آباد کیا تھا۔ قریش حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حکم کے مطابق اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کے قریب ویرانہ میں آباد کیا تھا۔ جب حضرت اسمٰعیلؑ اس علاقہ میں مقیم ہوئے جہاں اب مکہ کا بارونق اور خوبصورت شہر آباد ہے اور زمزم کا چشمہ آبا ہے اس وقت یہاں بالکل ویرانہ تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے مل کر حرم پاک کی تعمیر کی اور خدا کے حضور دعا مانگی: "اے پروردگار! اس شہر کو پُرامن بنا اور اس کے رہنے والے مومنوں کو پھلوں کا رزق عطا فرما"۔ رفتہ رفتہ وہاں ایک شہر آباد ہو گیا جس کا نام مکہ رکھا گیا۔

کئی صدیوں کے بعد اہل بابل نے مکہ پر حملہ کیا اور آل اسمٰعیلؑ کا شیرازہ بکھر گیا۔ نتیجہ کے طور پر طاقتور دشمن قبیلہ بنی جرہم مکہ پر قابض ہو گیا اور کعبہ کا متولی بن بیٹھا جو اب ملک کی سب سے بڑی زیارت گاہ تھی اور جس کے حج کو لوگ ہر طرح سے کھنچے آتے تھے۔ تیسری صدی قبل مسیح کے اوائل میں بنی جرہم ایک دوسرے

قبیلہ کی یورش سے مغلوب ہو گئے یہ قبیلہ بنی خزاعہ کے نام سے مشہور تھے انہوں نے یمن سے اُٹھ کر مکہ اور حجاز کے جنوبی علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا اس عرصہ میں آلِ اسمٰعیلؑ شاہ بابل کے ہاتھوں بُری طرح پامال ہو چکے تھے۔

عدنان حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان کے ایک فرد تھے ان کا زمانہ پہلی صدی قبل از مسیح کے قریب قریب ہے انہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کی طرح ایک جرہمی سردار کی لڑکی سے شادی کی اور مکہ ہی میں مقیم ہو گئے۔ انہیں کے بیٹے معد حجاز اور نجد میں خاندانِ اسمٰعیلؑ کے مورث اعلیٰ بنے۔ فہر جو معد کی اولاد تھے اور جن کا لقب قریش تھا اسی معزز قبیلہ کے جدِ امجد تھے جو قریش کے نام سے مشہور ہوا اور جس میں پیغمبرِ اسلام پیدا ہوئے ان کا زمانہ تیسری صدی عیسوی تھا۔

فہر کی اولاد سے ایک بہادر اور تجربہ کار سردار قصی نے اپنے دشمنوں کو مکہ سے نکال کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط کا واقعہ ہے اس وقت سے قریش مکہ کے حقیقی فرمانروا بن گئے۔

قصی نے مکہ پر قابض ہونے کے بعد نہایت عمدہ اور مرتب طریقہ شروع کر دیا قریشی گھرانوں کو کعبہ کے آس پاس بسایا اور ان کے رہنے کے اچھے مکان بنوائے اپنے لئے اس نے ایک محل تعمیر کرایا جس کا ایک دروازہ کعبہ کی طرف کھلتا تھا یہ محل دار الندوہ کے نام سے مشہور تھا۔ جہاں قصی کی صدارت میں ملکی معاملات پر غور و فکر ہوتا تھا اور ان فیصلوں کو عمل میں لانے کے لیے احکام جاری کیے جاتے تھے۔

جواب ۱۔ حجابہ (کعبہ کی چابیوں کی حفاظت) ایک متبرک عہدہ جو بہت بلند درجہ رکھتا تھا۔ یہ منصب عبد الدار کے خاندان کو حاصل تھا۔ ظہور اسلام کے وقت اس عہدہ پر عثمان بن طلحہ فائز تھا۔

۲۔ سقایہ زم زم کے مقدس چشموں اور اس کے علاوہ اس تمام پانی کا اجارہ جو حجاج کے استعمال کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ یہ منصب بنو ہاشم کے خاندان میں تھا اور فتح مکہ کے وقت رسول کریمؐ کے چچا حضرت عباسؓ کے ہاتھ میں تھا۔

۳۔ دیتہ ۔ یعنی دیوانی اور فوجداری عدالت مدت دراز تک تیم بن مرہ کے خاندان میں رہی ۔ لیکن رسول اللہؐ کی بعثت کے وقت یہ منصب عبد اللہ ابن قحافہ (حضرت ابو بکرؓ) کے پاس آ گیا ۔

۴۔ سفارت ۔ جس شخص کے پاس یہ عہدہ ہوتا تھا ۔ وہ حکومت کا وکیل سمجھا جاتا تھا ۔ عرب لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو جاتے تھے ان پر بحث اور تصفیہ کا اختیار اسے حاصل ہوتا تھا ۔ یہ منصب حضرت عمرؓ کو حاصل تھا ۔

۵۔ لوا یعنی اس جھنڈے کے عطا کرنے کا منصب جس کے پیچھے قوم جمع ہو کر دشمن سے جنگ کرنے جاتی تھی ۔ ان دنوں علم بردار بنو امیہ کا خاندان تھا اور اس پر ابو سفیان بن حرب متمکن تھا ۔

۶۔ افادہ (اس رقم کا انتظام جو قوم کی خیرات سے جمع ہوتی تھی اور غریب حجاج کے لیے کھانا وغیرہ مہیا کرنے میں صرف ہوتی تھی ۔ یہ خدمت ابو طالب کو اپنے باپ سے ملی اور ان کی وفات پر نوفل بن عبد مناف کے خاندان میں منتقل ہو گئی ۔

۷۔ ندوہ (قومی مجلس کی صدارت) جو شخص اس منصب پر مامور ہوتا تھا وہ انتظام حکومت کے اندر سب سے بلند مقام پر سمجھا جاتا تھا ۔ رسول اللہؐ کے زمانہ میں یہ منصب قصی کے بیٹے عبد العزیٰ کے خاندان کے ایک فرد اسود کے پاس تھا ۔

۸۔ خیمہ یا دار المشورہ کی تولیت کا عہدہ جو اپنے عہدہ دار کو مجلس کے اکٹھا کرنے (سیکرٹری شپ) کا حق دلاتا تھا ۔ خالد بن ولیدؓ کے سپرد یہ عہدہ تھا ۔

۹۔ خازنہ یعنی بیت المال کا انتظام و انصرام حسن بن کعب کے خاندان کے ہاتھوں میں تھا اور حارث بن قیس کے سپرد تھا ۔

۱۰۔ ازلام ۔ ان تیروں کی تحویل جو بتوں کی مرضی دریافت کرنے کے لیے چلائے جاتے تھے یہ منصب ابو سفیان کے بھائی صفوان کے پاس تھا ۔ یہ عہدہ دار جتنا زیادہ پُر ان ہوتا اتنا ہی اس کا اثر و اقتدار بھی بڑھ جاتا تھا اور اسے قوم کی طرف سے رئیس یا سید کا خطاب ملتا تھا ۔ رسول کریمؐ کے زمانہ میں اس منصب پر حضرت عباسؓ فائز تھے ۔

سیرت النبی ﷺ

ابوالانبیا حضرت ابراہیمؑ
تا
سیدنا حضرت محمد مصطفیٰؐ

شجرۂ نسب

حضرت ابراہیمؑ

|

حضرت اسمعیلؑ

|

نزار — معد — عدنان — قیذار

مضر — الیاس — مدرکہ — خزیمہ — کنانہ — نضر — مالک

فہر

(قریش)

مُرّہ — کعب — لوی — غالب

ہاشم — عبدمناف — قصی — کلاب

|

عبدالمطلب

|

عبداللہ

|

حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ

صلّی اللہ علیہ وسلّم

سیرت النبی ص

خاندان:

حضورؐ کے قبیلہ کا نام قریش تھا۔ اس قبیلے کا سلسلۂ نسب مشہور نبی حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ سے جا ملتا ہے۔ قریش کے اس معزز قبیلہ میں بہت سے نامور گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک سردار کا نام ہاشم تھا۔

سردار ہاشم اپنی سخاوت اور دولت کے لیے ملک بھر میں مشہور تھے حج کے موقع پر حاجیوں کے ٹھہراتے۔ ان کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے کا انتظام انہیں کے سپرد تھا۔ حاجیوں کے لیے پانی جمع رکھنے کو انہوں نے چمڑے کی مشکیں بنوائیں اور قریش کی تجارت کو فروغ دینے کے خیال سے مختلف قبیلوں سے دوستانہ تعلقات سنوارے۔

ایک دفعہ ملک کے بعض حصے قحط کا شکار ہو گئے۔ ہاشم نے اپنی دولت سے منوں اناج خریدا اور ایک مدت تک اُسے پکوا کر غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کیا ان کاموں کی سے ہاشم ملک بھر میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ہاشم ایک بار یثرب (مدینہ) گئے اور وہاں کے ایک نجار گھرانے کی ایک معزز خاتون سے جن کا نام سلمیٰ تھا۔ شادی کی۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا اصلی نام تو شیبہ تھا۔ مگر شہرت عبدالمطلب نام سے ہوئی یہی عبدالمطلب ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا تھے۔

عبدالمطلب باپ کے صحیح جانشین ثابت ہوتے حاجیوں کے قیام و طعام کا انتظام انہی کے ہاتھ میں آیا۔ مکّہ کا مشہور کنواں زمزم ایک عرصہ سے بند پڑا تھا۔ عبدالمطلب نے بہت اہتمام سے اُسے دوبارہ کھدوایا اور درست کرایا۔

عبدالمطلب کے دل میں کمزوروں اور مسافروں کے لئے بہت ہمدردی تھی وہ مکہ کے مانے ہوئے رئیس اور شہر کی مجلس انتظامیہ کے جسے الندوہ کہتے تھے اہم رکن تھے۔ خداوند ان کو دس بیٹے دیئے تھے جن میں سے پانچ کئی وجوہ سے مشہور ہوئے، ابولہب۔ ابوطالب، حمزہؓ عباسؓ اور جناب عبداللہ۔

عبداللہ سب سے پیارے اور لاڈلے تھے

کہتے ہیں کہ عبدالمطلب نے کعبہ میں کھڑے ہو کر یہ منت مانی تھی۔ کہ اگر دس بیٹے ہوتے اور میری زندگی میں سب جوان ہو گئے تو ان میں سے ایک کو بتان حرم کے نام پر قربان کردوں گا عرب سردار کی یہ تمنا پوری ہوئی تو انہوں نے بیٹوں کے نام پانسہ ڈالا قرعہ چہیتے بیٹے عبداللہ پر پڑا بوڑھے سردار کے کلیجہ کو ہاتھ پڑا۔ مگر وہ دھن کا پکا اور بات کا کھرا تھا عبداللہ کو قربان کرنے پر تل گیا۔ اس موقعہ پر شہر کے دوسرے سردار اکٹھے آئے اور انہوں نے یہ مشورہ دیا۔ کہ جوان بیٹے کی بجائے اونٹوں کی قربانی دی جائے

چنانچہ عبداللہ کے صدقے ایک سو اونٹ کی بھاری قربانی دی گئی۔

عبداللہ کی شادی ایک دوسرے قریشی گھرانہ بنی زہرہ کی ایک خاتون بی بی آمنہ سے ہوئی شادی ہوتے ابھی چند ماہ گزرے تھے کہ عبداللہ نے تجارت کی غرض سے شام کا سفر کیا۔ واپسی میں وہ بیمار پڑے اور کم مدینہ کے قریب راستہ ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس سانحہ سے بوڑھے باپ اور جوان بیوی پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ دونوں کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔

ولادت: بی بی آمنہ کے ہاں ان کے خاوند عبداللہ کی وفات کے کوئی چار ماہ بعد ایک بچہ پیدا ہوا۔ وہ بچہ جس کی قسمت میں دنیا کا سب سے بڑا انسان ہونا لکھا تھا اور جس کی بدولت عالم انسانی کی بگڑی بن

گئی۔ بوڑھے دادا نے جب اس پوتے کی پیدائش کی خبر سنی تو آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک اٹھے۔ دوڑا دوڑا عبداللہ کے گھر پہنچا اور پوتے کو باہوں میں اٹھا کر کعبہ میں لے گیا۔

بوڑھے سردار عبدالمطلب نے اپنے پوتے کی خوشی میں ساتویں دن اپنے قبیلہ کو دعوت دی اس مبارک تقریب پر لوگوں نے بچہ کا نام دریافت کیا عبدالمطلب نے خوشی سے کہا "محمد" رکھا لوگوں نے حیرت سے پوچھا تو "یہ کیا؟" اس لئے کہ یہ نام ان کے یہاں بالکل نیا اور نادر تھا۔ . . .

. . . . عبدالمطلب نے جواب میں یہ تاریخی فقرہ کہا "رجاء ان یحمد" (مجھے امید ہے کہ اس بچہ کی بہت تعریف کی جائے گی۔ بوڑھے سردار کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ واقعی تاریخ انسانی میں کسی شخص کی اس قدر تعریف نہیں کی گئی جس قدر اس آخری نبی ؐ کی ہوئی۔ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے نام کو بلند کرنے اور زندہ رکھنے کے لئے یہ اہتمام نہیں کیا گیا جو اس کے لئے ہوا۔

آنحضرت ؐ کی ولادت باسعادت ۱۲ ربیع الاول کو پیر کے دن حضرت عیسیٰ ؑ کے ۵۷۰ برس بعد ۵۷۱ء میں ہوئی۔ عرب اس سال کو "عام الفیل" کہتے تھے بکرمی شمسی کا سنہ ۶۲۸ تھا اور جیٹھ کی یکم تاریخ تھی۔ سنہ نوشیروانی کا چالیسواں سال تھا اور ماہ دی کی ۱۸ تاریخ تھی۔

بچپن: عرب میں یہ دستور تھا کہ شہر کے شریف گھرانوں کے بچے کھلی اور آزاد فضاء میں پرورش پانے کے لئے دیہات میں بھیج دیئے جاتے تھے۔ تاکہ تنومند اور بہادر جوان نکلیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہاں بچوں کو خالص عربی زبان سیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ کیونکہ شہر کے اندر مختلف ملکوں اور قوموں کے افراد کا آنا جانا ہوتا ہے اور اس میل جول سے زبان میں

باہر کے الفاظ و محاورے اور لب و لہجہ داخل ہو جاتا ہے مگر دیہات کی زبان خالص ہوتی ہے۔

پیدائش کے چند روز بعد دادا نے اپنے یتیم پوتے کو قبیلہ بنی سعد کی ایک نیک دل دایہ حلیمہ کے سپرد کیا۔

جناب حلیمہ نے آنحضرتؐ کی پرورش بڑی احتیاط اور محبت کے ساتھ کی۔ جب آپؐ تین برس کے ہو گئے تو دایہ آپؐ کو مکہ لائیں۔ ماں نے اپنے لخت جگر کو سینہ سے لگایا۔ دادا نے محبت سے چوما

بیوہ ماں نے اپنے اکلوتے اور خاوند کی تنہا یادگار بیٹے سے پورے تین برس تک جدا رہنا کیسے برداشت کیا ہو گا۔ کتنا بڑا حوصلہ ہو گا۔ بی بی آمنہ کا! . . . اتفاق سے ان دنوں شہر کی ہوا خراب تھی اور بچے بیمار ہو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بی بی آمنہ نے بچہ کو دایہ کی گود میں دیا اور کہا۔ اسے دوبارہ اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جب تک مکہ کی ہوا صحت بخش نہیں ہوتی۔ اپنے ہی پاس رکھو۔ آنحضرتؐ بنی سعد میں مزید تین برس تک رہے اور اس کے بعد جب آپؐ والدہ کے پاس آئے۔ تو اس قدر تندرست اور توانا تھے۔ کہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑے دکھائی دیتے تھے۔ والدہ اور دادا بچے کی صحت دیکھ کر حلیمہ سے بہت خوش ہوئے اور بہت کچھ انعام دے کر رخصت کیا۔ اب آپ والدہ کے پاس رہنے لگے۔

بی بی آمنہ کی دیرینہ خواہش تھی۔ کہ بچہ جب ذرا بڑا ہو۔ تو اسے اپنے مرحوم رفیق زندگی کی قبر پر لے جائیں۔ ایک وفادار بیوی کا تحفہ مرحوم خاوند کی خدمت میں ایک حسین و توانا بچے سے بڑھ کر ایک اور کیا ہو سکتا تھا چنانچہ

اگلے سال بی بی آمنہ اسی غرض سے آپؐ کو ساتھ لے کر یثرب گئیں ۔ قبر کی زیارت سے فارغ ہو کر بی بی آمنہ اپنے میکے میں کوئی ایک ماہ تک ٹھیری رہیں اور جب مکہ کو واپس روانہ ہوئیں راستہ میں ابواء کے مقام پر بیمار ہو کر انتقال فرما گئیں ۔

حضرت بی بی آمنہ کی وفادار لونڈی ام ایمن ساتھ تھی اس آڑے وقت میں کام آئی ۔ اور آپؐ کو بڑی احتیاط کے ساتھ آپؐ کے دادا عبدالمطلب کے پاس پہنچایا عبدالمطلب کو اس المناک حادثہ سے بہت دکھ ہوا ۔ پوتے کو سینہ سے لگایا اور بہت محبت سے پرورش کرنے لگے ۔ لیکن اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے بیاسی برس کی عمر تھی تھوڑی مدت بعد اس جہان سے رخصت ہو گئے اور اس یتیم پوتے کو اپنے ہونہار فرزند ابو طالب کے سپرد کر گئے

آنحضرتؐ پیدا ہوئے تو باپ زندگی کے دن پورے کر چکا تھا ۔ ابھی چھ برس کے ہوئے تھے کہ ماں کی محبت بھری گود سے محروم ہونا پڑا ۔ ماں باپ کے بعد دادا نے سہارا دیا ۔ تو وہ بھی دو سال بعد چل بسے ۔ اب ان کی دیکھ بھال پرورش کی ذمہ داری چچا ابو طالبؓ نے سنبھالی اور حق یہ ہے کہ انہوں نے بھتیجے کو اولاد سے بڑھ کر پیار سے پالا ۔ آپؐ کو بھی چچا سے بے حد محبت تھی ۔ ایک بار ابو طالب نے تجارت کی غرض سے شام کے سفر کا قصد کیا جب جاتے جانے لگے تو آنحضرتؐ محبت کے مارے چچا سے لپٹ گئے اور ساتھ جانے پر اصرار کیا ۔ مہربان چچا کو ساتھ لے جاتے ہی بنی ۔ اس وقت آپؐ کی عمر تقریباً بارہ برس تھی ۔

جوانی : جوان ہو کر آپ نے عرب کے دستور کے مطابق کچھ مدت بکریاں اور اونٹ چرائے ۔ خاندان میں سبھی لوگ تجارت کرتے تھے ۔

چنانچہ آپ نے بھی جلد اس طرف رخ کیا اور چھوٹی موٹی تجارت شروع کر دی لین دین کی صفائی اور وعدہ کی سچائی نے آپ کا نام دور و نزدیک مشہور کر دیا سبھی جانتے ہیں تجارت میں کامیابی کا سب سے بڑا گُر نیک نامی اور ساکھ ہے۔

آنحضرتؐ پر لوگوں کے اعتماد اور یقین کا ابھی سے یہ عالم تھا کہ بے کھٹکے اپنی رقمیں آپؐ کے پاس امانتاً رکھ جاتے اور اندھیر سویرے آجاتے جب چاہتے واپس لے جاتے۔ آپؐ کی دیانت کی شہرت یہاں تک بڑھی کہ سب چھوٹے بڑے آپؐ کو الامین شک و شبہ سے بالا دیانت دار اور الصادق بے مثال ہر صداقت کا پتلا کہہ کر پکارنے لگے۔

اس زمانہ میں عربوں کی اخلاقی حالت بہت پست تھی۔ شراب۔ جوا۔ زنا اور لوٹ مار اس وقت کے جوانوں کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ پورا معاشرہ اسی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن ماحول کی اس عام پستی کے باوجود حضور کی جوانی صبح صادق کی طرح بے داغ اور پاکیزہ تھی۔ آپؐ کی صالح طبیعت نیک و بد میں خوب تمیز کر سکتی تھی۔ آپؐ کے ہم عمر جوانی کی سیہ کاریوں میں بدمست تھے۔ نوجوان جب محفلیں جما کر بیٹھتے تو بے اختیار محمد کی شرافت اور دیانت کی داد دیتے مکہ کے زیرک لوگ آپؐ کی ابھرتی ہوئی شخصیت کے ایک اور پہلو کو بھی جان گئے تھے۔ یعنی بے مثال فہم و فراست۔ جب آپؐ نے اپنی غیر معمولی دانش و تدبر سے کام لے کر ہم وطنوں کو ایک خوفناک لڑائی سے بچا لیا۔

واقعہ حجر اسود: واقعہ یوں ہے کہ خانہ کعبہ کی دیواریں سیلاب سے گر جانے کے باعث دوبارہ اٹھائی جا رہی تھیں اور اس تعمیر میں مکہ کے سب قبیلے شریک کار تھے۔ تعمیر کا کام نہایت تعاون اور دوستی کی

فضا میں پار ہا تھا۔ کہ حجر اسود کے نصب کرنے کا معاملہ آن پڑا۔ حجر اسود ایک مقدس پتھر ہے۔ ہر قبیلہ کے لوگوں کے دل میں یہ خواہش مچلنے لگی کہ حجر اسود کو اس کی جگہ رکھنے کا شرف صرف اسی کو حاصل ہو۔ قریب تھا کہ تلواریں سونت لی جاتیں اور خون خرابے کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا۔ بعض سمجھ دار لوگ اس معاملہ کو نمٹانے کے لیے صحن کعبہ میں جمع ہوتے۔ مگر کسی طور یہ معاملہ حل ہوتا دکھائی نہ دیا۔ حسنِ اتفاق سے کسی معمر کی زبان سے یہ تجویز نکلی۔ کہ جو شخص کعبہ میں سب سے پہلے داخل ہو۔ اُسے حَکَم (ریچ) مان لیا جاتے۔ اور جو وہ فیصلہ کرے اسے قبول کریں۔ یہ تجویز سب نے مان لی۔

انہوں نے دیکھا کہ آنحضرتؐ کعبہ میں سب سے پہلے داخل ہوئے تھے سب پکار اُٹھے کہ (الامین) ہمارا حکم ہوگا۔ آپ نے ایک چادر میں حجر اسود کو رکھا اور سب سرداروں کو موقع دیا کہ چادر کو کونوں سے پکڑ کر اوپر اٹھائیں اور اس شرف میں شریک ہوں۔ جب مقدس پتھر اپنی مخصوص جگہ کے برابر پہنچ گیا تو آپ نے اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر اُسے وہیں رکھ دیا۔ آپؐ کے اس طرز عمل سے لوگ بہت خوش ہوتے اور جس نے سنا آپؐ کی تعریف کی۔

جس دور میں ہر طرف عیاشی اور فحاشی کا چرچا ہو بدمستی اور دھڑہ بندی کا دور دورہ ہو آپؐ کا یہ اسوۂ پاک اہل شہر کے لئے کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا اس لئے وہ آپ کو اعلان نبوت سے پہلے الصادق اور الامین کہہ کر پکارتے اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

دوسری خوبیوں کے علاوہ حیا اور خودداری کی صفات اس زمانہ میں بھی آپ میں بیحد نمایاں تھیں بچپن میں بھی آپؐ جسم ننگا نہ ہونے دیتے تھے ایک مرتبہ ایسا ہوا تو آپؐ بیہوش ہو کر گر پڑے خودداری کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ کوشش کرتے کہ آپ کا بوجھ چچا پر نہ پڑے اور اپنی معاشی خود پیدا کریں۔ شادی

کے بعد مالدار بیوی کا مال شیر مادر کی طرح حلال نہ سمجھا بلکہ اس وقت بھی روزی اپنے گنڈوں کی کمائی سے حاصل کرنے کی کوشش فرماتے رہے۔

حلف الفضول: عرب کی تاریخ کا یہ زرّیں کارنامہ ہے ایک معاہدہ تھا جس پر دستخط کرنے والے اشخاص میں کئی لوگوں کا نام فضل تھا اس لیے اس معاہدہ کو "حلف الفضول" کہتے ہیں۔ اس معاہدہ کی شرائط میں اہم باتیں یہ تھیں کہ ہم جنگ وجدل کو مٹائیں گے۔ اپنے قبیلہ کی حدود سے لوٹ مار ختم کریں گے۔ مسافروں کی حفاظت اور غریبوں یتیموں کی دیکھ بھال کریں گے۔ آنحضرتؐ کی کوششوں سے کئی قبیلوں نے اس معاہدہ کو مان لیا اور اس طرح دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلا اجتماعی معاہدہ امن طے پایا

شادی: مکہ میں خدیجہ نامی ایک مالدار بیوہ خاتون رہتی تھیں۔ جن کا نام تو خدیجہؓ تھا۔ مگر لوگ انہیں طاہرہ (پاک دامن اور پاکیزہ) کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کا والد خویلد بہت دولت مند تاجر تھا۔ اس نے زندگی ہی میں اپنی ساری دولت اور تجارت اپنی اکلوتی بیٹی کے سپرد کر دی تھی انہیں بیوہ ہوئے اب کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ کئی عرب سرداروں نے انہیں شادی کا پیغام بھیجا۔ لیکن وہ تنہا رہنے کا فیصلہ کر چکی تھیں چونکہ دو بار بیوہ ہو چکی تھیں۔

جب آنحضرتؐ کی دیانت اور شرافت کا چرچا ہوا تو خدیجہؓ نے آپؐ کو بُلا کر کہا "آپؐ میرا مالِ تجارت شام لے جائیں۔ میں آپؐ کو اوروں سے دُگنا معاوضہ دوں گی۔" آپؐ نے یہ شرط قبول کر لی اور ملک شام تشریف لے گئے اس سفر میں خدیجہؓ کا غلام میسرہ آپ کے ساتھ تھا۔ تجارت میں فائدہ توخدیجہؓ کی توقع سے بڑھ کر رہا ہی تھا۔ مگر میسرہ نے آنحضرتؐ کے اس سفر کے واقعات اور آپ کے اخلاق

کے بارے میں سن کر اس قدر گرویدہ ہو گئیں کہ آپؐ کو شادی کا پیغام بھجوایا آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے مشورہ کے بعد اسے قبول کر لیا اور اس طرح آپؐ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہو گئی۔ شادی کے وقت آپؐ کی عمر پچیس ۲۵ برس اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس ۴۰ برس کے قریب تھی آنحضرت صلعم اور حضرت خدیجہؓ کی عمر میں گو بہت تفاوت تھا اور وہ بیوہ بھی تھیں مگر ان کی زندگی عزت، محبت اور ایثار کی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی ایسی خوشگوار مثالیں تاریخ عالم میں بہت کم نظر آتی ہیں، جب تک وہ زندہ رہیں۔ آنحضرتؐ نے کوئی دوسرا نکاح نہ کیا۔ شادی کے بعد پورے پچیس سال تک آپؐ نے اپنی جوانی کی عمر اس بزرگ بیوہ خاتون کے ساتھ گذاری۔

شادی کے بعد آپؐ خاصے فارغ البال ہو گئے حضرت خدیجہؓ نے اپنی ساری دولت آپؐ کے سپرد کر دی۔ مگر آپؐ نے اس میں سے اپنی ذات پر کبھی خرچ نہ کیا آپؐ ضرورت سے بچی ہوئی دولت کو غریبوں اور محتاجوں کی امداد میں صرف کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ نکاح کے تقریباً پندرہ ۱۵ سال بعد حضرت خدیجہؓ کی تمام دولت ختم ہو چکی تھی۔

اس عہد کے دو واقعات اور قابل ذکر ہیں۔ حضرت خدیجہؓ نے اپنے ایک غلام زیدؓ کو آپؐ کی خدمت میں دے دیا تھا۔ آپؐ نے اُسے آزاد قرار دے کر فرمایا "تم چاہو تو میرے پاس رہ سکتے ہو۔ چاہو اپنے ماں باپ اور عزیزوں میں جا سکتے ہو۔ تم آج سے آزاد ہو"۔ حضرت زیدؓ نے اپنی مرضی سے آپؐ کی خدمت میں رہنا پسند کیا۔ جب اُن کے رشتہ داروں نے گھر لے جانا چاہا تو انہوں نے صاف جواب دے دیا اور جانے سے انکار کر دیا۔

آپ کے چچا ابو طالب بہت عیالدار تھے۔ احسان کرنے والے چچا کے ساتھ اب

نیک سلوک کرنے کا وقت تھا۔ آپؐ نے ان کے ایک بیٹے حضرت علیؓ کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور ایک دوسرے حضرت جعفرؓ کو اپنے چچا حضرت عباسؓ کے پاس رکھنے کا اہتمام کیا۔ تاکہ چچا کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔

بعثت اور تبلیغ اسلام

بعثت: آپؐ کی عمر کوئی ۳۵ برس کی ہوئی تو آپؐ اکثر کسی گہری سوچ میں ڈوبے دکھائی دیتے تھے آپؐ اپنوں اور بیگانوں سے تعلقات میں کمی اب بھی نہ آئی تھی۔ گلی کوچہ سے گزرتے وقت چھوٹے بچوں کو اب بھی شفقت بھری نظر سے دیکھتے اور پیار سے انہیں قریب بلاتے کوئی بچہ انگلی پکڑے ہوتا کوئی دامن سے چمٹا ہوتا۔ کوئی کاندھے پر سوار ہوتا۔ محتاجوں اور غریبوں کی دیکھ بھال بھی ویسی ہی کرتے جیسی پہلے فرماتے تھے۔ مگر آپؐ کی روشن اور چمکدار آنکھیں کسی گہری فکر کا پتہ ضرور دیتی تھیں۔

آپؐ اکثر خاموش رہتے چاروں طرف پست اخلاقی اور جہالت کی تاریکی چھائی تھی۔ آپؐ کے ذہن میں ایک قندیل روشن تھی وہ بڑھ کر آس پاس کی تمام تاریکیوں کو مٹا دینا چاہتی تھی۔ مگر یہ کیونکر ہو؟ آپ کے دل میں عام انسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اور یہ جذبہ دن بدن شدید اور پختہ ہوتا جاتا تھا۔

آنحضرتؐ کو تنہا رہ کر سوچنے اور خدا کی قدرت پر غور کرنے میں زیادہ لطف آتا تھا۔ مکہ کے قریب ایک پہاڑ کے غار میں جس کا نام حرا ہے چلے جاتے اور صبح شام خدا کی عبادت میں لگے رہتے۔ مکہ کے قریب یہ غار اب بھی شمال مشرق کی سمت تین میل کے فاصلے پر موجود ہے، سوتج ہمارا اور

عبادت گزاری کا یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ آپؐ کئی کئی دن کی خوراک، ستو اور کھجور وغیرہ ساتھ لے جاتے اور مصروفِ عبادت رہتے جب خوراک ختم ہو جاتی تو گھر آتے۔ عزیز و اقارب کی خیر خیریت پوچھ کر اور خوراک لے کر پھر حرا میں تشریف لے جاتے تھے۔

نزولِ وحی: آنحضرتؐ کی عمر چالیس برس کی ہوئی تو خداوندِ عالم نے بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے عظیم الشان کام کے لیے آپ کو منتخب کیا۔ اور آپؐ کو ساری دنیا کے انسانوں کے واسطے قیامت تک کے لیے رسول مبعوث فرمایا اور آپؐ پر قرآن جیسی لازوال اور پُرحکمت کتاب نازل ہونا شروع ہوئی۔ ایک روز حسبِ معمول آپ غارِ حرا میں مصروفِ عبادت تھے کہ حضرت جبرئیلؑ جو خدا کا پیغام لے کر آئے اور سب سے پہلے وحی آپؐ تک پہنچائی جس کے الفاظ یہ تھے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝	(اپنے اس رب کے نام سے پڑھ جس نے (کائنات کو) پیدا کیا، جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا رب بڑا ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا

(العلق ۱تا۵)

حضرت جبرئیلؑ کو دیکھنا اور پیغامِ ربانی کا پانا آپؐ کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ آپؐ کا دل کانپ اٹھا، اور پیشانی سے پسینہ بہنے لگا۔ اس نئے تجربے اور اتنی بڑی ذمہ داری کے احساس سے گھبرا کر اٹھنا بالکل قدرتی امر تھا۔

غار سے نکل کر آپؐ فوراً گھر پہنچے اور حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کیا آپؐ

کو گھبرایا ہوا دیکھ کر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی اور کہا، "آپ غریبوں پر رحم فرماتے ہیں ۔ بیکسوں کی مدد کرتے ہیں اور جو قرض کے بوجھ تلے دبے ہوں ان ان کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو یوں نہ چھوڑ دے گا۔" پھر آپؐ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ کے ہاں لے گئیں ۔

ورقہ بن نوفل عیسائی کے عالم تھے انہوں نے رسول پاکؐ سے یہ ماجرا سنا تو کہا "یہ وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ اور عیسیٰؑ پر اترا تھا۔ اسرائیلی پیغمبروں کی پیشین گوئیاں آپؐ پر صادق آئیں گی۔ پھر کہا بھتیجے! کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں ۔ جب تمہاری قوم تم سے لڑے گی اور یہاں سے نکال دے گی ۔ کاش میں اس وقت تمہارا ساتھ دیتا۔" آنحضرتؐ نے حیرت سے پوچھا "کیا میری قوم مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور کرے گی؟" ورقہ نے جواب دیا، "پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ان کی بدکردار قوموں نے ایسے ہی سلوک کئے ہیں ۔"

تبلیغ کا آغاز: تبلیغ نبی کے اولین فرائض میں سے ایک فرض ہے، نبی کے معنی خبر پہنچانے والے کے ہیں اسی طرح رسول اور اور پیغمبر پیغام پہنچانے والے ہی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرمؐ کو فرمایا: "یَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (المائدہ)
اے رسولؐ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ پہنچا دیں اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے فریضۂ رسالت ادا نہیں کیا۔"

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تبلیغ نبی کا فرض منصبی ہے ۔ ابتداء میں حضورؐ خاموشی کے ساتھ رازدارانہ انداز میں اپنے بہت قریبی احباب اور ساتھیوں کو اللہ کا پیغام پہنچاتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت زیدؓ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔

اس کے بعد آپؐ کو حکم ہوا کہ آپؐ اپنے اہل خاندان کو حق کی طرف بلائیں۔

چنانچہ آنحضرتؐ نے اس دن شام کے کھانے پر اعزاواقربا کو مدعو فرمایا اس دعوت کا اہتمام آپؐ کے کم عمر چچا زاد بھائی حضرت علیؓ نے کیا۔ جب یہ لوگ کھانا کھا چکے تو حضورؐ نے اپنی بات چھیڑی اور ان لوگوں سے اسلام قبول کرنے اور اسلام کی مدد کرنے کی اپیل کی۔ آپؐ نے بار بار اُن سے سوال فرمایا کہ تم میں سے کون میری مدد کے لیے تیار ہے۔

حضرت علیؓ کے سوا کسی نے تائید نہ کی اس کے بعد آپؐ کو عام تبلیغ کا حکم ہوا۔

پہلی وحی نازل ہونے کے کچھ عرصہ بعد آپؐ پر یہ آیت اُتری:-

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ — اے چادر میں لپٹے ہوئے کھڑا ہو جا، پھر ڈرا

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ — اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔

اب آپؐ پر فرض ہو گیا کہ خدا پہ بھروسہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔ اور لوگوں کو بُرے کاموں سے روکیں۔ اور ان کے خیالات اور عقیدے درست کریں۔ نیکی کی ہدایت کریں۔

عرب کے لوگ پرلے درجے کے جاہل اور ہٹ دھرم تھے بُت پرستی ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اپنے عقیدوں کو بدلنا تو ایک طرف، بتوں کے خلاف ایک لفظ سننا بھی ان کو گوارا نہ تھا۔ ایسے میں ان کے خیالات میں ایک انقلاب پیدا کرنا اور بتوں سے ہٹا کر انہیں ایک خدا کے سامنے جھکانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ خدا کے فرمان کے مطابق آنحضرتؐ نے اس نہایت کٹھن اور عظیم الشان کام کا بیڑا اُٹھایا۔

عورتوں میں حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے ایمان لائیں۔ مردوں میں سب سے پہلے آپ کے ایک مخلص دوست حضرت ابوبکرؓ نے اسے بلا پس و پیش قبول کر لیا۔ آپؐ کے چچیرے بھائی حضرت علیؓ بچوں میں سب سے پہلے مسلمان ہوتے آپؐ کے

غلام زیدؓ بن حارث بھی جلد ہی اس حلقہ میں داخل ہو گئے۔

اس کے بعد آپؐ نے اور حضرت ابوبکرؓ نے مل کر چھپکے چھپکے قریش کے ایسے افراد کو جو طبیعت کے نیک اور سمجھ کے اچھے تھے اسلام کے اصول سمجھانے شروع کئے مشہور عرب سرداروں میں سے پانچ افراد ان کی کوششوں سے مسلمان ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔

حضرت عثمانؓ بن عفان۔ حضرت زبیرؓ۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت طلحہؓ۔

اس خاموش تبلیغ کا سلسلہ اور لوگوں تک بھی پہنچا اور مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ان میں بعض غلام بھی تھے جن کے نام یہ ہیں۔ حضرت بلال حبشیؓ۔ حضرت عمارؓ بن یاسر۔ حضرت خباب بن ارت اور حضرت صہیبؓ رومی۔ قریش کے چند نوجوان بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے جن میں حضرت عبیدہؓ اور حضرت ارقمؓ زیادہ مشہور رہیں

حضرت ارقمؓ کا گھر جو کعبہ کے قریب واقع تھا اسلام کا پہلا مرکز بنا آنحضرتؐ ہر روز وہاں تشریف لے آتے اور مسلمانوں کو خدا کے احکام سناتے اور ان کو نیکی کی تلقین کرتے تھے۔ یہیں چھپ کر مسلمان نمازیں ادا کرتے اور اشاعت اسلام کے پروگرام طے کرتے تھے۔

حضورؐ کی تعلیم : آپؐ اکثر فرمایا کرتے اے لوگو! بُرے اعمال سے بچو، اس لئے کہ پہلی قومیں بُرے اعمال کے باعث تباہ و برباد کی گئیں زنا سے بچو۔ جھوٹ سے پرہیز کرو کسی کا حق مت چھینو، رشتہ داروں کا حق پہچانو۔ مسافروں اور کمزوروں پر ظلم کا ہاتھ دراز مت کرو اپنی بچیوں کو قتل کرنے سے باز رہو کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ بڑوں کا ادب کرو، چھوٹوں سے

شفقت کے ساتھ پیش آؤ۔ جب وعدہ کرو تو اسے نبھاؤ، سر پر قرض ہو تو اسے ادا کرو، پورا تولو، پورا ناپو۔ بتوں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کی عبادت کرو غریبوں اور محتاجوں کی اپنے دھن دولت سے مدد کرو اس لئے کہ غریبی اور امارت کے امتیاز سب عارضی ہیں۔ اور خدا کے نزدیک سیاہ و سفید، امیر اور غریب، غلام اور آقا، حبشی اور قریشی سب برابر ہیں اور اصل بڑائی مال و دولت سے نہیں بلکہ نیکی اور تقوی سے حاصل ہوتی ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے کلمہ طیبہ میں اس ساری تعلیم کا نچوڑ ہے۔ اسی لئے جو انسان آپؐ کی تعلیمات سے متاثرہ ہوتا اور مسلمان ہونا چاہتا تو اسے یہ کلمہ پڑھایا جاتا تھا اب بھی جو کوئی مسلمان ہوتا ہے اسے سب سے پہلے یہ کلمہ پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے۔ اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد قدرتی طور پر انسان کی طبیعت میں برائی اور ظلم سے نفرت اور نیکی اور اچھائی کی طرف رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔

قریش مکہ کی مخالفت: اس کے بعد آپؐ کو اعلانیہ تبلیغ کا حکم ملا چنانچہ آپؐ نے مکہ کی صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارا اور فرمایا۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے عقب میں ایک بھاری لشکر تم پر حملہ کرنے کو ہے تو کیا تم مان لو گے"؟ انہوں نے جواب دیا "یقیناً" کیونکہ آپؐ نے کبھی جھوٹ بات نہیں کہی۔" اس پر آپؐ نے فرمایا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اگر تم لوگوں نے بتوں کو چھوڑ کر ایک خدا کے سامنے جھکنا نہ سیکھا اور برائیوں سے الگ نہ ہوئے تو تم پر سخت عذاب آئے گا" اس بات کے سننے کو کون تیار تھا؟ ابولہب تو مارے غصے کے لال پیلا ہو رہا تھا چلا کر اٹھا اور چلا گیا دوسرے بت پرست بھی باتیں بناتے اور ناک بھوں چڑھاتے وہاں سے چل دیئے۔

اب آنحضرتؐ نے کھلم کھلا بت پرستی کی برائیاں بیان کرنی شروع کیں اور جہاں موقع ملتا لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے مسلمانوں کی تعداد بھی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی جب مشرکین مکہ کے سرداروں نے دیکھا کہ یہ معاملہ قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے تو انہوں نے مسلمانوں کو ستانا اور تنگ کرنا شروع کر دیا۔

اسلام دشمنی میں دوسروں کے علاوہ ابولہب، ابوجہل اور ابوسفیان پیش پیش تھے کئی بار آنحضرتؐ کے راستے میں کانٹے بچھا دیتے۔ آپؐ نماز پڑھنے کھڑے ہوتے یا گلی کوچے سے گزرتے تو بعض شریر آپؐ پر آوازے کستے کوڑا کرکٹ پھینکتے اور لوگوں میں شاعر، جادوگر اور پاگل وغیرہ مشہور کرتے۔

ایک روز مشرکین مکہ کے سردار وفد کی صورت میں آپؐ کے چچا ابو طالب کے پاس آئے اور کہا "تمہارا بھتیجا ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتا ہے اور ہمارے باپ دادا کو گمراہ بتاتا ہے۔ اب یا تو تم درمیان سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آ جاؤ تا کہ ہمارا اور تمہارا فیصلہ ہو جائے۔" ابوطالب حالات کی نزاکت کو بھانپ گئے۔ آنحضرتؐ کو بلا کر کہا "میرے پیارے بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میں اٹھا نہ سکوں"۔

ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر آپؐ کو دکھ تو ہوا ہوگا۔ مگر آپؐ نے فرمایا چچا جان! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا۔ آپؐ کے اس پختہ یقین اور مستقل مزاجی کا چچا کے دل پر گہرا اثر ہوا اور انہوں نے کہا "بھتیجے! اچھا اپنا کام کیے جاؤ جب تک میں زندہ ہوں یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

قریش مکہ نے اس چال کی ناکامی کے بعد دوسری پیش کش یہ کی کہ اپنے ایک سردار عتبہ کو آنحضرتؐ کے پاس بھیجا اور کہلا دیا "اے محمدؐ! قوم میں پھوٹ ڈالنے سے کیا فائدہ؟ اگر تم مکہ کی سرداری چاہتے ہو تو ہم قبول کرنے کو حاضر ہیں۔ اگر کسی بڑے گھرانے

میں شادی کے خواہشمند ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر دولت چاہیے۔ تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ مگر تم اس کام سے باز آجاؤ۔"

قریش کو خیال تھا کہ آنحضرتؐ پر اس تجویز کا جادو ضرور چل جائے گا اور آپؐ کسی نہ کسی لالچ میں آکر ان سے صلح کر لیں گے۔ مگر آپؐ نے جواب میں جو کچھ کہا عتبہ کی توقع کے وہ قطعی خلاف تھا اور وہ اس سے بے حد متاثر ہوا۔ آپ نے جواباً قرآن مجید کی چند آیات اس کو سنائیں۔

میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحم کرنے والا اور مہربان ہے۔ یہ کتاب خدائے رحمٰن نے نازل فرمائی ہے۔ اس کی آیات عربی میں ہیں۔ یہ تو صاف طور پر تمہاری سمجھ میں آسکتی ہیں۔ ان میں اُن لوگوں کے لیے ہدایات ہیں جو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس میں بشارتیں ہیں اور عذاب کی وعیدیں ہیں لیکن اکثر لوگ منہ پھیر لیتے ہیں اور اس پر کان نہیں دھرتے اور کہتے ہیں یہ بات کہ جس طرف تو ہمیں بلاتا ہے وہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی ہمارے کان بہرے ہیں اور تیرے اور ہمارے درمیان ایک پردہ حائل ہے اس لئے جیسا تو بہتر سمجھتا ہے ویسا ہی کئے جا اور ہم اپنے ہی خیالات کے مطابق عمل کریں گے (حم سجدہ)

ان آیات کا سننا تھا کہ عتبہ بن ربیعہ کا دل ہل گیا اور اس پر پیغام الٰہی کی حقیقت کھل گئی کہ واپس جا کر اس نے قریش سے کہا: "بھائیو! محمدؐ جو کلام پڑھتے ہیں وہ نہ شاعری ہے نہ جادوگری۔ میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آگئے۔ تو یہ ہماری عزت ہے۔ ورنہ عرب کے لوگ خود ان کا خاتمہ کر دیں گے۔" قریش بھلا ایسی نصیحت پر کہاں عمل کر سکتے تھے۔ وہ مخالفت سے کسی صورت باز نہ آئے۔

قریش کے مظالم کی رفتار اسی انداز میں بڑھ رہی تھی جس طرح مسلمانوں

کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے سرداروں پر تو قریش کا کوئی بس نہ چلتا تھا اس لئے انہوں نے غریب اور غلام مسلمانوں کو اپنے ظلم اور غیظ و غضب کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جاتا۔ سینے پر آگ جیسے گرم پتھر رکھے جاتے۔ بعض کو رسی سے باندھ کر گرم ریت پر گھسیٹا جاتا۔ حضرت بلالؓ حضرت صہیبؓ حضرت خبابؓ حضرت یاسرؓ اور کئی اور اصحابؓ کو اس قسم کی اذیتیں دی گئیں۔

مخالفت کے اسباب:۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے پختہ اور راسخ حالات کو چھوڑنا کبھی گوارا نہیں کرتی۔ اور نئے خیالات بہت مشکل سے قبول کرتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس خیال کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

آئین نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہ بات جاہلوں کے بارے میں اور بھی صحیح ہے۔ وہ باپ، دادا کے عقیدوں پر ایسے فریفتہ ہوتے ہیں۔ کہ ان کی خاطر مرنے مارنے پر تیار رہتے ہیں عرب کے جہلا کئی پشتوں سے بتوں کو پوجتے چلے آتے تھے۔ جب حضور صلعم نے یہ تعلیم دی کہ بت محض پتھر کی بے جان مورتیاں ہیں جو نہ کسی کو نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان تو وہ بھڑک اٹھے اس بات کے مان لینے سے نہ صرف یہ لازم آتا تھا کہ وہ خود جاہل اور بے علم ہیں، بلکہ ان کے باپ، دادا بھی گمراہ ثابت ہوتے تھے اور عربوں کی عزت اور اجداد پرستی کے یہ عین منافی تھا۔ ابوجہل نے اپنی آخری عمر میں بارہا کہا کہ حضرت محمدؐ جو تعلیم دیتے ہیں۔ وہ سچ بھی ہو تو بھی میں اپنے باپ دادا کے مذہب سے کیسے منہ موڑوں؟ اس طرح کی ہٹ دھرمی عربوں میں عام تھی۔

نبی اکرمؐ گو قریش کے با عزت گھرانے سے تھے مگر پیدائش سے پہلے ایک تو اُن کے والد اس دنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ دوسرے ان کی مالی حالت کچھ ایسی اچھی نہ تھی آنحضرت کی پرورش یکے بعد دیگرے ان کی والدہ۔ دادا اور چچا نے کی تھی۔ قریش کے دولت مندوں اور بڑے بڑے تاجروں کو ان کی دولت اور شان و شوکت یہ اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ ایک غریب اور یتیم کو اپنا راہنما مان لیں۔

مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ اسلام مساوات اور اخوت کا پرچار کرتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے انسان سب ایک درجہ کے ہیں۔ اسلام نسل، رنگ، قومیت اور امارت و دولت کے تمام امتیاز مٹا دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ امیروں کو حکم دیتا ہے کہ جی کھول کر خدا کی راہ میں خرچ کریں اور غریبوں کے معیار زندگی کو بہتر بنائیں۔ عیاش پسند اور پر نخوت قریش جن کے گھروں میں غلاموں اور لونڈیوں کی قطاریں بندھی ہوئی تھیں بھلا اس تعلیم کو پھیلنے کا کیوں موقعہ دیتے! وہ عیش و عشرت اور لہو و لعب کے دلدادہ تھے اور اس کو باقی رکھنے کے لئے اسلام سے لڑنا اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنا ان کے لئے ضروری امر تھا۔

ایک اور وجہ یہ تھی کہ قریش کعبہ کے متولی تھے۔ اس حیثیت سے تمام ملک میں ان کی عزت اور وقار کا سکہ بیٹھا تھا۔ ہر سال ہزاروں لوگ کعبہ کی زیارت کو آتے قریش کی تھیلیوں کو سیم و زر سے بھر دیتے۔ اب انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی۔ کہ اگر اسلام پھیل گیا اور بت پرستی مٹ گئی۔ تو اُن کے یہ ٹھاٹھ باٹھ نہیں رہیں گے۔

اوّلیں مسلمان:۔ حضور اکرمؐ تمام مخالفتوں اور شرارتوں کے باوجود کافر فریضہ انجام دیتے رہے اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ آغاز دعوت کے پہلے ہی دن اسلام قبول کرنے والوں کے اندر عورتوں میں آپؐ کی خاتون حضرت خدیجہؓ مردوں میں آپؐ کے دوست ابوبکر صدیقؓ بچوں میں چچا

زاد بھائی علی مرتضیٰؓ غلاموں میں زیدؓ بن حارث تھے۔

ان کے بعد دعوت اسلامی کے ابتدائی شیدائیوں میں ذیل کے اسمائے گرامی خاص طور قابل ذکر ہیں حضرت ارقمؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف، حضرت طلحہؓ، حضرت صہیب رومیؓ حضرت ام الفضل فاطمہؓ، حضرت عمارؓ، حضرت عبیدہؓ بن حارث، حضرت امیر حمزہؓ اور حضرت عمرؓ (اللہ ان سب سے راضی ہو)

حضرت ابوذر غفاریؓ: اسلام قبول کرنے والوں کی فہرست میں پانچویں یا چھٹے بزرگ ہیں مکہ سے ملک شام کو جانے والی سڑک کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے زندگی کا ابتدائی دور رہزنی اور غارت گری کا تھا۔ مگر خدا نے سمجھ دی تو نہایت پرہیزگاری اور خدا ترسی کی زندگی اختیار کر لی۔ کسی مسافر کی زبانی آنحضرت صلعم کی اڑتی اڑتی خبر سنی، تصدیق اور تحقیق کے لئے پہلے بھائی کو بھیجا، پھر خود روانہ ہو گئے۔

مکہ پہونچے تو خانہ کعبہ میں مسافروں کی طرح جا ٹھہرے۔ کسی سے کوئی ذکر نہ کیا۔ خودداری نے گوارہ نہ کیا کہ خدا کے رسول کا گھر اس کے کسی باغی بندہ سے دریافت کریں دو چار یا دس بیس دن نہیں پورے چالیس دن گذر گئے کھانے کو کچھ نہ رہا تو زمزم کے پانی پر گزارہ کرتے رہے، مگر کسی سے کوئی سوال نہ کیا۔

دو ایک بار حضرت علیؓ اس مسافر کو گھر لے گئے اور بعد مشکل آمد کی وجہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ آپ کو رسول صلعم کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو گوہر مقصود مل گیا۔ دین کی تعلیم سنی اور فوراً کلمہ شہادت پڑھ لیا۔

حضرت امیر حمزہؓ: آنحضرتؐ کے چچا تھے۔ وہ بڑے بہادر اور طاقت ور تھے۔ اور مکہ میں ان کی شہ زوری کی دھاک تھی۔ شکار اُن کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ صبح تیر کمان لے کر قریب کے پہاڑوں میں چلے جاتے اور شام کو لوٹتے۔ ابوجہل آنحضرتؐ کو دق کرنے میں پیش پیش تھا۔ ایک روز حضورؐ بازار سے گزر رہے تھے۔ اس نے آپ کی شان میں گستاخیاں کیں۔ بدزبانی سے کام لیا۔ اور شریر لونڈوں کو ساتھ لے کر آپؐ پر آوازے کسے۔

حضرت امیر حمزہؓ کی ایک لونڈی یہ سارا واقعہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل پر چوٹ لگی۔ جب حضرت حمزہؓ شکار سے لوٹے تو لونڈی نے سارا ماجرا ان سے کہہ سنایا۔ سنتے ہی حضرت حمزہؓ کا خون کھولنے لگا۔ فوراً ابوجہل کی تلاش میں نکلے۔ اس وقت ▪▪ کعبہ میں بیٹھا بعض کافروں کے ساتھ اسلام دشمنی کے پروگرام بنا رہا تھا۔ حضرت حمزہؓ نے اسے للکارا اور کہا۔ آج سے میں بھی مسلمان ہوں۔ چاہو تو ابھی بازو آزما لو۔“ ابوجہل ان کو غصہ میں دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ اور چپکا ہو رہا۔ حضرت حمزہؓ اسی وقت حضرت ارقمؓ کے گھر پہنچ کر حضور رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔

حضرت عمرؓ: آپ کے اسلام لانے کا واقعہ بھی بہت عجیب ہے۔ ان کا شمار مکہ کے بہادر اور اسلام کے دشمنوں میں ہوتا تھا۔ ایک دن غصہ سے بھرے رسول اللہؐ کو (خاکم بدہن) قتل کرنے کے ارادے سے نکلے۔ راستہ میں ایک شناسا ملا۔ اس نے کہا۔ ”عمر! یہ تلوار لٹکائے کہاں جا رہے ہو؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ ”پیغمبر اسلامؐ کا خاتمہ کرنے کو۔“ شناسا نے کہا۔ ”پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو پیغمبر اسلامؐ سے بعد میں نپٹنا۔“ ”گھر کو کیا ہوا؟“ عمرؓ نے حیرانی سے دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا۔ ”تمہاری بہن اور بہنوئی تک تو مسلمان ہیں۔“

حضرت عمرؓ کی جوشیلی طبیعت کے لئے اتنا سننا ہی کافی تھا۔ فوراً بہن کے ہاں پہنچے۔

اتفاق سے بہن اور بہنوئی اس وقت قرآن مجید پڑھ رہے تھے ۔ یہ دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ بغیر کچھ کہے بہنوئی پر پل پڑے ۔ بہن بیچ بچاؤ کے لیے آگے آئی ۔ تو اسے بھی زخمی کر ڈالا ۔ اس پر بہن نے کہا " عمرؓ تم جو چاہو کرو ۔ ہم تو اسلام چھوڑنے سے رہے ۔ یہ نشہ نہیں جو کسی مار دھاڑ سے اتر جائے " پیشانی سے خون پونچھتی ہوئی بہن کی زبان سے یہ الفاظ سن کر عمرؓ سناٹے میں آگئے ۔

کچھ دیر رُکے ۔ ذہن میں ایک نیا جذبہ پیدا ہو رہا تھا ۔ بہن سے کہا ۔ بھلا میں بھی تو دیکھوں تم لوگ کیا پڑھ رہے تھے ؟ " بہن نے ان کے ناپاک ہاتھوں میں اللہ کا کلام دینے سے معذرت چاہی اور خود چند آیات تلاوت فرمائیں ۔ اللہ کا کلام سن کر عمرؓ کی دنیا بدل گئی ۔ بہن نے جو نگاہ اٹھا کر دیکھا تو بھائی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس کے بعد بہن اور بہنوئی کو ساتھ لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور اسلام قبول کر لیا ۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی ۔ اور انھوں نے جوش مسرت سے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر بلند کیا ۔ اور یہ غالباً سب سے پہلا نعرہ تھا ۔

ہجرت حبشہ :۔۔ جوں جوں لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو رہے تھے کافروں کا غیظ و غضب بڑھتا جا رہا تھا ۔ یہاں تک کہ انھوں نے عام مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا اور انھیں ہر طرح کی اذیت دی جانے لگی ۔ مجبور ہو کر ۵ھ نبوی میں سولہ مرد و عورت کا ایک قافلہ آنحضرتؐ کی اجازت سے حبشہ کو ہجرت کر گیا ۔

نبوت کے ساتویں برس مزید ۸۳ مرد اور ۱۸ عورتیں حبشہ کو روانہ ہو گئے ۔ حبشہ کا بادشاہ نجاشی نہایت رحم دل اور منصف مزاج انسان تھا ۔ اس نے ان مسلمانوں کو بڑے امن اور آرام سے رکھا ۔ مگر قریش آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے کہاں تھے انہوں نے اپنے سفیر نجاشی کی طرف روانہ کیے اور کہلا بھیجا ۔ کہ یہ مسلمان ہمارے مجرم ہیں اور تمھارے دین عیسائیت کے مخالف ہیں ۔ اس لیے انھیں ہمارے حوالے کر دیا جائے

حقیقت حال جاننے کیلئے نجاشی نے مسلمانوں کو بلایا۔

حضرت جعفرؓ نے اس موقع پر مسلمانوں کی نمائندگی کی اور بادشاہ کے سامنے ایک شاندار تقریر کرتے ہوا فرمایا۔

" اے بادشاہ ہم لوگ جاہلیت میں غوطے کھا رہے تھے ہم پتھر کی کھودی ہوئی اور ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکتے تھے ہم مردار اور حرام کھاتے تھے۔ ہم بے حیائیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ہم رشتوں ناطوں کو کاٹتے تھے۔ ہم اپنے پڑوسیوں کے لئے صرف دکھ اور رنج تھے زور دار اسے کمزوروں پر ظلم کرتے تھے۔ آخر ہم میں اللہ نے اپنا پیغمبر مبعوث کیا۔ جس کے صدق، امانت اور پارسائی کا، ہم سب کو تجربہ ہے۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف پکارا اور برے کاموں سے نفرت دلائی۔ اور جھوٹے خداؤں سے تعلق توڑ کر ایک خدا کے سامنے جھکنے کی تعلیم دی اے بادشاہ اس نے ہم سے اصرار کیا کہ جس کی امانت ہو اس کو واپس کر دیں رشتہ دار اور خویش و اقارب کے حقوق ادا کریں پڑوسیوں سے حسن سلوک کریں۔ اللہ نے جن باتوں سے منع کیا ہے اور جن کے خون سے روکا ہے ان سے رک جائیں بے شرمی اور بے حیائی کے کاموں کو چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں نصیحت کی ہے کہ ہم جھوٹ نہ بولیں کسی کو دھوکا نہ دیں۔ یتیموں کا مال نہ کھائیں۔ اور محتاجوں کی ہر ممکن امداد کریں،

حضرت جعفرؓ کی یہ بے باکانہ اور سچی تقریر سن کر نجاشی بہت متاثر ہوا۔ مگر کفار کے بھڑکانے پر اس نے مسلمانوں سے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں عقیدہ پوچھا تو حضرت جعفرؓ سورۃ مریم کی چند آیات تلاوت کیں جس میں حضرت عیسیٰؑ کی صداقت نجاشی مزید متاثر ہوا اور قریش کے سفیروں کو ناکام واپس کر دیا

شعب ابی طالب :- اس ناکامی کے بعد کفار نے بنو ہاشم خاص طور پر آنحضرت کے خاندان کا معاشرتی بائیکاٹ کرنے کی خوفناک تجویز سوچی۔ تمام مخالف اور دشمنِ اسلام قبیلوں کے سردار اکٹھے ہوئے اور انھوں نے ایک معاہدے پر دستخط کر کے اسے کعبہ میں محفوظ کر دیا۔ معاہدہ یہ تھا کہ آج سے تمام قبیلے بنو ہاشم سے تمام تعلقات منقطع کرتے ہیں۔ آئندہ کوئی شخص ان سے لین دین نہ کرے گا۔ اور نہ ہی ان سے کسی طرح کے تعلقات قائم رکھے گا۔

ابو طالب نے اس معاہدہ کو کسی حملہ کا پیش خیمہ خیال کیا۔ اور خاندان کے تمام افراد کو لے کر ایک تنگ گھاٹی میں جو شعب ابی طالب کے نام سے مشہور ہے منتقل ہو گئے شعب ابی طالب مکہ کے قریب ایک لمبی اور تنگ گھاٹی تھی جسے پہاڑی دیواروں نے شہر سے جدا کر رکھا تھا۔ اس میں داخل ہونے کے لئے ایک چھوٹے سے دروازے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔

حضور اکرم ؐ دیگر مسلمانوں کے ساتھ یہاں کوئی تین سال کے قریب رہے یہ انتہائی مصیبت اور تکلیف کا زمانہ تھا۔ کھانے پینے کا جو سامان ساتھ لے کر گئے تھے۔ وہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ باہر سے سامان حاصل کرنے کی تمام راہیں کفار نے مسدود کر رکھی تھیں۔ بھوک اور پیاس کے مارے بلکتے ہوئے بچوں کی چیخ و پکار شہر تک سنائی دیتی تھی۔ اس دوران بھی آنحضرت ؐ بیرون مکہ سے آنے والوں کو تبلیغ کرتے رہے۔

آخر اس ظلم اور ناانصافی کو جب پورے تین سال گزر گئے تو بعض نسبتاً کم بے رحم لوگوں نے اس معاہدہ کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ دل ہی دل میں نادم ہوتے کہ انہوں نے بے گناہ لوگوں کو عذاب میں ڈال رکھا ہے آخر ایک دن ہشام بن عمرو زبیر بن ابو امیہ اور چند دوسرے سرداروں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور انہوں نے کعبہ میں جا کر بائیکاٹ کا معاہدہ پھاڑ ڈالا۔

اس طرح مسلمانوں کو اور رسول اللہ کے خاندان کو شہر میں آنے جانے کی آزادی ہو گئی، اور لوگوں نے ان کا مقاطعہ ختم کر دیا۔ اور ان سے لین دین کرنے لگے۔

جتنا عرصہ حضور گھاٹی میں رہے شہر میں اسلام نے کوئی ترقی نہ کی ان متبرک مہینوں میں جب کہ لڑائی جھگڑے حرام سمجھے جاتے تھے۔ آنحضرت اس قید خانہ سے باہر آتے اور حاجیوں میں تبلیغ کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن ابوجہل ہر جگہ آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور پکار پکار کر کہتا "یہ شخص دیوانہ ہے اس کی بات مت سنو"۔

اس کے بعد آنحضرت کو دو شدید صدمے پیش آئے۔ جن سے آپ کو بہت دکھ ہوا۔ یعنی آپ کے چچا ابوطالب اور زوجہ حضرت خدیجہؓ یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ بعثت کے بعد انھوں نے حضور کا گرم و سرد میں ساتھ دیا تھا۔ اور زندگی بھر مسلمانوں کی حمایت کی تھی۔ اُن کی باثر ذات آپ کے اور آپ کے دشمنوں کے درمیان دیوار حائل تھی۔

حضرت خدیجہؓ کی وفات سے آپ کی گھریلو اور ذاتی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا۔ جو پھر کبھی پُر نہ ہو سکا۔ حضرت خدیجہؓ صرف مونس و غمگسار ہی نہ تھیں۔ بلکہ ان کی ذات میں آپ تسکین کا سامان پاتے۔ آنحضرت کو آخری وقت تک اُن کی محبت و الفت یاد رہی۔ آپ فرمایا کرتے تھے "خدیجہؓ وہ تھیں کہ جب کسی نے مجھے نہ مانا تو انھوں نے میری رسالت اور سچائی کی گواہی دی۔ جب لوگ کفر کرتے تھے وہ ایمان لائیں۔ جب سب خون کے پیاسے تھے انہوں نے میری مدد کی"۔

قریش کے ظالموں کو ابوطالب کے رعب اور حضرت خدیجہؓ کی خاطر سے اب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ ہاتھ اٹھانے کی جرات نہ ہوئی تھی۔ اب جب یہ دونوں بزرگ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے حوصلے بڑھے اور انھوں نے آنحضرت

کے ساتھ سخت بے ادبی سے پیش آنا شروع کر دیا۔

ایک دفعہ آپؐ کسی کوچہ سے گزر رہے تھے۔ کہ کسی کافر نے سر مبارک پر خاک ڈال دی۔ آپؐ اسی طرح گھر آئے۔ آپؐ کی صاحبزادی پانی سے کر آئیں۔ وہ سر دھوتی تھیں اور آپؐ سے یہ سلوک دیکھ کر روتی جاتی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "میری لخت جگر! رو نہیں۔ خدا تیرے باپ کو یوں نہ چھوڑے گا۔

معراج النبیؐ:- ایک رات سو رہے تھے کہ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور انھوں نے بتایا کہ خداوند تعالیٰ کی رضا کے مطابق آج آپؐ آسمانوں کی سیر کریں گے۔ اور آپؐ کو دوزخ و جنت کا عینی مشاہدہ کرایا جائے گا۔ خداوند تعالیٰ کی قدرت کی کوئی حد نہیں۔

اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے۔ اور جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ چاہے تو صحرا کے خشک سینے سے چشمے پھوٹنے لگیں۔ اور دشت میں چلنے والے مسافر سراب کی موجوں میں بہہ جائیں۔ اِنَّ اللہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی قدرت کا ایک جلوہ آنحضرتؐ کو "معراج" کی صورت میں دکھایا۔

فرشتہ آپؐ کو کعبہ سے بیت المقدس (فلسطین) لے گیا۔ اور وہاں سے آپؐ آسمانوں پر گئے۔ مختلف آسمانوں کی سیر کی۔ جنت و دوزخ کے مقامات دیکھے۔ اور خدائے تعالیٰ کے قرب حقیقی سے بہرہ یاب ہوئے۔ یہ تجربہ، مذہبوں کی تاریخ میں بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ آج تک کسی شخص کو اس درجہ کی سعادت اور مرتبہ حاصل نہ ہوا تھا۔

اگلے روز صبح آپؐ نے رات کا واقعہ اور آسمانوں کی سیر کی تفصیل بیان کی۔ مسلمانوں کے دلوں نے گواہی دی کہ آپؐ صحیح اور سچ فرماتے ہیں۔ مگر کفار کو گمراہ کن پروپیگنڈا کرنے کے لیے ایک اور بات ہاتھ آگئی۔ انھوں نے اس واقعہ پر حاشیئے بڑھائے مبالغہ کے ساتھ رنگ آمیزی کی اور لوگوں کو بدظن کرنے کے لیے اس سے خوب کام لیا۔ اس واقعہ ۔ کو معراج نبویؐ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

معراج کے لفظی معنی بلندی کے ہیں اور حضورؐ نے بلندیوں کی سیر کی تھی معراج کا واقعہ سیدھا سادا ہے۔ اور بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ مگر جو نہ سمجھنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہوں بھلا اُنھیں کون سمجھائے؟ علامہ اقبالؒ نے معراج کا فلسفہ اور مفہوم یوں بیان کیا ہے۔

سبق ملا ہے۔ یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

معراج سے انسان کی لامحدود ترقی اور عروج کا پتہ چلتا ہے۔ جس میں جتنا ظرف ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ اسے اسی قدر بلند مرتبہ پر فائز کرتا ہے۔ لہٰذا حضور نبی اکرمؐ کو معراج کے بلند ترین مقام پر پہنچایا گیا۔

سفرِ طائف: آنحضرتؐ نے جب دیکھا کہ اہلِ مکہ کے دل اسلام کی طرف سے سخت ہو چکے ہیں۔ تو آپؐ نے طائف جا کر وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔ طائف مکہ سے چالیس میل کے فاصلہ پر ایک مختصر مگر بارونق اور پُرفضا آبادی تھی۔ آپؐ کے آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارث بھی اس سفر میں آپؐ کے ساتھ تھے۔

جب آپؐ نے طائف والوں کو دینِ حق کا پیغام سنایا تو نہ صرف یہ کہ انھوں نے آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ بلکہ شرارت پسند اوباش لونڈوں نے آپؐ پر گرد اڑائی اور پتھر برسائے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ حضورؐ درد کی وجہ سے کہیں بیٹھ جاتے تو وہ اُٹھا دیتے اور پھر پتھر مارتے۔ اور بدزبانی کرتے آپ بیٹھنے کی کوشش کرتے تو وہ پھر اُٹھا دیتے۔

آخر آپؐ نے ایک باغ میں پناہ لی۔ اس بے کسی کے عالم میں خدا کا فرشتہ آیا۔ اور اس نے کہا "یا رسول اللہؐ! اگر آپؐ کہیں تو طائف والوں پر ان پہاڑوں کو گرا دیا

بیانے کر دہ پس کر رہ جائیں۔" مگر رحمۃ اللعالمینؐ کی شخصیت کی عظمت کا اندازہ کیجئے! آپؐ نے فرمایا "خدایا ایسا نہ کیجیو۔ شاید کہ ان کی نسل سے کوئی اسلام کو ماننے والا پیدا ہو"
طائف کے پتھر دل کافروں نے آپ کے مضبوط ارادہ پر کوئی اثر نہ کیا۔ اب آپؐ نے فیصلہ کیا کہ آپ ایک ایک قبیلہ میں پھر کر خدا کا پیغام سنائیں گے۔

بیعت عقبہ: نبوت کے دسویں سال ماہ رجب میں مدینہ (یثرب) سے اوس اور خزرج کے چھ آدمی مکہ آئے۔ آپؐ ان سے عقبہ کے مقام پر ملے۔ اور ان کو خدا کا کلام سنایا۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر کہا "یہ تو وہی پیغمبر معلوم ہوتا ہے۔ جس کی بشارت توراۃ میں ہے۔ آؤ ہم اس رسول کو تسلیم کرنے میں یہودیوں سے پہل کریں" چنانچہ وہ مسلمان ہو گئے۔

دوسرے سال یہ یثربی اوس اور خزرج کے چھ دوسرے سربرآوردہ نمائندے اپنے ساتھ لائے۔ اسی جگہ پر جہاں پہلے چھ ایمان لائے تھے۔ یہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ انھوں نے رسول پاکؐ سے جو عہد کیا۔
اسے بیعت عقبہ اولیٰ کہتے ہیں اس کے الفاظ یہ تھے:

"ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ ہم چوری (نہ) اور زنا کاری کبھی نہ کریں گے ہم اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے ہم تہمت اور غیبت سے بچیں گے ہر اچھی بات کے لئے رسول اللہ صلعم کا حکم مانیں گے اور ہم شادی و غم میں آپ کے وفادار رہیں گے۔"

ان حضرات نے نبی اکرم صلعم سے درخواست کی کہ ان کے ہمراہ کوئی ایسا مسلمان بھیجا جائے جو ان کے ہاں جا کر اسلام کی تبلیغ کرے اور لوگوں تک خدا کے احکام پہنچائے آپ نے اس کام کے لئے حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ کو منتخب کیا انھیں اپنے

مقصد میں بہت کامیابی ہوئی اور ایک سال کے اندر اندر شہر کے کئی گھرانے مسلمان ہو گئے۔

مبلغ اسلام کی کوششوں کا بہت اچھا اثر ہوا اگلے سال جب حج کا زمانہ آیا تو یثرب سے بہتر آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئے اور رات کی تاریکی میں اسی مقام پر حضور سے ملے جہاں گزشتہ سال یثربی ایمان لائے تھے اور اسلام قبول کیا تاریخ اسلام میں اس واقعہ کو بیعت عقبہ ثانی یعنی عقبہ کی دوسری بیعت کہتے ہیں یہ لوگ اوس اور خزرج کے چیدہ چیدہ افراد تھے انھوں نے حضور نبی اکرمؐ اور باقی مسلمانوں کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔

اس وقت آپ کے چچا عباسؓ آپ کے ساتھ تھے۔ وہ گو ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے لیکن آپؐ سے بہت محبت رکھتے تھے۔ انھوں نے یثرب والوں سے کہا

"محمدؐ اپنے خاندان میں بہت معزز ہیں اور ان کے جان نثاروں نے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے اب تم انھیں اپنے ہاں بلانا چاہتے ہو یہ بڑی ذمہ داری کی بات ہے اس میں کئی خطرے ہیں اگر تم مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ ارادہ ترک کر دو" یثرب کے ایک سردار براءؓ نے جواب دیا

"ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں"

وہ ابھی فقرہ کہنے پائے تھے کہ ایک اور سردار ابوالہیثمؓ نے کہا۔

"یا رسول اللہ! یہودیوں سے ہمارے تعلقات ہیں جو ظاہر ہیں۔ اب ٹوٹ جائیں گے ہمیں ڈر یہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ جب اسلام کو قوت اور طاقت حاصل ہو جائے تو آپؐ ہم کو چھوڑ کر مکہ چلے آئیں" آپ نے مسکرا کر فرمایا "تمہارا خون میرا خون ہے تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔"

اور رسول اللہ صلعم نے اپنے اس قول کو آخر تک پورا کیا۔

ہجرت اور غزوات

ہجرت مدینہ: نبوت کے بارھویں سال یثرب (مدینہ) والوں نے عقبہ کی بیعت کی۔ اگلے سال ان کے مزید ۷۲ کے قریب افراد نے اسلام قبول کیا اور رسولِ خدا کو مکہ چھوڑ کر یثرب آنے کی دعوت دی آپ کی حفاظت کا پختہ عہد کیا اس عہد اور اس دعوت سے اسلام کی تاریخ میں ایک نئے اور سنہرے باب کا آغاز ہوتا ہے اب تک مسلمان مکہ کے کفار میں گھرے ہوئے اور ہر دم خوف و ہراس میں مبتلا تھے انہیں چلنے پھرنے، خیالات کے ظاہر کرنے، حتیٰ کہ مذہبی عبادت کی ادائیگی میں بھی آزادی حاصل نہ تھی یثرب والوں نے انہیں ایک ایسے خطہ کی پیشکش کی جہاں انہیں ہر طرح کی آزادی میسر آ سکتی تھی اور تبلیغِ اسلام کے لئے مواقع موجود تھے۔ یہ تمام مسلمانوں کے لئے خوش آئند تھا برسوں کے ستائے ہوئے اور قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے مسلمانوں نے حضورؐ کے فرمان کے مطابق آہستہ آہستہ اور خفیہ خفیہ یثرب کو ہجرت کرنا شروع کیا ہر روز دو چار مسلمان اپنے گھر بار عزیز و اقارب اور مال و متاع کو الوداع کہہ کر یثرب کی راہ لیتے تھوڑے ہی عرصہ میں خاصی آبادی منتقل ہو گئی اور شہر کے مسلمانوں کے گھر خالی خالی نظر آنے لگے۔

آنحضرتؐ سچے اور حقیقی رہنما تھے۔ آپؐ اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کو جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے۔ خود دشمنوں کے نرغے میں رہے اور مسلمانوں کو یثرب پہنچنے کی تلقین فرماتے رہے۔ سب سے آخر میں آپ نے ہجرت فرمانے کا قصد کیا۔

دشمنوں کو بھی مسلمان آبادی کے کم ہو جانے سے اصل بات کا پتہ چل گیا تھا انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ خود آنحضرتؐ بھی ہجرت فرمانے والے ہیں وہ بہت گھبرائے

انھوں نے سوچا کہ اگر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے جان نثاروں سمیت یہاں سے بچ کر نکل گئے تو شکار ہاتھ سے نکل جائے گا اور اسلام طاقت ور اور مضبوط ہو جائے گا وہ آنحضرت کی متوقع کامیابی کے خدشہ سے لرز اٹھے۔

دارالندوہ میں تمام قبیلوں کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جس میں تازہ ترین صورت حال پر غور کیا گیا۔ اور فیصلہ ہوا کہ تمام قبیلوں سے ایک ایک جوان منتخب کیا جائے جو رات کی تاریکی میں پیغمبر اسلامؐ پر حملہ آور ہوں اور بیک وقت اپنی تلواریں اُن کے جسم میں پیوست کر دیں۔ تاکہ آپؐ کا قبیلہ اتنے قبیلوں سے لڑنے اور خون بہا لینے کا مطالبہ کرنے سے عاجز رہے دن ڈھل گیا اور شام نے اپنی سیاہ زلفیں سرزمین مکہ پر بکھیر دیں مکہ کے نوجوانوں کا ایک گروہ اس تاریکی کے انتظار میں مضطرب تھا چمکتی ہوئی فولادی تلواریں نیاموں سے باہر آنے کے لئے بیقرار تھیں۔ جب اندھیرا ذرا گہرا ہوا تو انھوں نے آنحضرتؐ کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور آپ کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے عربوں کا قاعدہ تھا کہ وہ کسی شخص پر خواہ وہ کتنا ہی بڑا دشمن یا مجرم کیوں نہ ہو اس کے مکان میں گھس کر کبھی حملہ نہ کرتے تھے بلکہ باہر نکلنے کا انتظار کرتے ان کے نزدیک ہر گھر حرم کعبہ کی طرح باحرمت تھا مگر دنیا کا سب سے مقدس اور بزرگ انسان ظلم و ستم کا نشانہ تھا چنانچہ عرب نوجوان تلواریں ہاتھوں میں لئے دروازے پر کھڑے رہے

ہجرت کے واقعات: آنحضرت اور آن کے جان نثار ابوبکر صدیقؓ کے درمیان طے پایا تھا کہ فلاں وقت گھر سے نکل کر مدینہ کی طرف جانے کی بجائے الٹے ہاتھ جا کر غار ثور میں چھپیں گے تاکہ دشمنوں کو تلاش میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے آپؐ کے پاس کچھ لوگوں کی امانتیں محفوظ تھیں۔

حضرت علیؓ کے سپرد وہ امانتیں کر دیں اور رخصت ہوتے ہوئے فرمایا۔ کل صبح یہ چیزیں ان کے مالکوں کو لوٹا دینا پھر فرمایا۔ آج رات میرے بستر پہ آرام کرنا اور ایک دو روز

بعد خود بھی گھر کے باقی عزیزوں کو ساتھ لے کر یثرب چلے آنا حضرت علیؓ نے ارشاد کی تعمیل کا وعدہ کیا۔ اور حضور گھر سے نکلنے کو تیار ہو گئے۔

دشمن اپنے خیال میں کیل کانٹے سے لیس کھڑا تھا آدھی رات سے زیادہ بیت چکی تھی۔ خدا کے حکم سے انہیں نیند آ گئی حضورؐ نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مسلح دشمن نیند مست ہو چکے تھے آپؐ ان کے درمیان سے نکلے اور پروگرام کے مطابق اپنی راہ چل دیئے۔ تھوڑی دیر بعد نیند کے ماتوں کی آنکھیں کھلیں دیوار سے جھانک کر دیکھا (اندر حضور کے بستر پر جناب علی مرتضیٰؓ چادر اوڑھے محو خواب تھے) دشمنوں نے سمجھا کہ آنحضرتؐ سو رہے ہیں صبح تک انتظار کرتے رہے اور دن چڑھے جب حقیقت کھلی تو سخت حیران اور نادم ہوئے گھروں کو لوٹے تو ناکامی اور شرمندگی ان کا مذاق اڑا رہی تھی۔

اور نبی اکرم صلعم شہر سے نکل کر رات کے اندھیرے میں ہی غار ثور کے اندر جا چھپے۔ صبح ہوتے ہی آپ کی ہجرت کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی قریش کے سردار پھر اکٹھے ہوئے انھوں نے ہر طرف گھوڑ سوار اور پیادہ جوان تلاش میں بھیجے اور اعلان کر دیا کہ جو شخص پیغمبر اسلام کو قتل کرنے یا واپس لانے میں کامیاب ہو گا۔ اسے ایک سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔

بہت سے من چلے قسمت آزمانے کو نکل کھڑے ہوئے۔ جہاں آپ چھپے تھے اس کے سامنے اور قریب سے کئی بار کھوج لگانے والی ٹولیاں گزریں ایک دفعہ تو چند گھوڑ سوار بالکل غار کے منہ پر پہنچ گئے حضرت ابوبکر گھبرا گئے۔ حضور نے انہیں اس حالت میں دیکھا تو فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (توبہ۔ ۴۰) یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے آنحضرتؐ کے اطمینان قلب اور خدا پر بھروسے کا اندازہ کرو دشمن کی تلواریں سر پر لٹک رہی ہیں اور ایک عالی ہمت اور وفادار دوست کا دل دہل گیا ہے مگر حضورؐ چٹان کی طرح مضبوطی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

دو مقدس افراد کا یہ قافلہ تین دن تک غارِ ثور میں رکا رہا حضرت ابوبکرؓ کا ایک غلام پہاڑوں میں بکریاں چراتے چراتے روزانہ ادھر لے آتا اور چپکے سے دودھ پلا جاتا تھا اور ان کے فرزند عبداللہؓ آتے اور مکہ والوں کے حالات اور مشوروں سے خبردار کرتے۔

یثرب (مدینہ) کو روانگی یہاں سے چوتھے دن ہوئی سفر زیادہ تر رات رات کو ہوتا تھا۔ کئی رات کی مسافرت کے بعد آپ یثرب سے تین میل ادھر ایک آبادی میں پہنچے جس کو عالیہ یا قبار کہتے ہیں یہاں مسلمانوں کے کئی معزز گھرانے رہتے تھے کلثومؓ بن ہدم اس بستی کے سردار تھے انھوں نے آپ کا خیر مقدم کیا اور قبار میں ٹھہرنے کی دعوت دی آپ نے یہ دعوت قبول کی اور دو ہفتے تک یہاں قیام فرمایا۔ اس دوران میں حضرت علیؓ حضور کے اہل و عیال سمیت قبا پہنچ گئے تھے یہاں آپ نے اپنے دستِ مبارک سے ایک چھوٹی سی مسجد کی بنیاد رکھی جس کا نام قبار ہے۔

مدینہ میں حضورؐ کی آمد: یثرب میں آپ کی آمد آمد تھی لوگ حضور کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھے وہ ہر روز بہجوم در بہجوم شہر کے باہر آکر کھڑے ہو جاتے اور شوق کی آنکھوں سے آنحضرت کی راہ دیکھتے چھوٹے بڑے مسلسل کئی روز اسی طرح کرتے رہے۔

چودہ دن کے بعد آپ نے شہر یثرب کا رُخ کیا یہ جمعہ کا دن تھا راہ میں بنی سالم کے محلہ میں دوپہر کی نماز کا وقت آگیا۔ یہ آنحضرتؐ کی امامت میں جمعہ کی پہلی نماز تھی نماز سے پہلے خطبہ پڑھا یہ خطبہ ایسا تھا کہ جس نے سنا اثر میں ڈوب گیا۔

حضورؐ کی آمد کے بعد یثرب کو لوگ "مدینۃ النبیؐ" کہنے لگے اور پھر رفتہ رفتہ یثرب کا نام اختصار کے طور پر مدینہ پڑ گیا۔ نماز کے بعد آنحضرتؐ آگے بڑھے آپ کے ننھالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار لگا کر آپ کو لینے آئے۔ قباؐ سے شہر مدینہ تک ہر قبیلہ کے معزز لوگ دو رویہ کھڑے تھے آپ جس قبیلہ کے آگے سے گزرتے وہ عرض کرتا کہ خدا کے رسول اگھر ہمارا مال اور ہماری جان حاضر ہے آپؐ شکریہ ادا کرتے اور دعا ئے

خیر دیتے۔ شہر قریب آیا تو مسلمانوں کے جوش کا ایک عجیب انداز تھا مدینہ کی بچیاں یہ گیت گا کر نو وارد مہمان کا استقبال کر رہی تھیں ۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا — چودھویں کا چاند ہمارے سامنے نکل آیا ۔
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ — "وداع" کی گھاٹیوں سے
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا — ہم پر خدا کا شکر واجب ہے
مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ — جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں

بنو نجار کی لڑکیاں جن کو حضورؐ کے ننھیالی رشتہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا خوشی میں دف بجا بجا کر یہ شعر گاتی تھیں ۔

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ — ہم نجار کے خاندان کی لڑکیاں ہیں ۔
يَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِنْ جَارٍ — اے ہے محمدؐ ہمارے پاس بسیں گے ۔

جہاں اب مسجد نبویؐ ہے اس کے قریب حضرت ابوایوبؓ انصاری کا گھر تھا جو نجار کے خاندان سے تھے آنحضرتؐ اونٹنی پر سوار تھے ہر شخص چاہتا تھا کہ اس کو آپ کے میزبان بننے کی عزت حاصل ہو اس لئے ہر کوئی اونٹنی کو اپنے گھر کے پاس روکنا چاہتا آپؐ نے فرمایا "اس کو چھوڑ دو جہاں خدا کا حکم ہو گا وہیں جا کر ٹھہرے گی" جب یہ اونٹنی حضرت ایوبؓ کے گھر کے پاس پہنچی تو اونٹنی خود بخود بیٹھ گئی حضرت ایوبؓ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا حضور کو اپنے یہاں مہمان اتارا اور ہر طرح کے آرام و آسائش کا سامان بہم پہنچایا آنحضرتؐ سات مہینے تک ان ہی کے گھر رہے ۔

تاریخ عالم میں بہت سے لوگوں نے مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کی ہے اور ہمدردی ودلی اور حق پرستی کی کئی داستانیں چھوڑی ہیں مگر بھائی چارہ کی وہ تصویر اور ایثار و قربانی کا وہ منظر جو مہاجرین اور انصار کی اخوت کی شکل میں آپؐ کے پاکباز ساتھیوں نے پیش کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مکہ کے مہاجرین گھر بار، زمین جائداد، تجارت و کاروبار

غرض اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دین کی محبت میں سرشار مدینہ پہنچے تھے۔
یہاں مہاجرین کے پاس نہ رہنے کو مکان تھے نہ کام کاج کرنے کو وسائل اہل مدینہ کے مسلمانوں نے ان کو بھائیوں سے بڑھ کر عزیز جانا حضور کے فرمان کے مطابق ہر انصاری نے ایک ایک مہاجر کو اپنا بھائی بنایا اور مواخوات کا حق ادا کر دیا چنانچہ اس بھائی چارہ کو عربی زبان میں "مواخات" کہا جاتا ہے انصار مدینہ نے مکان میں حصہ زمین میں حصہ کاروبار میں حصہ نقدی اور زیورات میں حصہ غرض منقول اور غیر منقولہ جائداد میں جو کچھ تھا اسے اپنے بھائی کو برابر بانٹ دیا اور مہاجرین کو یہ احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ پردیسی ہیں یا اپنا گھر بار چھوڑ کر آئے ہیں۔
چند ہی دنوں میں انصار اور مہاجر باہم شیر و شکر ہو گئے مہاجر مدینہ کی گلی کوچوں اور بازاروں میں انس اعتماد محبت اور وقار کے ساتھ چلتے پھرتے جیسے وہ پشتوں سے اسی دیار میں رہتے آئے ہیں اور جو ان کے قبضہ میں ہے انہیں ورثہ میں ملا ہے انصار کے اس حسن سلوک اور فراخدلی کی قدر مہاجرین نے بھی خوب کی انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ انصاری بھائیوں پر بوجھ نہ بنیں جیسے جیسے اور جوں جوں ان کے کاروبار اور تجارت وغیرہ میں جمتے گئے اور ان کی مالی حالت اچھی ہوتی گئی انہوں نے اپنے انصاری بھائیوں کے ساتھ اسی طرح نیکی اور احسان کا سلوک کیا۔

ہجرت کے نتائج :۔ حضور نبی اکرمؐ کا مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمانا بڑی، حکمتوں اور برکتوں کا باعث بنا اور ترقی اسلام کے لئے آپؐ کا یہ قدم نہایت دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔
مکہ میں مسلمان چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے اور وہاں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی تھیں ان کی زبان پر پہرے بٹھا دیئے گئے تھے اور ان کے احساسات کو کچلا جا رہا تھا۔ ہجرت نے انہیں آزادی اور خود مختاری کی دنیا میں لا پہنچایا جہاں محبت بھری نگاہیں اور خندہ پیشانیاں ان کے چاروں طرف تھیں

دوسرے مکہ کے دشمن ترقی اسلام کی راہ میں دیوار بن کر حائل تھے اور مسلمانوں کی انتہائی کوشش کے باوجود اب مکہ میں اسلام کی اشاعت میں کوئی خاص ترقی نہیں ہو رہی تھی غریب اور امیر شہری اور دیہاتی سب لوگ ابو جہل اور اس کے رفقاء کی مخالفانہ سرگرمیوں سے متاثر ہو کر خوفزدہ ہو گئے تھے لیکن ہجرت کے بعد اسلام کو سمجھنے اور پھیلانے کے لئے میدان صاف تھا اب جس شخص کا جی چاہتا بے کھٹکے حضور کے پاس آتا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا۔

تیسرے ہجرت فرما کر حضور نے وطن، گھر بار، کاروبار، مال و دولت اور خاندانی تعلقات پر اسلام اور اشاعت توحید کی فضیلت کو ثابت کر دی اور آنے والی نسلوں کے لئے راہ سنت بنا دی کہ خدا کی راہ میں اگر گھر بار عزیز و اقارب اور ملک وطن کو چھوڑنا پڑے تو بلا تامل ایسا کرنا لازم ہے ہجرت کا فلسفہ وطن پرستی کی کاٹ کرتا ہے اور نوع انسانی کو وطنیت کے مہلک اثرات سے بچاتا ہے،

علامہ اقبال وطن پرستی کے تباہ کن اثرات سے مسلمانوں کو یوں خبردار کرتے ہیں۔

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشانۂ دینِ نبوی ہے بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے۔

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے۔
اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

اس کی دلیل یہ ہے ۔

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

غیر اقوام تو وطن کے بت کو پوجتی ہیں لیکن مسلمان جو ہر رنگ کی بت پرستی کا خاتمہ کرنے کے لئے اس جہاں میں آیا ہے اور صرف توحید کا علم بردار ہے اسے حضور نے اپنی ہجرت سے یہ تربیت دی ہے کہ اعلیٰ مقصد کی خاطر وطن کو بھی قربان کیا،

جا سکتا ہے۔

ہجرت کا سب سے بڑا فائدہ جو مسلمانوں کو ہوا وہ یہ تھا کہ مدینہ پہنچ کر مسلمان اس قابل ہو گئے کہ اسلام کی بنیادوں پر ایک معاشرہ کی طرح ڈال سکیں اور اسلامی نظام اجتماعیت کا تجربہ دنیا کو دکھا سکیں چنانچہ یہ تجربہ اب کامیاب ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور سارے ملک پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔

ہجرت ایمان و کفر اور صدق و نفاق کے درمیان ایک معیار بن گئی جو لوگ ایمان میں پکے اور اسلام کے مخلص ہوتے وہ سب کچھ چھوڑ کر اسلامی مرکز میں چلے آتے جو لوگ اب جان بوجھ کر ہجرت نہ کرتے ان کے متعلق یقین ہو جاتا کہ ان کا دعویٰ، صرف زبانی ہے نہ انہیں مسلمانوں سے اخلاص ہے نہ اسلام سے صدق و صفا ہے۔

ہجرت کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی پوری قوت ایک جگہ جمع ہو گئی اور اُسے نشو و نما پانے کے تمام ذرائع مل گئے گو مدینہ میں بھی دشمن موجود تھے اور بجائے ایک کے تین ہو گئے تھے یعنی مکہ کے کافر مدینہ کے یہودی اور منافقین لیکن پھر بھی مرکزیت نے اسلام کو بہت فائدہ پہنچایا اور چند ہی سالوں میں مسلمان مکہ فتح کرنے کے قابل ہو گئے دیکھتے دیکھتے عرب کی پوری سرزمین اُن کے زیرنگین آ گئی تھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ دُنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کے وارث بن گئے۔

مدینہ کے حالات :- مدینہ کے قبائل میں دو عرب قبیلے اوس اور خزرج اور تین یہودی قبیلے بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع خاص طور پر اہم اور قابل ذکر تھے یہود کے مقابلہ میں عرب زیادہ طاقتور تھے لیکن آپس کی دیرینہ دشمنی اور لڑائی بھڑائی نے اُنہیں بُری طرح کمزور کر دیا تھا اب اُنہیں اتحاد کی ضرورت محسوس ہو رہی

تھی اور وہ سوچ رہے تھے کہ کسی شخص کو شہر کا بادشاہ بنا کر اس کی ماتحتی میں سب متحد ہو کر رہیں ۔

اوس قبیلہ کا ایک سردار عبداللہ بن اُبی بہت ہشیار اور جوڑ توڑ کرنے والا آدمی تھا ۔ بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا وہ عرب قبیلوں کے علاوہ یہودیوں سے بھی جوڑ توڑ کرنے میں کامیاب ہو گیا قریب تھا کہ اسے مدینہ کا سردار مان لیا جاتا کہ ان میں لوگوں کی توجہ دینِ اسلام کی طرف مبذول ہو گئی اور حضور رسولِ اکرمؐ مدینہ تشریف لے آئے اب ہر شخص کی نظریں آفتابِ رسالتؐ کی طرف اٹھنے لگیں اور عبداللہ بن اُبی کی امیدوں پر پانی پھر گیا اب اس نے ایک نئی چال چلی اور مدینہ میں ایک منافق گروہ منظم کرنے میں لگ گیا ۔

یہ گروہ مدینہ میں اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھا منافقوں کا گروہ کئی وجوہ سے مکہ کے کافروں سے زیادہ خطرناک تھا یہ لوگ مارِ آستین اور چھپے ہوئے دشمن تھے دوستی کے بھیس میں آتے کلمے پڑھتے نمازیں ادا کرتے مگر آزمائش کے وقت اور میدانِ کارزار میں دشمنوں کے ساتھ ہو جاتے مکے کے کافروں اور مدینے کے یہودیوں کو مسلمانوں کی خبریں اور راز پہنچاتے اندر ہی اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف آگ بھڑکاتے رہتے عبداللہ بن اُبی اس گروہ کا سرغنہ تھا ۔

یہودی مدینہ کے دوسرے آباد کار تھے یہ حجاز کے سوداگر اور مہاجن تھے مدینہ سے شام تک ان کی تجارتی کوٹھیاں اور منڈیاں تھیں وہ اپنے روپے کے بل سے مدینہ میں بہت اثر رکھتے تھے ان کے مذہبی اقتدار کی تفصیل "عربوں کے مذاہب" میں بیان ہو چکی ہے آنحضرت جب مدینہ تشریف لائے تو شروع شروع میں انہوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ ایک ایسا مذہب لے کر آئے ہیں جو ہمارے مذہب کے قریب ہے آنحضرت کی مخالفت نہ کی بلکہ یہود نے حضرت رسول اللہ سے ان کی دعوت پر ایک معاہدہ کر لیا ۔

مدینہ میں پہنچ کر آپؐ کی یہ بہت بڑی اور پہلی سیاسی کامیابی تھی اگر یہودی اس معاہدہ کی پابندی کرتے اور اپنے الفاظ پر قائم رہتے تو شہر بدر ہونے کی ذلت نہ اٹھاتے اور صدیوں کی غلامی سے نجات پا لیتے افسوس انہوں نے ایسا نہ کیا وہ اپنی شرمناک فطرت سے باز نہ آئے معاہدہ کے کچھ حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں ۔

اللہ کے نام سے جو نہایت رحم کرنے والا مہربان ہے

صلح و امن تمام مسلمانوں کے لئے مشترک ہوں گے اپنے ہم مذہبوں کے دشمنوں کے ساتھ کسی شخص کو بطور خود صلح یا جنگ کا اختیار نہ ہوگا یہودی ہر قسم کی توہین اور تشدد سے محفوظ رکھے جائیں گے انہیں اپنے مذہب کے احکام کی بجا آوری میں ویسی ہی آزادی ہوگی جیسی کہ مسلمانوں کو ان کے دوستدار اور حلیف بھی اس آزادی اور تحفظ میں شریک ہوں گے مجرم سے بدلہ لیا جائے گا اور سزا دی جائے گی مدینہ کو تمام دشمنوں سے بچانے کے لئے یہودی مسلمانوں کا ساتھ دیں گے کوئی شخص مجرم کی امداد نہیں کرے گا خواہ وہ اس کا قریب ترین رشتہ دار ہو آئندہ تمام جھگڑے جو ان لوگوں کے درمیان پیدا ہوں گے جنہوں نے اس معاہدہ کو قبول کیا ہے فیصلہ کے لئے رسول اللہ کے سامنے پیش کئے جائیں گے ۔

مدینہ میں اسلام دشمنی کا تیسرا محاذ مکہ کے قریش کا تھا جن کو اس فکر میں رات دن نیند نہیں آتی تھی کہ اگر مسلمان مضبوط اور طاقتور ہو گئے تو ان کی عزت خاک میں مل جائے گی عربوں کی مخالفانہ سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں اور انہوں نے عبداللہ بن ابی اور یہودیوں کو کہلا بھیجا کہ مسلمان ہمارے دشمن اور باغی ہیں ان کی ہرگز کوئی مدد نہ کرنا ورنہ ہم مدینہ پر حملہ کر دیں گے ۔

یہ حالات تھے جن میں حضور رسول اکرم نے اپنا کام شروع کیا لیکن آپؐ کا حسن تدبر اور پیغمبرانہ فہم و فراست ان تمام مشکلات پر غالب آئی اور آپؐ کے ایمان و

توکل، صبر و تحمل اور بردباری نے اسلام کے لئے تمام راہیں ہموار کر دیں مختصر یہ کہ رسول پاکؐ نے مدینہ میں یہاں کے مقامی کفار مکہ کے کفار عرب کے یہود اور منافقین مدینہ کا مقابلہ کیا۔

وادیٔ نخلہ کا واقعہ:- رجب ۲ھ میں آپ نے بارہ آدمیوں کو نخلہ کی وادی میں بھیجا اور ان کو ایک بند خط دے کر فرمایا کہ اس کو دو دن کے بعد کھولنا دو دن، کے بعد خط کھولا گیا تو اس میں لکھا تھا نخلہ میں ٹھہر قریش کے ارادوں کا پتہ لگاؤ اور مجھے خبر دو"

اتفاق یہ کہ مکہ کے کچھ لوگ جو شام سے تجارت کا مال لے کر آ رہے تھے سامنے سے گزرے مسلمانوں کے اس دستہ نے رسول اللہؐ کی اجازت اور ایماء کے بغیر ان پر حملہ کر دیا مکہ والوں کا ایک شخص عمرو بن حضرمی مارا گیا دو پکڑ لئے گئے اور قافلہ کا مال لوٹ لیا گیا۔

حضورؐ کو جب اس کی خبر ملی تو آپؐ نے ناراضگی ظاہر کی اور فرمایا کہ میں نے، تمہیں ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا تم نے تو لڑائی کی آگ لگا دی اور اس کے ساتھ ہی عرب کے قاعدہ کے مطابق اس دستہ نے جو مال لوٹا تھا وہ بھی اس کو لوٹا دیا مکہ کا جو آدمی مارا گیا تھا وہ قریش کے ایک بڑے سردار کا ساتھی تھا اور جو دو آدمی پکڑے گئے تھے وہ بھی قریش کے ایک دوسرے سردار کے پوتے تھے اس واقعہ نے مکہ والوں میں بدلہ لینے کا جوش پیدا کر دیا۔

غزوہ بدر:

قریش بہانہ کی تلاش میں تھے مکہ میں جو غریب مسلمان رہ گئے تھے ان کو انہوں نے مکہ میں بند کر رکھا تھا اور باہر سے آنے والے مسلمانوں کا مکہ میں داخلہ روک رکھا تھا جب عمرو بن حضرمی کے قتل کا واقعہ سنا تو پھر کیا تھا ابو جہل

وغیرہ نے اسے آڑ بنا کر مکہ والوں کو خوب بھڑکایا اور لڑائی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

اسی دوران میں اُن کا ایک بھاری قافلہ سامان تجارت لے کر شام سے واپس آرہا تھا مدینہ ان کے راستہ میں پڑتا تھا اور قریش کے تمام قافلے اس راستہ سے گزرتے تھے مکہ میں یہ افواہ اُڑ گئی کہ مسلمان اس قافلہ پر چھاپہ مارنا چاہتے ہیں یہ خبر سنتے ہی ایک ہزار مکی بہادر اپنے پورے سازو سامان کے ساتھ ابوجہل اور عتبہ کی زیر کمان نکل کھڑے ہوئے ابھی مدینہ سے کافی فاصلہ پر تھے کہ انہیں معلوم ہو گیا کہ تجارتی قافلہ صحیح وسالم مکہ پہنچ گیا ہے قریش ترنگ میں تھے انہوں نے واپس جانے کی بجائے فیصلہ کیا کہ بدر کے میدان میں پہنچ کر خوشی منائیں گے اور اگر مسلمان کہیں نظر پڑے تو اُن سے لڑیں گے۔

حضرت رسول اکرمؐ نے جب قریش کے ارادوں کی خبر پائی تو تین سو تیرہ[۳۱۳] جانبازوں کو ساتھ لے کر شہر سے نکلے اور وادی بدر کے دوسرے سرے پر پہنچ کر رک گئے بدر کی وادی مدینہ سے کئی میل کے فاصلے پر تھی ایک طرف ایک ہزار کی مسلح فوج اور دوسری طرف تین سو تیرہ مجاہدین کے پاس پورا اسلحہ بھی نہ تھا۔

اگلے دن صبح دونوں فوجیں میدان میں آمنے سامنے تھیں حضورؐ نے کفار کی کثرت دیکھی تو بارگاہ الٰہی میں فتح و نصرت کے لئے دعا کی اور سجدہ ریز ہو کر فرمایا اے خداوند تعالیٰ! اگر یہ مٹھی بھر مسلمان مٹ گئے تو پھر زمین پر تیرا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے گا اور اس جوش و خروش سے کوئی تجھے قیامت تک یاد نہ کرے گا۔

جنگ کا آغاز:۔ یوں ہوا کہ پہلے ابن حضرمی کا بھائی عامر جس کو اپنے بھائی کے خون کا دعویٰ تھا آگے بڑھا، ایک غلام مسلمان اس کے مقابلہ میں نکلا دیکھتے دیکھتے عامر زمین پر آرہا اس کے بعد عتبہ جو قریش کے لشکر کا سردار تھا بڑی شان سے نکلا اس کے ساتھ ولید اور شیبہ بھی آگے بڑھے ادھر مسلمانوں کی طرف سے تین انصاری

مقابلہ کو نکلے عتبہ نے ان کا نام و نسب پوچھا جب معلوم ہوا کہ یہ مدینہ والے ہیں تو پکارا محمدؐ! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں" حضورؐ کے فرمانے پر پیچھے ہٹ آئے اور اب حضرت حمزہؓ۔ حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت عبیدہؓ میدان میں آئے عتبہ نے حضرت حمزہؓ سے اور ولید نے حضرت علیؓ سے مقابلہ کیا اور میدان میں ہی جہنم داصل ہوئے شیبہ نے حضرت عبیدہؓ کو زخمی کر دیا یہ دیکھ حضرت علیؓ آگے بڑھے اور شیبہ کا کام تمام کر دیا حضرت زبیرؓ نے سعید بن العاص کا مقابلہ کیا اور برچھی ایسی تان کر ماری کہ وہ دھم سے زمین پر آرہا۔

اب عام حملہ شروع ہو گیا دونوں طرف سے بردانہ ماجی توڑ کر جنگ میں معروف ہو گئے مدینہ میں ابوجہل کی شرارت اور اسلام دشمنی کا چرچا عام تھا انصار کے دو ننھے مجاہد اس کی تاک میں نکلے اور لوگوں سے پتہ پوچھ کر باز کی طرح اس پر ایسے جھپٹے کہ وہ ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ جسم دو ٹکڑے ہو کر زمین پر آگرا۔

عتبہ پہلے ہی مارا جا چکا تھا اب ابوجہل کا مارا جانا تھا کہ قریش کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ ہار کر بھاگنے لگے اور مسلمانوں نے ان کو پکڑنا شروع کیا قریش کے ستر آدمی جو کہ بڑے بڑے رئیس تھے مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہو گئے مسلمانوں میں سے صرف چودہ بہادروں نے شہادت پائی۔

جنگ بدر نے ثابت کر دیا کہ زندگی کی جدوجہد میں تعداد اور سازوسامان کی بہتات فیصلہ کن عنصر نہیں اصل چیز محکم یقین اور اعتماد ہے جسے شریعت کی زبان میں ایمان کہتے ہیں۔

بدر کی جیت نے عرب کی سیاست کا پانسہ پلٹ دیا ایک مسلمان سے صرف ایک مذہب اور محض روحانی اور اخلاقی اصولوں کے داعی نہ تھے بلکہ ایک اٹھتی ہوئی سیاسی قوت بھی تھے جن کا مقصد ظالمانہ حکومتوں کو ہٹا کر دنیا میں عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کی ریاست اور الٰہی حکومت قائم کرنا تھا۔

غزوہ احد: بدر میں کفار کی شکست سے قریش کے جوش انتقام کی آگ اور بھڑکی قریش ہزیمت اُٹھا کر جب مکہ واپس پہنچے تو ان کی عورتوں نے انہیں سخت ملامت کی اور طعنے دیئے کئی ہفتوں تک مرنے والوں کا ماتم ہوتا رہا مکہ کے شاعروں نے غیرت دلانے والے شعر لکھے۔ ابوسفیان نے اس موقعہ سے پورا فائدہ اُٹھایا اور لوگوں کو ایک اور جنگ کے لئے آمادہ کیا۔

حضرت عباسؓ مسلمان ہو چکے تھے مگر ابھی تک مکہ میں ہی تھے انہوں نے قریش کے خطرناک ارادوں کی اطلاع آنحضرتؐ کو بروقت پہنچا دی اور مدینہ میں بھی مقابلہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

آنحضرت نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کچھ حضرات نے یہ رائے دی کہ شہر کے اندر رہ کر دشمنوں کی مدافعت کی جائے منافقوں کے سردار عبداللہ بن اُبی کی بھی یہی رائے تھی مگر جوشیلے باہمت نوجوان مصر تھے کہ دشمن کا مقابلہ شہر کے باہر نکلے میدان میں کیا جائے۔ حضور رسول اکرمؐ نے نوجوانوں کے جذبۂ ایمان کی قدر کی اور شہر سے باہر نکل کر دشمن کی مدافعت کرنے کا فیصلہ کیا قریش نے مدینہ کے پاس پہنچ کر اُحد پہاڑ کے پاس پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ آنحضرت جمعہ کی نماز پڑھ کر مسلمانوں کو ساتھ لیکر باہر نکلے ان میں عبداللہ بن اُبی کے بھی تین سو آدمی تھے لیکن وہ یہ کہہ کر اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر واپس لوٹ گیا کہ رسول اللہ نے میری بات نہیں مانی اس لئے ہم ساتھ نہیں دیں گے اب صرف سات سو آدمی رہ گئے جن میں سے صرف سو آدمیوں کے پاس زرہیں تھیں۔

مسلمانوں نے اُحد پہاڑ کو پیٹھ کے پیچھے رکھ کر اپنی صفیں درست کیں پہاڑ میں ایک درہ تھا جدھر سے ڈر تھا کہ دشمن پیچھے سے آکر حملہ نہ کردے اس لئے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ اس کی حفاظت کے لئے مقرر کیا اور آپ نے انہیں حکم دیا کہ لڑائی کا نقشہ خواہ کچھ ہو جائے تم اپنی جگہ سے ہرگز نہ ہٹنا۔

قریش کی عورتیں دف پر فخریہ اشعار اور بدر کے مقتولین کا درد بھرا مرثیہ پڑھتی ہوئی آگے بڑھیں پھر قریش کے لشکر کے علمبردار طلحہ نے صف سے نکل کر نعرۂ جنگ بلند کیا۔ حضرت علیؓ اس کے مقابلہ کو نکلے بڑھ کر ایسی تلوار ماری کہ آن واحد میں وہ کٹ کر زمین پر آرہا اس کے بعد اس کا بیٹا بڑھا تو حضرت حمزہؓ کی تلوار نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

عام جنگ شروع ہوئی حضرت حمزہؓ۔ حضرت علیؓ اور ابودجانہؓ انصاری ا دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور ان میں کھلبلی مچ گئی۔

چند گھنٹوں کی لڑائی سے دشمنوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے اب یہ بڑی آزمائش کی گھڑی تھی۔

بعض مسلمان دشمن کے بجائے ان کے مال واسباب کی طرف بڑھے درہ پر متعین تیراندازوں نے جب یہ عالم دیکھا اور معلوم کر لیا کہ دشمن میدان چھوڑ رہا ہے تو رسول اللہ کا حکم نظر انداز کر کے نیچے اتر آئے ان کے سردار نے بہترا، سمجھایا کہ درہ چھوڑنے کا یہ مناسب وقت نہیں مگر وہ عام رو میں بہہ گئے قریش کے سالاروں میں ایک ذہین سالار وہ تھا جس نے بعد میں اسلام کے لیے شام، عراق کے ملک فتح کئے یعنی خالدؓ بن ولید۔ جب تیراندازوں نے درہ کو چھوڑا تو وہ پھر پیچھے کو پلٹا اور اپنے دستے کو لے کر درہ کے پیچھے سے مسلمانوں پر باز کی طرح آپڑا اکثر مسلمان جو لوٹ مار میں مصروف تھے خالدؓ کے حملہ سے بوکھلا گئے قریش کی بھاگتی ہوئی فوج نے جب خالدؓ کے کامیاب حملہ کی کیفیت دیکھی تو سنبھلے اور مسلمانوں پر دوسری جانب سے حملہ کر دیا۔

اس کشت وخون میں حضرت مصعبؓ بن عمیر شہید ہو گئے ان کی شکل و شباہت رسول اللہ سے کچھ ملتی تھی وہ شہید ہوئے تو کفار نے یہ آوازیں بلند کیں کہ محمد رسول اللہ مارے گئے ہیں ان آوازوں سے مسلمانوں کی صفیں بے ترتیب ہو گئیں۔ مگر حضرت علیؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص حضرت زبیرؓ

حضرت طلحہؓ جیسے بہادر اور اور حضورؐ کے جان نثاروں نے آپؐ کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور قریش کے حملوں کا جواب دیتے رہے۔

اتنے میں بعض مسلمانوں نے حضورؐ کو دیکھ لیا انہوں نے دوسرے مسلمانوں کو آوازیں دیں کہ رسول اللہ زندہ ہیں مسلمانوں جم کر مقابلہ کرو اور ساتھ ہی اللہ اکبر کے نعرے بلند کئے ان آوازوں سے مسلمان پلٹے کئی گھنٹے تک زور کا مقابلہ ہوا آخرا کار کفار کا زور ٹوٹا دشمنوں کو پسپائی کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا تو میدان چھوڑ کر پیچھے ہٹے اور مکہ کی راہ لی۔ مسلمانوں نے کچھ دور ان کا تعاقب کیا مگر مڈبھیڑ نہ ہوئی

اُحد کی لڑائی میں مسلمانوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا کھلی فتح شکست سے بدل گئی۔ ستر کے قریب صحابیؓ شہید ہو گئے جن میں حضرت حمزہؓ جیسی مقتدر ہستیاں تھیں خود رسول اکرمؐ کے ۲ دو دانت شہید ہو گئے اور آپ کے چہرہ مبارک پر زخم آئے

جس فوج کو ایک سال پیشتر تین سو تیرہ مجاہدوں نے شکستِ فاش دی تھی اور اب ایک برس بعد سات سو کے قریب مسلمانوں نے بھی پہلے حملہ میں انہیں شکست دی مگر رسول اللہ کے حکم کی خلاف ورزی سے ایسی زک کھائی کہ ساری عمر نہ بھولی۔

یہود کا اخراج ہجرت کے وقت مدینہ میں یہود کے تین قبائل آباد تھے۔ بنو نضیر۔ بنو قریظہ اور بنو قینقاع۔ جواب شروع میں یہودیوں نے مسلمانوں سے دوستی پیدا کر لی اور آنحضرتؐ سے صلح کا معاہدہ کر لیا۔ مگر انہیں جلد محسوس ہونے لگا کہ اسلام کے ترقی پا جانے کی صورت میں ان کا سماجی اقتدار ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ اب وہ قریش مکہ اور منافقین مدینہ سے ساز باز کرنے لگے۔

غزوۂ احد کے موقع پر معاہدہ کی رُو سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا۔ کہ وہ مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو کر شہر کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھیں۔ مگر عین

وقت پر انہوں نے مسلمانوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور معاہدہ کی شرائط کی خلاف ورزی کر کے غداری کے مرتکب ہوئے۔

دوسری حرکت بنو قینقاع کی طرف سے ایسی ہوئی کہ مسلمان اُن سے نپٹنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے محلہ سے ایک مسلمان بی بی گزر رہی تھی۔ کہ اس کو انہوں نے چھیڑ کر بے حرمت کیا۔ ایک مسلمان یہ منظر دیکھ رہا تھا اس سے رہا نہ گیا۔ وہ یہودیوں سے اُلجھ گیا۔ بنی قینقاع نے اس مسلمان کو وہیں شہید کر دیا۔ جب مسلمانوں کو خبر ہوئی تو اُن میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ خون بہا کا معاملہ صلح صفائی سے طے ہو جائے مگر بنی قینقاع خون بہا دینے پر آمادہ نہ ہوئے اور جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ لڑائی کا اعلان ہوا تو وہ اپنے قلعہ میں بند ہو کر مقابلہ کرنے لگے۔ مسلمانوں نے پندرہ روز تک ان کا محاصرہ کیا اُن کے کئی آدمی مارے گئے۔ جب کھانے پینے کا سامان ختم ہونے لگا تو صلح کی درخواست کی اور یہ کہلا بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے متعلق جو فیصلہ کریں ہمیں منظور ہو گا۔

عبداللہ بن اُبی ان کا حلیف تھا۔ اس نے رسول اللہ صلعم سے کہا کہ ان کے لیے یہی سزا کافی ہے۔ کہ ان کو یہاں سے نکل جانے کا حکم دے دیا جائے آپؐ نے یہ بات مان لی۔ چنانچہ بنی قینقاع اپنی زمین و جائداد چھوڑ کر ملک شام کو چلے گئے یہ واقعہ شوال سنہ ۲ ہجری کا ہے۔

دوسرا یہودی قبیلہ بنو نضیر بھی اسی قسم کی حرکات کرتا رہا۔ انہوں نے بھی مسلمانوں سے عہد شکنی کی۔ بنو نضیر کے سرداروں نے قریش سے سازش کر کے انہیں مدینہ پر حملے کرنے کے گر بتائے اور غزوہ اُحد میں ان کی درپردہ امداد کی۔

ربیع الاول سنہ ۴ ہجری کا واقعہ ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ کسی کام سے ان کے محلہ میں گئے۔ ایک دیوار کے سائے میں کھڑے تھے کہ ایک یہودی نے چھت

پر سے ایک بھاری پتھر آپ پر گرانا چاہا۔ آپ کو بروقت معلوم ہو گیا۔ اور وہاں سے ہٹ آئے۔ اب بنو نضیر سے نپٹنا بھی ضروری تھا۔ وہ بھی بنو قینقاع کی طرح قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ دن کے شدید محاصرہ کے بعد انہوں نے صلح کی درخواست کی اور جلاوطن کی سزا قرار پائی لیکن ان کے ساتھ یہ رعایت برتی گئی کہ وہ اپنا سامان جس قدر لے جا سکتے ہیں لے جائیں یہ لوگ دف بجاتے اور گاتے ہوئے مدینہ سے یوں نکلے۔ جیسے کسی فتح پر خوشیاں منا رہے ہیں۔

تیسرے قبیلہ بنو قریظہ نے غزوۂ احزاب کے موقعہ پر یہودیوں نے مکہ والوں کا خفیہ طور پر ساتھ دیا۔ اور مدینے میں ابھی تک ان کا قبیلہ بنو قریظہ آباد تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے اور پانچ سال کی مسلسل دوستی کی بنا پر شرافت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ شہر کے مسلمانوں کا ساتھ دیتے اور بظاہر انہوں نے ایسا ہی کیا لیکن خفیہ خفیہ بنو قریظہ کے آدمی حملہ آوروں سے سازباز کرتے رہے انہوں نے خندق کے کمزور مقامات سے۔ حملہ آوروں سے سازباز کرتے رہے۔ چنانچہ جب کفار کا حملہ پسپا ہوا اور ان لوگوں سے ان دونوں جرائم کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو دوسرے کی طرح یہ بھی مقابلے کو تیار ہو گئے اور قلعہ بند ہو گئے تقریباً بیس دن تک محاصرے کے بعد انہوں نے خود یہ پیش کش کی کہ ہمارا فیصلہ حضرت سعد بن معاذ سے کرایا جائے۔ وہ اُن کے حلیف تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا۔ کہ تمام یہودی نوجوانوں کو قتل کر دیا جائے اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا جائے۔ اس طرح اس موقعہ پر تین سو سے زائد یہودی قتل ہو گئے۔ یہ ۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس طرح یہود کے تینوں قبائل کا مدینہ سے اخراج ہوا۔

غزوہ احزاب (خندق) یہودی مدینہ سے نکل کر چین سے بیٹھنے والے کب تھے۔ خیبر پہنچ کر انہوں نے دُور دُور

ونزدیک کے قبائل سے جوڑ توڑ شروع کیا اور ان کو مختلف لالچ دے کر اسلام کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اس کے بعد قریش اور اُن کے حلیف قبیلوں سے کہلا بھیجا ہم محمدؐ کے خلاف آخری اور قطعی جنگ لڑنے جا رہے ہیں۔ اگر تم بھی شریک ہو جاؤ تو کامیابی یقینی ہے۔

۵ھ ہجری کے ماہ ذی قعدہ میں ان تمام گروہوں کی متحدہ فوج جو تقریباً "چوبیس" ہزار پر مشتمل تھی۔ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسی لئے اسے غزوہ احزاب کہتے ہیں کفر کے متحدہ لشکروں کی تیاریوں سے مسلمان بھی بے خبر نہ تھے۔ جب دشمن فوجوں کے جمع ہونے کی خبر ملی۔ تو آنحضرتؐ نے صحابہؓ سے مشورہ لیا۔ حضرت سلمانؓ فارسی نے جو ایران کے رہنے والے تھے اور ایران کے جدید جنگی اصولوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ یہ رائے دی کہ تین اطراف سے مدینہ گھروں اور نخلستانوں سے گھرا ہوا ہے اور ان اطراف سے حملے کا خطرہ نہیں۔ البتہ جس طرف سے کھلا ہے۔ اُدھر ایک گہری خندق کھودی جائے اور خندق سے اِس طرف رہ کر مقابلہ ہو۔ سب نے اس مشورہ کو پسند کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودنے کا کام شروع کر دیا۔ تین ہزار مقدس نفوس نے اس کام کو بیس دن میں پورا کیا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک معمولی مزدور کی طرح کام کرتے رہے۔ صحابہ کرامؓ مٹی کھودتے اور پیٹھوں پر اس کو لاد لاد کر پھینکتے اور مل کر یہ شعر پڑھتے تھے

"ہم ہیں جنہوں نے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت کی ہے
جب تک جان میں جان ہے ہم خدا کی راہ میں لڑتے جائیں گے۔"

اب دشمن قریب آ چکا تھا۔ مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو قریظہ سے مسلمانوں کا دوستانہ معاہدہ ضرور تھا۔ مگر ان کی روش صاف نہ تھی۔ اس لئے بروقت ضرورت ان سے نپٹنے کے لئے دو سو مسلمانوں کا ایک دستہ علیحدہ کر کے آنحضرتؐ نے باقی فوج کو جگہ جگہ

متعین کر دیا۔ اور حملہ کا انتظار کرنے لگے۔

کفار کا محاصرہ بیس دن تک قائم رہا۔ انہوں نے ہر طرف سے مدینہ کی ناکہ بندی کر لی تھی۔ مگر پھر بھی وہ شہر پر حملہ کرنے کے قابل نہ ہوئے۔ ایک جگہ خندق کی چوڑان کم تھی۔ ایک دن انہوں نے بڑی تیاری کر کے اسی طرح سے حملہ کرنا چاہا۔ عمر و بن وُدّ جو قریش کا سب سے بڑا بہادر تھا۔ گھوڑا کود اکر اس پار آ گیا۔ حضرت علیؓ آگے بڑھے اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ حملہ کا یہ دن بڑا سخت گزرا۔ دشمن ہر طرف سے تیر اور پتھر برسا رہے تھے۔ مسلمان عورتیں جس قلعہ میں محفوظ تھیں وہ یہودی قبیلہ بنی قریظہ کے محلہ کے قریب تھا۔ بنی قریظہ نے یہ دیکھ کر کہ مسلمان تو اس طرف پھنسے ہوئے ہیں۔ قلعہ پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک یہودی حالات کا جائزہ لینے کے لئے قلعہ کے دروازے پر پہنچا۔ آنحضرتؐ کی پھوپھی یعنی حضرت زبیرؓ کی والدہ حضرت صفیہؓ نے یہودی کو جو دروازے کے قریب دیکھا تو معاملہ کو بھانپ گئیں۔ لکڑی کی ایک بھاری لٹھ اٹھائی اس نے سر پر ایسی ماری کہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کا سر کاٹ کر دروازے کے سامنے پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر بنی قریظہ سمجھے کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج ہے۔ اس لئے ادھر ہمت نہ کی۔

محاصرہ نے طول پکڑا تو دشمن کے قبیلوں میں پھوٹ پڑنے لگی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہی دنوں میں ایک رات کو ایسی آندھی چلی کہ دشمنوں کے خیموں کی رسیاں اکھڑ گئیں۔ کھانے کی ہانڈیاں چولھوں پر الٹ گئیں۔ ان واقعات سے دشمن سخت بددل ہو گیا۔ پہلے قبیلہ غطفان نے گھر کی راہ لی۔ بنی قریظہ کے کچھ سپاہی دشمن کی فوج میں چلے گئے تھے وہ بھی اپنے قلعہ میں واپس ہو گئے۔ یہ دیکھ کر قریش نے بھی محاصرہ چھوڑ دیا اور اس طرح بیس بائیس دن کے بعد مدینہ کا آس پاس اسلام دشمن افواج کے وجود سے پاک ہو گیا خیبر کے یہود اور مکہ کے قریش کی اس ناکامی کا اثر ملک پر بہت گہرا پڑا اور مسلمانوں کی جنگی مہارت اور قابلیت کا سکہ دلوں پر بیٹھنے لگا۔

اس لڑائی کو غزوہ خندق یا احزاب کہتے ہیں۔ خندق اس لئے کہ مدینہ کی حفاظت کے سلسلہ میں خندق کھودی گئی تھی۔ اور احزاب اس لئے کہ بہت سی فوجیں متحد ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئی تھیں۔

صلح حدیبیہ، فتح مکہ، حجۃ الوداع

صلح حدیبیہ: مکہ کے مہاجر جب سے مدینہ آئے تھے۔ حج اور طواف کعبہ سے شرف یاب نہ ہوئے تھے۔ اب بہت سے لوگوں کو اور خود آنحضرتؐ کو یہ خواہش مجبور کر رہی تھی کہ مکہ جائیں اور کعبہ کی زیارت کریں۔

آپ ذی قعدہ ۶ھ میں چودہ سو مسلمانوں کو ساتھ لے کر مکہ روانہ ہوئے۔ لڑائی کی نیت بالکل نہ تھی۔ آپؐ نے ساتھ جانے والوں سے فرمایا تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہ لو۔ تلواروں کو بھی نیام میں رکھو۔ ہاں قربانی کے لئے اونٹ ساتھ لے جا سکتے ہو۔

جب مکہ والوں کو خبر ہوئی۔ کہ آنحضرتؐ چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ مکہ آ رہے ہیں۔ تو انہیں حملہ کا شبہ ہوا اور مقابلہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ مکہ کے قریب ایک مقام حدیبیہ پر پہنچ کر آنحضرتؐ نے پڑاؤ ڈالا اور ایک سفیر قریش کی طرف بھیجا۔ جس نے آنحضرتؐ کی طرف سے ان پر سفر کا مقصد واضح کیا۔ اور کہا کہ ہم صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں۔ لڑنے کا ہرگز کوئی خیال نہیں۔

سفیروں کی آمد و رفت جاری رہی۔ عروہ بن مسعود ثقفی قریش کی طرف سے پیغام لے کر آیا۔ مگر بات چیت نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ بالآخر حضرت عثمانؓ کو بھیجا گیا۔ وہ اپنے ایک عزیز کی مدد سے قریش کے سرداروں کو ملے۔ اس دوران میں یہ خبر پھیل گئی کہ ان کو قریش نے قتل کر دیا ہے۔ اس خبر نے مسلمانوں میں جوش اور ہیجان پیدا کر دیا۔ آپ نے فرمایا عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے۔ چنانچہ آپؐ ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور صحابہؓ سے جان نثاری کی بیعت لی

اس کا نام "بیعت رضوان" ہے۔ یعنی خدا کی خوشنودی کی بیعت "کیونکہ اس کے بارے میں خدا نے قرآن میں اپنی خوشنودی ظاہر فرمائی اور جن صحابہؓ نے یہ بیعت کی تھی۔ ان کا بہت بڑا مرتبہ بتایا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر غلط تھی۔ لیکن مسلمانوں کے اس جوش و خروش اور صداقت کا یہ اثر ہوا کہ قریش بہت ڈھیلے پڑ گئے انہوں نے اپنا ایک سفیر آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیجا اور صلح کی بات چیت نئے سرے سے شروع ہوئی۔ آنحضرتؐ اسلام کے پھیلانے کے لئے صلح اور امن چاہتے تھے اس لئے آپؐ نے قریش کی بعض ایسی شرائط بھی مان لیں۔ جو بظاہر مسلمانوں کے لئے نقصان دہ معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ بہت سود مند تھیں۔

صلح حدیبیہ کی شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ مسلمان اس سال واپس جائیں اور اگلے سال تین دن کے لئے بغرض حج آئیں۔

۲۔ تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہ ہو اور وہ بھی نیام میں ہو۔

۳۔ مکہ میں جو مسلمان رہ گئے ہیں۔ جاتے وقت ان کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔

۴۔ قریش میں سے اگر کوئی مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کر دیا جائے اور اگر کوئی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکہ چلا آئے تو وہ واپس نہ کیا جائے گا۔

۵۔ عرب کے قبیلوں میں جو جس فریق کے ساتھ چاہے معاہدہ میں شریک ہو جائے گا

۶۔ صلح دس سال کے لئے کی جاتی ہے۔

تھوڑے ہی عرصہ میں اس معاہدہ کے فائدے نظر آنے لگے۔ مغرب کے بہت سے مورخین نے صلح نامہ حدیبیہ کو آنحضرتؐ کے سیاسی تدبر کا شاہکار کہا ہے قریش اسلام کی راہ میں سدِ سکندری بن کر حائل تھے اور قبائل کو ہر طرح سے متاثر کر رہے تھے۔ اس معاہدہ کے بعد یہ دیوار راستہ سے ہٹ گئی۔

پانچویں شرط کی رو سے ہر قبیلہ کو اب آزادی تھی۔ کہ وہ چاہے تو مسلمانوں سے کوئی معاہدہ کرے اور چاہے تو قریش سے۔ چنانچہ کئی قبائل نے اسلام کی طرف

قدم بڑھایا۔

مسلمانوں کی بیشتر توجہ قریش کی مخالفانہ جنگی سرگرمیوں کا مقابلہ کرنے پر صرف ہوتی تھی۔ اس صلح نے یہ موقع دیا۔ کہ آنحضرتؐ اور دیگر مسلمان تبلیغ اسلام کا کام زیادہ دلجمی اور اطمینان کے ساتھ کر سکیں۔

بعض جوشیلے مسلمانوں کے نزدیک اس معاہدہ کا سب سے کمزور پہلو یہ تھا کہ مکہ کے کسی مسلمان کو مدینہ جانے کی اجازت نہ تھی، یہ کمزور پہلو بے شمار فوائد کا باعث ہوا اور ان مسلمانوں کے طفیل جو اس طرح مکہ میں رہنے کے لئے مجبور رہتے تھے۔ مکہ بہت سے گھرانوں میں اسلام کی روشنی پہنچ گئی۔

بادشاہوں کو دعوت اسلام :

صلح نامہ حدیبیہ کے بعد حضورؐ کو یہ موقع ملا کہ آپؐ عرب سرداروں کے علاوہ عیسائی ملکوں کے بادشاہوں کے نام اسلام کی دعوت بھیجیں۔ آپؐ نے موزوں اشخاص کو منتخب کیا اور ان کو قاصد بنا کر ۷ھ ہجری میں حبشہ، ایران، مصر اور روم کے بادشاہوں کی طرف بھیجا۔ یہ اس زمانہ کی بڑی حکومتیں تھیں۔

حبشہ کے بادشاہ نے اسلام قبول کیا، ایران کے شہنشاہ نے اس خط کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا "اللہ تعالیٰ یوں ہی اس کی بادشاہت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا۔" یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

مصر کے بادشاہ نے اسلام قبول نہ کیا۔ مگر حضورؐ کے خط کا جواب شائستگی سے دیا اور قاصد سے عزت کے ساتھ پیش آیا۔

روم کا شہنشاہ اس وقت پوری عیسائی دنیا کا حاکم تھا۔ جب اسے آپؐ کا خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ حجاز کے سوداگر اگر یہاں ہوں تو انہیں دربار میں حاضر کیا جائے۔ خدا کی قدرت کہ روم کے پایۂ تخت میں ابوسفیان جیسا اسلام کا دشمن موجود تھا۔ ساتھیوں سمیت دربار میں لایا گیا۔

قیصر۔ یہ جو پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان۔ شریف

قیصر۔ اس کے خاندان میں سے کسی اور نے کبھی پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ بھی ہوا تھا؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ جنہوں نے اس کے مذہب کو قبول کیا ہے۔ وہ کمزور لوگ ہیں یا بڑے بڑے رئیس ہیں؟

ابوسفیان۔ کمزور

قیصر۔ اس کے ماننے والے بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جا رہے ہیں۔؟

ابوسفیان۔ بڑھتے جا رہے ہیں۔

قیصر۔ کبھی تم لوگوں کو اس کے جھوٹ بولنے کا بھی تجربہ ہوا ہے؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ کیا وہ کبھی قول قرار کر کے پھر بھی گیا

ابوسفیان۔ اب تک تو ایسا نہیں کیا۔ اب جو اس سے معاہدہ ہوا ہے۔ دیکھیں وہ اس کو پورا کرتا ہے۔ یا نہیں۔

قیصر۔ کیا تم کبھی اس سے لڑے بھی ہو؟

ابوسفیان۔ ہاں

قیصر۔ لڑائی کا نتیجہ کیا رہا؟

ابوسفیان۔ کبھی ہم جیتے کبھی وہ۔

قیصر۔ وہ کیا کہتا ہے؟

ابوسفیان۔ وہ کہتا ہے۔ کہ ایک خدا کو مانو، اسی کی عبادت کرو، اسی سے

دُعائیں مانگو۔ نماز پڑھو، سچ بولو۔ رشتہ کا حق ادا کرو۔ قیصر ابو سفیان کے یہ جواب سن کر پکار اُٹھا کہ اگر تم نے سچ سچ کہا ہے۔ تو ایک دن ایسا آئے گا۔ کہ وہ میرے پاؤں کے نیچے کی اس مٹی پر بھی قبضہ کرے گا۔ اگر ہو سکتا تو میں جاتا اور اس کے پاؤں دھوتا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلعم نے دنیا کے متعدد مختلف حکمرانوں کو اسلام کی طرف دعوت کے خطوط لکھے۔

ان میں سے نجاشی شاہ حبشہ، منذر بن ساوی شاہ بحرین جیفر وعبد شاہ عمان، منذر بن حارث حاکم دمشق، ہودہ بن علی حاکم یمامہ نے جواباً اسلام قبول کر لیا۔

ہرقل شاہ یونان (قسطنطنیہ) نے آپؐ کی نبوت کا اعتراف کیا۔ مقوقس شاہ اسکندریہ (مصر) نے حضور پاکؐ کی خدمت میں تحائف بھیجے ان کے علاوہ ثمامہ حکمران نجد، جبلہ بن ایہم والی غسان، فردہ خشانی والی شام اور اکیدر حکمران رومتہ الجندل نے از خود داعیان اسلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ خسرو پرویز شہنشاہ ایران نے آنحضرتؐ کے نامہ مبارک کو چاک چاک کر دیا۔ حضور پاکؐ نے فرمایا اسی طرح اس کی سلطنت پارہ پارہ ہو جائے گا۔ چنانچہ چند سال بعد آپؐ کی یہ پیشن گوئی پوری ہوئی اور ایران کا یہی حال ہوا۔ حضور اکرمؐ نے خسرو پرویز کے نام جو خط لکھا اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"اللہ کے نام سے جو رحم کرنے والا مہربان ہے۔
محمد رسول کی طرف سے۔ کسریٰ شاہ ایران کی طرف۔ سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی اور اللہ کے رسول پر ایمان لایا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا

کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ واحدہٗ لاشریک ہے۔ اور محمدؐ اس کے بندے اور رسُول ہیں۔ میں آپ کو اللہ کی دعوت دیتا ہوں۔ میں اللہ کی طرف سے تمام لوگوں کے لئے رسُول ہوں، تاکہ ہر اُس شخص کو جو زندہ ہے۔ ڈراؤں اور اُس کے انکار کرنے والوں پر قول ثابت ہو جائے۔ اسلام قبول کرو۔ بچ جاؤ گے۔ اگر اگر تم نے انکار کر دیا تو آتش پرستوں کا گناہ بھی تم پر ہوگا"۔

یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ آنحضرتؐ کے بھیجے ہوئے کئی اصل خط بھی دنیا میں محفوظ ہیں۔ اور اس بات کی گواہی ہیں۔ کہ حدیث کی کتابوں میں جو خطوط کا مضمون بیان کیا گیا تھا وہ حرف بہ حرف درست تھا۔

فتح مکہ: صلح نامہ حدیبیہ کی پانچویں شرط یہ تھی کہ عرب قبائل میں سے جو قبیلہ چاہے مسلمانوں سے دوستانہ معاہدہ کرے اور جو چاہے قریش سے اس اصول اور آزادی کو تسلیم کر دیا گیا تھا۔

بنو خزاعہ اور بنو بکر دو قبیلے مکہ کے قریب آباد تھے۔ بنو خزاعہ نے مسلمانوں سے معاہدہ کر رکھا تھا۔ جس کی رو سے جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کی امداد کا عہد بھی شامل تھا۔ کسی وجہ سے بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے ان کی مدد کی۔ حالانکہ معاہدہ کی رو سے انہیں غیر جانب دار رہنا ضروری تھا۔ بنو خزاعہ کے بعض لوگ بھاگ کر کعبہ میں داخل ہو گئے۔ کہ وہ امن اور پناہ کی جگہ تھی بنو بکر اور قریش نے وہاں بھی اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔

بنو خزاعہ کے کچھ لوگ مدینہ پہنچے اور آنحضرت سے امداد چاہی۔ اس صریح ظلم کی داستان سُن کر آپ کو بہت رنج ہوا۔ حلیف ہونے کی حیثیت سے بنو خزاعہ

کی مدد کرنا ہر مسلمان کا فرض تھا۔ چنانچہ حضورؐ نے مندرجہ ذیل تین شرائط کے ساتھ ایک قاصد کو مکہ روانہ کیا اور کہا کہ ان شرائط سے جو ان کو پسند ہو۔ اختیار کر لیں۔

۱۔ بنو خزاعہ کے مقتولوں کا خون بہا روپے کی صورت میں ادا کر دیں۔ یا

۲۔ بنو بکر کی حمایت سے دست کش ہو جائیں۔ یا

۳۔ اعلان ہو جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔

قریش کے سرداروں نے پہلی دونوں تجویزوں کو نہ مانا۔ بلکہ تیسری بات کو منظور کیا اور معاہدہ کے منسوخ ہونے کا اعلان کر دیا۔

بعد میں ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ابوسفیان مدینہ آیا۔ تاکہ معاہدہ کو پھر تازہ کیا جائے۔ مگر اب وقت بیت چکا تھا۔ بنو خزاعہ کی امداد کا فیصلہ ہو چکا تھا معاہدہ کی تجدید نہ ہوئی۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو جہاد کی تیاری کا اور مکہ کی طرف روانگی کا حکم دے دیا۔ اور احتیاط کی کہ قریش کو پتہ نہ لگے۔

۱۰ رمضان ۸ ہجری کو دس ہزار کی فوج اسلام کے پھریرے اڑاتی ہوئی مکہ کی طرف بڑھی۔ مکہ کے سرداروں نے جب خدا کے ماننے والوں کی اس پرشکوہ جمعیت کو دیکھا، تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ مسلمان مجاہد کفارِ مکہ سے بازو آزمانے کے لئے بے تاب تھے۔ مگر ان میں اب مقابلہ کی ہمت کہاں تھی؟ ابوسفیان حضورؐ کے خیمہ میں حاضر ہو کر دست بستہ کھڑا ہو گیا اور امان کی درخواست کی۔ آپؐ میں معاف کرنے اور رحم کھانے کا جذبہ بے مثال تھا۔ آپؐ نے صرف ابوسفیان ہی کو معاف نہیں کیا۔ بلکہ اعلان کیا جو کوئی اس کے گھر میں پناہ لے اس سے بھی کوئی باز پرس نہ ہوگی۔

مکہ میں داخلہ کے لئے راہ میں کوئی چیز مزاحم نہ تھی۔ مسلمانوں نے مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوئے۔ اور جس نے امان مانگی اسے دی گئی۔ مکہ کے بڑے بڑے سردار آج دست بستہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوتے اللہ اکبر کا نعرہ

ہوگا؟ آپؐ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا تم سے کیا سلوک کیا جائے؟ انہوں نے کہا "آپؐ جوانوں کے محسن بھائی اور بڑھوں کے مہربان بھتیجے ہیں"۔ آپؐ نے عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں وہی کچھ کہتا ہوں۔ جو میرے بھائی یوسف نے کہا تھا۔ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یعنی "آج کے دن تم سے کوئی باز پرس نہ ہوگی"۔ آپؐ کے اس اخلاق نے ہزار تلوار سے بڑھ کر کام کیا۔ آج بڑے سے بڑا کافر دل اور منکر اسلام بھی آپؐ کا گرویدہ ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے سنگ دلوں کے دل موم ہو گئے تھے۔ اور آج ان کی آنکھوں نے اسلام کی حقانیت کو پہچان لیا تھا۔

مکہ فتح ہو گیا۔ اسلام کی راہیں ہر ایک کے لئے کھل گئیں۔ حضورؐ کعبہ میں تشریف لے گئے۔ بتوں سے کعبہ پاک کیا گیا۔ اور اس کی چھت پر اسلام کا جھنڈا گاڑا گیا چند روز رہ کر اور شہر کے نظم و نسق کو مسلمانوں کے ہاتھ میں دے کر حضورؐ اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ واپس آئے اور مدینہ والوں سے بیعت عقبہ والا وعدہ پورا کیا کہ "تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں"۔

غزوہ تبوک: اس وقت ایشیا، افریقہ اور یورپ میں دو بڑی سلطنتیں تھیں۔ ایک ایران کی اور دوسری روم کی۔ عرب کے سرحدی علاقے بھی انہی دو سلطنتوں کے باج گذار تھے۔

شام میں ایک غسانی عرب حکومت کرتا تھا۔ جو عیسائی تھا۔ اور رومیوں کا باج گزار۔ اس نے جب اسلام کی قوت کا چرچا سنا تو گھبرایا۔ اور از خود بلا وجہ حضرت رسول اکرمؐ کے مقابلہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ غسانی رومیوں کی مدد سے شام کی سرحد پر فوجیں اکٹھی کر رہا ہے۔ تاکہ مدینہ پر حملہ کرے۔ آنحضرتؐ نے بھی تیاری کا حکم دے دیا۔

۹ھ کے اواخر میں تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ جس میں دس ہزار سوار تھے۔ تبوک کے مقام پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ رومیوں کے حملے کی خبر صحیح

نہ تھی۔ البتہ عیسائی اسلام کے زور کو روکنے کے لئے کچھ دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔
مسلمان فوج بیس دن تک تبوک کے مقام پر ٹھہری رہی اور جب کوئی دشمن مقابلہ میں نہ آیا۔ تو آپ نے واپسی کا حکم دیا۔

تبوک کی مہم کا سرحدی علاقہ پر گہرا اثر پڑا اور واپسی پر کئی چھوٹی چھوٹی عرب اور عیسائی ریاستوں نے اسلامی حکومت کے زیر فرمان رہنا قبول کیا۔ اور جزیہ دینے لگے۔ تبوک کا سفر اس اعتبار سے کہ یہ رومیوں کے مقابلہ میں نکلنے کی پہلی مہم تھی۔ بہت اہم ہے۔ اس سے مسلمان بہادروں میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ روم اور ایران کی سلطنتوں سے ٹکر لی جائے۔ اور ان کے پنجۂ ظلم میں پھنسی ہوئی مخلوق خدا کو آزاد کرا کے ان کو اسلام کی نعمت سے مالا مال کیا جائے۔

حجۃ الوداع: ۱۰ھ ہجری کے اوائل تک تقریباً کل عرب اسلام کے جھنڈے تلے متحد ہو چکا تھا۔ فتح مکہ کے بعد عرب دھڑا دھڑ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ ہر طرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے نعرے بلند ہونے لگے۔ یہ دور رسول اللہؐ کے لیے بے حد معروفیت کا دور تھا۔ تمام دن ملک کے چاروں طرف سے وفد آتے اور آپؐ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرتے تھے۔

آپؐ مسجد نبوی میں بیٹھ کر لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیتے اور ان کو خدا کے احکام سناتے۔ تعلیم و تبلیغ کے علاوہ آپ پر ملک کے نظم و نسق کی ذمہ داری بھی تھی۔ اور ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی آپ ہی تھے صبح سے لے کر رات گئے تک تبلیغی اور سیاسی امور کی انجام دہی میں لگے رہتے۔ باقی تمام وقت عبادت اور کھانے پینے کے لیے وقف ہوتا۔ رات کو آپ بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہو کر مصروف عبادت رہتے اور اسلام کی کامیابی پر خداوند جہان کا شکر ادا کرتے تھے۔

علاقوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مبلغ۔ زکوٰۃ وصول کرنے کو عامل اور نظم و نسق اور عدالت کے لیے مفتی اور قاضی مقرر کیے گئے۔ اب سارا عرب

متحد ہو کر اسلام کا علمبردار بن گیا۔ آپؐ جس مقصد کے لیے دنیا میں آئے تھے۔ وہ پورا ہو گیا۔

ذی قعدہ سنہ۱۰ھ میں آپؐ نے حج کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس خبر کا سُننا تھا کہ ہزاروں بندگانِ خدا حج کے لیے تیار ہونے لگے۔ چنانچہ آپؐ ۵ ذوالحجہ کو ایک لاکھ مسلمانوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔

سفر کا منظر عجب روح پرور اور ایمان افروز تھا۔ اس سرزمین میں جہاں خدائے واحد کا نام لینے والا ایک بھی موجود نہ تھا۔ آج ایک لاکھ نفوس اس کے نام کی تسبیح پڑھتے ہوئے "لبیک لک لبیک اللھم لبیک لک لبیک" یعنی میں تیرے لیے حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں۔ اے اللہ میں تیرے لیے حاضر ہوں" یہ نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے۔ ایک سمندر کی طرح خانہ کعبہ کی زیارت کو بڑھے جا رہے تھے ان کی آوازوں سے پہاڑیاں گونج رہی تھیں اور فضا میں طور سرمست ہو رہے تھے۔ حضورؐ ایک اونٹنی پر سوار تھے۔ اور ان کے آگے پیچھے دائیں بائیں عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔

خطبۃ الوداع: مکہ پہنچ کر حج کے مناسک ادا کرنے سے قبل ۸ ذی الحجہ کو آپؐ نے وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا۔ جو الوداعی خطبہ کہلاتا ہے۔ اور جس کو پڑھ کر قیامت تک مسلمانوں کے دل ایمان سے پُرنور ہوتے رہیں گے۔

آپؐ نے فرمایا:

"لوگو! میری بات سنو معلوم نہیں کہ میں اور تم پھر کبھی اس جگہ اکٹھے ہوں گے یا نہیں۔ لوگو! تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور عزتیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسا کہ تم آج کے دن اس شہر کی اور اس مہینے کی عزت کرتے ہو۔ تمہیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی

نسبت سوال فرمائے گا۔"

"لوگو! تمہارے عورتوں پر کچھ حقوق ہیں۔ اور عورتوں کے تم پر حقوق ہیں۔ عورتوں کے ساتھ مہربانی اور محبت سے پیش آؤ۔ کیونکہ خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لیے حلال کیا ہے۔ اپنی امانتوں میں دیانت دار رہو اور گناہ سے بچے رہو۔ سود حرام ہے۔ آج کے بعد مقروض صرف اصل ادا کرے گا۔ اور سب سے پہلے میں خود اپنے خاندان کے عباس بن عبدالمطلب کا سود معاف کرتا ہوں۔ زمانہ جاہلیت کے تمام جھگڑے مٹائے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں خود ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون معاف کرتا ہوں۔"

"اور اپنے غلاموں کی بابت خیال رکھو کہ تم انہیں وہی کھانا کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ وہی لباس پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ اور اگر ان سے کوئی ایسا قصور سرزد ہو جو تم معاف نہ کر سکو۔ تو ان کو جدا کر دو۔ کیونکہ وہ خدائے واحد کے بندے ہیں۔ اور ظلم کے لیے پیدا نہیں کیے گئے۔"

"لوگو! میری بات غور سے سنو۔ جان رکھو کہ سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ کوئی چیز جو ایک بھائی کی ملکیت ہے دوسرا نہیں لے سکتا۔ جب تک وہ خود خوشی سے اسے نہ دے۔ اپنے آپ کو بے انصافی سے بچائے رکھو۔ جو لوگ موجود ہیں۔ وہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں ہیں۔ یہ الفاظ پہنچا دیں۔ ممکن ہے۔ وہ لوگ جنہیں بتایا جائے۔ ان لوگوں سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوں جنہوں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔"

اس خطبہ میں نہ شاعری ہے اور نہ فلسفیانہ نکتہ آفرینی۔ بلکہ سیدھے سادے انداز میں زندگی کے اُلجھے ہوئے مسائل کو اس خوبی اور صفائی سے حل کر دیا گیا ہے۔ کہ اس سے اعلیٰ عملی تعلیم انسانی کانوں نے آج تک نہ سنی تھی۔

خطبہ ختم کرنے پر لوگوں کے ذوق و شوق کو دیکھ کر آپؐ بہت متاثر ہوئے اور فرمایا "اے خدا! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا اور اپنا کام پورا کر دیا۔ تمام لوگ یک وقت پکار اٹھے بے شک آپ نے اپنا کام پورا کر دیا۔"

آپ نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا اور پھر لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا! اے خدا! گواہ رہنا۔" ان الفاظ کے ساتھ آپؐ نے خطبہ ختم فرمایا جو فصاحت و بلاغت اور خوش بیانی کی وجہ سے بے مثال تھا۔ اور مناسک حج ادا کرنے کے بعد آپؐ جلدی ہی واپس تشریف لے گئے

آخری حج ادا کر کے مکہ سے واپس آنے

علالت اور وصال :- کے کچھ عرصہ بعد آپؐ کی طبیعت ناساز ہوئی۔ مگر آپؐ نے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ایک روز آدھی رات کے قریب مدینہ کے قبرستان میں گئے اور اہل قبور کی مغفرت کے لیے دُعا کی۔ اُحد کے شہیدوں کے قبرستان میں گئے اور وہاں رو رو کر اُن کے حق میں دعائیں کیں۔ اور واپس ہوتے وقت اس طرح رخصت ہوئے جیسے کوئی زندوں سے رخصت چاہتا ہے۔

ایک دن نماز کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا "مسلمانو! اگر میں نے تم میں سے کسی پر ظلم کیا ہے۔ تو اس کے قصاص کے لیے تیار ہوں اور اگر مجھے کسی کا کچھ دینا ہے۔ تو جو کچھ میرے پاس ہے۔ وہ تمہارا ہے۔" ایک شخص اٹھا اور تین درہموں کا مطالبہ کیا۔ جو اس نے آپؐ کے ارشاد پر ایک غریب کو دیئے تھے۔ یہ فوراً ادا کر دیئے گئے۔

ایک دوسرے موقعہ پر آپؐ نے فرمایا "اے مسلمانو! میں اپنے پیچھے تمہارے پاس خدا کا کلام چھوڑ جاؤں گا۔ اگر تم نے اس کے مطابق زندگی بسر کی تو تمہارے لیے

کوئی دُکھ درد نہیں۔ تم قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔" پھر آپ نے سب کے لئے دُعا مانگی اور تقریر کو قرآن کے ان الفاظ پر ختم فرمایا۔ "آخرت کے اچھے گھر کو ہم نے ان لوگوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ جو دنیا میں تکبر نہیں کرتے۔ اور نہ فساد کرتے ہیں اور عقبیٰ کی جزائیں صرف پرہیزگاروں کے لیے ہیں۔"

آپ نے بیماری کے ایام میں رہائش کے لئے حضرت عائشہؓ کا گھر منتخب کیا تھا۔ جو مسجد سے بالکل متصل تھا۔ حد درجہ کی کمزوری اور ناتوانی کے باوجود وفات سے تین دن قبل تک نماز کی امامت فرماتے رہے۔ اس کے بعد آپؐ مسجد میں تشریف نہ لا سکے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ وغیرہ مزاج پرسی کے لیے گھر حاضر ہوتے تو آپؐ مسلمانوں کے لیے نصیحتیں فرماتے باقی وقت اللہ کی یاد میں محو رہتے۔

۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ پیر کے روز کو آپؐ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سیرت و اخلاق

امانت و دیانت: آنحضرتؐ نے ایک یتیم کی حیثیت سے آنکھ کھولی اور اپنی دیانت داری اور ہمت سے ایک کامیاب تاجر بنے۔ صداقت اور امانت کی بنا پر "الصادق" اور "الامین" کہلائے۔ پھر تبلیغ حق کی بنا پر اپنے وطن سے نکال دیئے گئے۔ مگر بہت جلد ملک عرب کے حاکم بن گئے اور بالآخر پوری دنیا نے آپ کے کلمہ کو اپنا لیا۔ یہ سب کچھ آپؐ کے خلق عظیم کا نتیجہ تھا۔

استقلال و استقامت:

حضورؐ کی سیرت کا نمایاں ترین پہلو، استقلال و استقامت ہے۔ آپؐ کی ذات ارادہ کی ایک چٹان اور عزم کا ایک پہاڑ تھی۔ جس کے سامنے بڑے سے بڑے طوفان بے حقیقت تھے۔ آپؐ جو پیغام لے کر اٹھے۔ اسے انتہائی جور و ستم اور مخالفت کے باوجود پیش کرتے گئے۔ اور آخر کامیاب ہوگئے۔ قریش نے ابوطالب کی وساطت سے دھمکی دی تو فرمایا "یہ لوگ اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لا کر رکھ دیں تو بھی میں ایک خدا کو پکارنے سے بغیر نہیں رہوں گا۔"

حسن تدبر:

حسن تدبر بھی آپؐ کے کردار کا اعلیٰ جوہر تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ کیوں عالم بے کسی میں مکہ سے نکلے تھے اور مدینہ پہنچ کر کیسے پیچیدہ مسائل اور کیسی کیسی کٹھن منزلوں نے آپؐ کے تدبر کو آزمایا! بیک وقت کئی کئی دشمنوں کا مقابلہ

رہا۔ ایک طرف سے قریش چڑھے آرہے ہیں۔ دوسری جانب سے خیبر کے یہود للکارتے ہیں۔ مدینہ میں بنی قریظہ سانپ بنے بیٹھے ہیں اور منافق تاک میں ہیں۔ مگر خدا کا رسولؐ تنہا ان سب کی چالوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور ایک ایک کو مات دیتا ہے۔

سادگی:

سادگی آپؐ کی فطرت کا جوہر تھی۔ آپؐ غریب تھے۔ جب بھی سادہ تھے فارغ البال ہوئے پھر بھی سادہ رہے۔ اور جب ملک کا تخت و تاج آپؐ کے قدموں میں تھا۔ اس وقت بھی سادگی ہی اوڑھنا اور بچھونا تھی۔ تکلف اور تکبر کو آپؐ سخت ناپسند فرماتے۔ خندق کھودتے اور مسجد نبویؐ بناتے وقت آپؐ نے مسلمانوں کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کیا۔

ایثار و ہمدردی:۔

آپؐ کا دل ایثار اور ہمدردی کے جذبات سے لبریز تھا۔ کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کے لیے جاتے کوئی محتاج ملتا تو اس کی مدد کرتے۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے۔ جن کے پاس کپڑے کی کمی ہوتی اس کو کپڑے پہناتے ہمسایوں کا خیال رکھتے گھر میں کوئی اچھا کھانا تیار ہوتا تو دوستوں اور ہمسایوں کو بھیجتے رشتہ داروں کا حق ادا کرنے کی خاص احتیاط برتتے۔

بچوں سے محبت:

آپؐ کو بچوں سے بے حد محبت تھی۔ گلی کوچوں سے گزرتے وقت ان سے پیار کرتے اور ان کے کھیل کود کے متعلق پوچھتے۔ کم سن آپؐ کے انتظار میں اپنے دروازوں پر کھڑے رہتے۔ آپؐ گزرتے تو ان کا نام لے کر پکارتے وہ کوئی کھیل یا چیز دکھانے کو لاتے تو حضورؐ اسے دلچسپی سے دیکھتے۔

عورتوں سے سلوک :

عورتوں کی دل سے عزت کرتے۔ اپنے سے عمر میں بڑی عورت کا احترام کرتے صاف ستھری جگہ پر بٹھاتے۔ اور ان کی باتیں غور سے سنتے مردوں کا عورتوں کے حقوق کی طرف بار بار توجہ دلاتے۔ آخری خطبہ میں بھی لوگوں کو اس طرف متوجہ فرمایا۔

جو آپؐ سے نیک سلوک کرتا اسے ہمیشہ یاد رکھتے اور اچھے لفظوں میں اس کا ذکر فرماتے رہتے۔ ہر نیک انسان کے لیے آپؐ کے دل میں جگہ تھی۔ خواہ اس کا کسی قوم یا مذہب سے تعلق ہوتا۔ ایک لڑائی میں مشہور سخی حاتم طائی کی لڑکی قید ہو کر آئی۔ علم ہونے پر آپ اُس کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے۔ اور اس سے نہایت عمدہ سلوک کیا۔

خوفِ خدا :

خدا خوفی، اور عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ اپنی پیاری بیٹی سے فرمایا "فاطمہ! نیک عمل کرو، یاد رکھو صرف نیک اعمال ہی تمہیں حشر کے دن بچا سکتے ہیں"۔ اپنے عزیزوں سے فرمایا کرتے "تم اس لیے نہیں بخشے جاؤ گے کہ تم محمدؐ کے رشتہ دار ہو۔ خدا کی بارگاہ میں صرف صالح اعمال ہی کام آئیں گے"۔

لطف و مہربانی :

آپؐ نرم دل، مہربان مگر انصاف پسند تھے۔ ایک بار کوئی خاندانی عورت چوری کے جرم میں پکڑی گئی۔ صحابہؓ میں سے کسی نے سفارش کی تو فرمایا "اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے"۔

بہادری و جوانمردی :

دلیر اتنے تھے کہ خطرے میں جہاں بڑے بڑے بہادروں کے دل دہل

جاتے آپؐ جرأت سے ڈٹے رہتے۔ ایک رات مدینہ میں بڑی خوفناک آواز سنائی دی۔ لوگ ڈر گئے۔ کچھ بہادر دریافت احوال کے لیے شہر سے باہر نکلے تو حضورؐ کو گھوڑے پر سوار تنہا اُدھر سے آتے دیکھا۔ بہت حیران ہوئے عرض کیا "حضورؐ! کدھر سے آرہے ہیں؟" آپؐ نے اطمینان اور بے پرواہی سے فرمایا: "آواز آئی۔ تو میں نکلا کہ دیکھوں کوئی دشمن تو نہیں۔" پھر فرمایا آؤ چلیں کچھ بات نہیں۔

آپؐ کی احادیث اور فرمودات سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپؐ بہت فصیح زبان بولتے تھے۔ الوداع خطبہ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکمت کے خزانے بخشے تھے جب آپؐ بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اس قدر پیاری، میٹھی اور اعلیٰ زبان استعمال فرماتے کہ سننے والے اثر میں ڈوب جاتے۔

قرآن پاک نے آپؐ کی زندگی کو "اسوۂ حسنہ" یعنی بہترین نمونۂ زندگی کہا ہے اور آپؐ کے اخلاق کو "کانَ خُلُقُہُ القرآن" بتایا ہے۔ یعنی آپ کا اخلاق مجسم قرآن تھا

عہدِ رسالت کا نظام

عربوں کے دائرۂ اسلام میں آجانے کے باعث ملک عرب میں نہ صرف سیاسی وحدت قائم ہو گئی بلکہ تمدنی اور معاشرتی نظام میں بھی ایک عظیم انقلاب آ گیا حضور صلعم کے دس سالہ دور میں عربوں کے اخلاق و عادات اور رسم و رواج کچھ اس تیزی سے تبدیل ہوئے کہ دنیا حیران رہ گئی۔ وہی عرب جو صدہا قبیلوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ چند ہی سالوں میں ایک مضبوط وحدت میں منسلک ہو گئے۔ اسلامی مساوات نے قدیم عداوتوں اور ہزار ہا سالہ پرانی دشمنیوں کو ایک دم ختم کر کے ان میں اخوت کا مضبوط رشتہ قائم کر دیا۔ اس وحدت و یکجہتی کا اثر یہ ہوا کہ ملک عرب کا شمار دنیا کی اہم ترین سلطنتوں میں ہونے لگا۔

دنیاوی بادشاہت کے برعکس اسلام نے حاکمیت کا ایک نیا تصور پیش کیا اور مطلق العنانیت کو ختم کر کے حاکم کا احکامات قرآنی اور دینی اصولوں کا پابند ہونا لازم ٹھہرایا۔ خلاف شریعت چلنے والے کو عہدے سے برطرف کر کے مناسب سزا دی جاتی تھی۔ آنحضرت نے جو بھی قدم اٹھایا، قرآنی ہدایات کے مطابق اٹھایا جن معاملات کے بارے میں قرآن کی آیات سے کوئی صریح رہنمائی نہ ملتی تھی ان میں بھی حتی الوسع خود رائی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ صحابہ کرام کے مشورے سے انجام دیئے۔ اس طرح ممتاز صحابہ پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ کا قیام عمل میں آیا۔ ذیل میں آنحضرت صلعم کے مرکزی اور صوبائی نظام کا مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے

مرکزی نظام: عہد نبوی میں مدینہ منورہ کو دارالحکومت کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں کا انتظام براہ راست حضور اکرمؐ کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ مذہبی پیشوا ہونے کے علاوہ آنحضرتؐ بیک وقت حاکم اعلیٰ قاضی القضاۃ اور سالار لشکر بھی تھے۔ انتظامی امور آنحضرت صلعم بالعموم مسجد نبوی میں بیٹھ کر انجام دیتے تھے۔ گویا اسے سیکرٹریٹ کا درجہ حاصل تھا۔ حضرت علیؓ، حضرت عثمان حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کاتبان وحی تھے۔ حضرت زبیر بن عوام رضؓ صدقات اور زکوٰت کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ عوام کے باہمی معاہدے تحریر کرنے کے کام پر مامور تھے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ غیر ملکی بادشاہوں اور سرداروں کے ساتھ خط وکتابت کا کام کرتے تھے۔ حضرت حنظلہ بن ربیع رضی اللہ عنہ کو حضور کے دبیر خاص ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اور مہر نبوت بھی ان ہی کے قبضے میں رہتی تھی۔ احتساب کے فرائض خود رسول اکرمؐ انجام دیتے تھے۔

صوبائی نظام: عہد نبوی میں اسلامی سلطنت مدینہ۔ تہامہ۔ جناد مکہ، حضرموت۔ عمان اور بحرین کے صوبوں میں منقسم تھی۔ ہر صوبے کا انتظام ایک گورنر کے سپرد ہوتا تھا۔ امن وامان کے قیام کے علاوہ صوبائی فوج کی سپہ سالاری بھی والی کے فرائض میں داخل تھی۔ والی کی امداد کے لیے عامل اور قاضی بھی تعینات ہوتے تھے۔ عامل کے ذمے صدقات وزکوٰت کی فراہمی اور حساب کتاب تھا۔ قاضی لوگوں کے مقدمے سنتا۔ اور شرعی احکام کی روشنی میں ان کے فیصلے کرتا تھا۔

ذرائع آمدنی: اس زمانے میں آمدنی کے پانچ پانچ بڑے بڑے ذریعے تھے: (۱) مال غنیمت (۲) زکوٰت وصدقات (۳) جزیہ

(۴) خراج یعنی زمین کا لگان (۵) جاگیریں یا فئے:

غنیمت سے مراد وہ مال و اسباب تھا جو مسلمانوں کو کفار سے مقابلہ میں ہاتھ لگتا تھا۔ اس مال کا ۴/۵ حصہ سپاہ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا باقی کا حصہ آنحضرت ؐ کے خاندان اور دیگر مستحقین کے لیے وقف تھا۔

زکوٰۃ کی ادائیگی صاحب حیثیت مسلمانوں پر فرض تھی۔ اس کی شرح مال و دولت اور نقدی پر ۲½ فی صد اور زمین کی پیداوار پر دس بر تھی۔ صدقات کے زمرے میں وہ رقوم شامل تھیں جو مخیر لوگ رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے حکومت کو دیتے تھے۔

جزیہ ایک ایسا ٹیکس تھا۔ جو صرف غیر مسلموں سے ہی وصول کیا جاتا تھا۔ اور اس کے بدلے میں حکومت ان کے جان و مال اور مذہب کی حفاظت کرتی تھی۔ یہ ٹیکس صرف صحت مند اور صاحب استطاعت غیر مسلم مردوں پر عائد ہوتا تھا۔ اور اس کی شرح نہایت ہی قلیل تھی۔

جاگیر یا فئے سے مراد وہ جائداد یا زمین تھی۔ جس پر براہ راست حکومت کا قبضہ ہوتا تھا۔

عسکری نظام: عہد نبوی میں کوئی باقاعدہ تنخواہ دار فوج نہیں تھی بلکہ ہر مسلمان جنگ کے وقت رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کر دیتا تھا۔ تنخواہ کی بجائے مجاہدین کو مال غنیمت کا ۴/۵ حصہ ملتا تھا۔ لڑائی میں ان دنوں تلواریں، نیزے، برچھے، تیر و کمان، ڈھالیں، زرہ بکتر اور خود استعمال ہوتے تھے۔ جس جنگ میں حضور ؐ شرکت کرتے تھے۔ اسے غزوہ کہتے تھے اور اس کے سپہ سالار اعلیٰ بھی آپ ؐ خود ہی ہوتے تھے۔ جس میں خود تشریف نہ لے جاتے۔ اس کا سپہ سالار کسی کارآزمودہ صحابی کو مقرر کر دیتے تھے۔ ایسی

لڑائیوں کو سریہ کہتے تھے۔ عام حملہ سے پیشتر انفرادی مقابلے ہوتے تھے جسے مبازرات کہتے تھے۔ نئی نئی جنگی چالوں کو حضورؐ بے حد پسند فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بدر، احد اور خندق کے غزوات میں جنگی ترتیب اور صف آرائی مختلف انداز میں تھی۔ بسا اوقات مسلمان عورتیں بھی جنگ میں شریک ہوتی تھیں۔ ان کا کام مجاہدین کو پانی پلانا، کھانا تیار کرنا، تیر اٹھا کر لانا۔ اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا ہوتا تھا۔

عہدِ رسالت کے اہم واقعات

سنہ ۵۷۱ء	۲۱ اپریل	ولادت باسعادت
سنہ ۵۹۶ء		حضرت خدیجہؓ سے عقد
سنہ ۶۱۰ء		بعثت و نبوت
سنہ ۶۱۴ء		ہجرت حبش
سنہ ۶۱۵ء		واقعات شعب ابی طالب
سنہ ۶۱۹ء		سفر طائف، معراج النبیؐ
سنہ ۶۲۱ء		بیعت عقبہ اولیٰ
سنہ ۶۲۲ء		بیعت عقبہ ثانیہ، ہجرت مدینہ
سنہ ۲ھ	۱۷ رمضان	غزوہ بدر
سنہ ۳ھ		غزوہ احد
سنہ ۵ھ		غزوہ خندق یا غزوہ احزاب
سنہ ۷ھ		غزوہ خیبر
سنہ ۸ھ		فتح مکہ، غزوہ حنین، سریہ موتہ
سنہ ۹ھ		غزوہ تبوک
سنہ ۱۰ھ		حجۃ الوداع
سنہ ۱۱ھ	۱۲ ربیع الاول	وصال نبویؐ

خلافت راشده

خلافت راشدہ

خلافتِ راشدہ دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ خلافت اور راشدہ۔
خلافت سے مراد وہ حکومت ہے جو حضرت رسولِ اکرمؐ کی نیابت میں قائم ہوئی چنانچہ اس کے پہلے سربراہ کو "خلیفۃ الرسول اللہ کہا گیا۔ اور دوسرے کو خلیفۃ "خلیفۃ الرسول اللہ کہا گیا"، لبعدمیں محض خلیفہ اور امیر المومنین بھی کہا جانے لگا۔
راشدہ اور راشدین کا مادہ رُشد ہے جس کے معنی ہدایت کے ہیں۔ راشدہ کا مطلب ہوا "ہدایت یافتہ" اور خلفائے راشدین سے مُراد ہوئی مسلمانوں کے وہ سربراہ جنہوں نے حکومت اور سلطنت حضرت رسولِ اکرمؐ کی ہدایت اور اسلام کے آئین کے مطابق چلائی۔

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کا زمانۂ خلافت
سنہ ۱۱ھ سے سنہ ۱۳ھ مطابق سنہ ۶۳۲ء تا سنہ ۶۳۴ء

دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ کا زمانۂ خلافت
سنہ ۱۳ھ تا سنہ ۲۳ھ مطابق سنہ ۶۳۴ء تا سنہ ۶۴۴ء

تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کا زمانۂ خلافت
سنہ ۲۴ھ تا سنہ ۳۵ھ مطابق سنہ ۶۴۴ء تا سنہ ۶۵۶ء

چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کا زمانۂ خلافت
سنہ ۳۵ھ تا سنہ ۴۰ھ مطابق سنہ ۶۵۶ء تا سنہ ۶۶۱ء

خلافتِ راشدہ کا مجموعی زمانہ سنہ ۱۱ھ سے سنہ ۴۰ھ تک تقریباً ۳۰ تیس سال تک رہا اس دوران آئین سلطنت اور تمام تر کاروبار اسلام کے مطابق انجام پایا اس لئے دور کو "خلافت راشدہ" سے موسوم کیا جاتا ہے۔

خلیفہ اول

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

ربیع الاول ۱۱ھ تا جمادی الآخر ۱۳ھ

بمطابق

جون ۶۳۲ء تا اگست ۶۳۴ء

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

ابتدائی حالات: عبداللہ نام، ابوبکر کنیت، صدیق اور عتیق لقب، باپ کا نام عثمان اور کنیت ابوقحافہ، ماں کا نام سلمیٰ اور ام الخیر کنیت تھی۔ سلسلۂ نسب چھٹی پشت میں آنحضرتؐ سے ملتا ہے۔

آپ کے والد شرفائے مکہ میں تھے۔ فتح کے بعد اپنے بیٹے کے ساتھ مسجد نبوی میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ والدہ ابتدائی زمانہ ہی میں دولتِ اسلام سے بہرہ اندوز ہو گئیں۔

قبول اسلام سے پہلے ابوبکرؓ مکہ کے ایک متمول تاجر تھے۔ دیانت داری، راست بازی اور امانت کا شہرہ تھا چنانچہ خون بہا کا مال آپ ہی کے یہاں جمع ہوتا تھا۔ شراب کبھی نہیں چکھی۔ اسلام لانے سے پہلے بھی شرافت۔ رحمدلی۔ ہمدردی اور حسن خلق کی وجہ سے لوگوں میں معزز اور محترم تھے۔

آپ کو آنحضرتؐ کے ساتھ بچپن ہی سے خاص اُنس اور لگاؤ تھا۔ رسول پاکؐ کے حلقۂ احباب میں داخل تھے، جب آپؐ نے ان کے سامنے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت اور رسالت سے سرفراز فرمایا ہے تو مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ ہی ایمان لائے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے بلا کسی تردد میری بیعت کی۔

تبلیغ اسلام: قبول اسلام کے بعد آپ نے ساری زندگی تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دی۔ آپ کی تبلیغ سے کئی اکابر صحابہؓ مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ حضرت زبیرؓ حضرت طلحہؓ حضرت سعد وقاصؓ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت ابوعبیدہ

بن الجراحؓ وغیرہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

جب حضورؐ نے مکّہ میں تبلیغ کا سلسلہ شروع فرمایا اور کفار کی ایذارسانی کے باوجود تیرہ سال تک اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ اس نازک وقت میں ابوبکرؓ نے جان اور مال دونوں سے حضورؐ کا ساتھ دیا۔ جب آنحضرتؐ مختلف قبائل میں تبلیغ کے لیے تشریف لے جاتے تھے تو اکثر آپ ہمرکاب ہوتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کا ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے مظلوم بندگانِ خدا کو ان کے آقاؤں سے خرید کر آزادی عطا کی۔ اکثر غلاموں کو اپنی جیب سے رقم خرچ کرکے خریدا اور آزاد کر دیا۔ جب کبھی کفارِ مکّہ آنحضرتؐ پر زیادتی کرتے تو ابوبکرؓ اپنی جان خطرہ میں ڈال کر دشمنوں سے بچاتے۔ مثلاً ایک دن آپؐ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ نے اپنی چادر سے حضورؐ کے گلوئے مبارک میں پھندا ڈال دیا اور قریب تھا کہ حضورؐ کا دشمن گلا گھونٹ دے کہ حضرت ابوبکرؓ وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے اس بدبخت کی گردن پکڑ کر حضورؐ سے علیحدہ کیا اور کہا تم اس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔

جب کفار کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ حضرت ابوبکرؓ بھی کفار کی ایذارسانی سے تنگ آکر ہجرت کی نیت سے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی اس نے کہا یہ بات روا نہیں کہ تم جیسا شریف اور نیک نہاد شخص ہجرت پر مجبور ہو جائے تم میرے ساتھ مکّہ واپس چلو۔ آپ ابن الدغنہ کے ساتھ مکّہ واپس آ گئے۔ اس نے اعلان کر دیا کہ آج سے ابوبکرؓ میری امان میں ہیں۔ قریش نے کہا کہ ہم تمہاری امان کو تسلیم کرتے ہیں۔ بشرطیکہ ابوبکرؓ اپنے مکان سے باہر نماز نہ پڑھیں۔

حضرت ابوبکرؓ اپنے گھر کے صحن میں بآوازِ بلند قرآن حکیم پڑھا کرتے تھے چنانچہ کفار نے کہا کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہماری عورتیں اور بچے قرآن سن سن کر آبائی مذہب

منتفر ہوجائیں گے ۔ ابن الدغنہ نے آپؓ سے کہا کہ یا تو باآوازِ بلند قرآن خوانی ترک کر دو یا مجھے بری الذمہ سمجھو ۔ آپ نے کہا کہ "مجھے تمہاری حمایت کی ضرورت نہیں ہے میرے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمایت کافی ہے "

ہجرت مدینہ : جب مدینہ مسلمانوں کا جائے پناہ بن گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کی تیاری کی ۔ آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا "ابھی توقف کرو امید ہے کہ عنقریب مجھے بھی اللہ کی طرف سے ہجرت کا حکم ہوگا۔ انشاء اللہ تم میرے ساتھ چلو گے ۔" یہ سُن کر انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

ایک دن آنحضرتؐ حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا "اگر کوئی غیر آدمی گھر میں ہو تو بتا دو میں کچھ راز کی باتیں کرنا چاہتا ہوں" انہوں نے کہا "کوئی شخص اندر نہیں" آپؐ اندر تشریف لے گئے ۔ اور فرمایا "مجھے ہجرت کا حکم ہو گیا ہے تم ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ" یہ سُن کر جلد ہی سامانِ سفر درست کر لیا ۔ رات کے وقت ایک اونٹ پر آنحضرتؐ دوسرے پر صدیق اکبرؓ سوار ہو کر روانہ ہوئے ۔

مکہ سے نکل کر غارِ ثور میں پہلی منزل کی حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت کے مطابق ان کے فرزند عبداللہ رات کو آکر دن بھر کی خبریں پہنچاتے اور ان کے غلام عامر بکریوں کا دودھ پلا جاتے ۔ تین دن یہیں بسر کیے۔ ان دونوں کے روانہ ہونے پر مکہ کے کافر بہت سیخ پا ہوئے ۔ انہوں نے اعلان کیا کہ جو شخص محمدؐ کو گرفتار کر کے لائے گا اسے ایک سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے ۔ اس لالچ میں بہت سے آدمیوں نے آپؐ کی تلاش شروع کی ۔ ایک جماعت غار کے پاس بھی پہنچی ۔ ابوبکرؓ نے کہا "اگر وہ نیچے کی طرف نگاہ کریں گے تو ہمیں دیکھ لیں گے" آپؐ نے فرمایا "غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے"

چوتھے روز یہاں سے روانہ ہوئے ۔ کچھ دور جانے کے بعد سراقہ بن جعشم گھوڑا دوڑاتا ہوا قریب پہنچا ۔ آنحضرتؐ نے خدا سے دعا کی ۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ سراقہ کے

گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ اس نے امان طلب کی اور واپس چلا گیا اس کے بعد راستہ میں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا اور حضرت ابوبکرؓ ۱۲ ربیع الاوّل کو مدینہ کے قریب پہنچ گئے۔ انصار حضورؐ کی تشریف آوری کا انتظار کر رہے تھے۔ آپؐ قباء میں تشریف لائے اور دو ہفتے قیام کے بعد مدینہ تشریف لائے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دینی بھائی حضرت خارجہ بن زہیرؓ کے یہاں قیام کیا اور جب آنحضرتؐ نے مدینہ میں مسجد تعمیر کی تو زمین کی قیمت حضرت ابوبکرؓ نے ادا کی۔ اور حضورؐ کے دوش بدوش تعمیر میں بھی حصہ لیا۔

غزوات میں شرکت

کفار نے مسلمانوں کو قتال پر مجبور کیا اپنی مدافعت کے لیے مسلمانوں کو ہتھیار اٹھانے پڑے اور فتح مکہ تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت ابوبکرؓ ان تمام جنگوں میں آنحضرتؐ کے مشیر کی حیثیت سے شریک رہے اور جس طرح ابوبکرؓ نے مکہ میں زبان اور مال سے اسلام کی خدمت کی تھی اسی طرح اب میدان جنگ میں اسلام کی حمایت میں اپنی جان کی پرواہ نہ کی۔

غزوہ بدر میں جب کہ آنحضرتؐ درگاہ ایزدی میں مصروف دعا تھے ردائے مبارک شانوں سے گر گئی۔ صدیق اکبرؓ نے جب یہ حالت دیکھی تو فوراً حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چادر ٹھیک کی اور تلوار لیئے کھڑے رہے۔ فتح کے بعد ستر قیدی ہاتھ آئے۔ حضورؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے قتل کی رائے دی۔ لیکن صدیق اکبرؓ نے کہا کہ ان کو فدیہ لے کر آزاد کر دینا چاہیئے آنحضرتؐ نے انہی کی رائے سے اتفاق فرمایا۔

غزوہ اُحد میں مسلمانوں کی غلطی سے فتح شکست میں بدل گئی لیکن صدیق اکبرؓ آخر وقت تک ثابت قدم رہے جب حضورؐ زخمی ہو گئے اور صحابہؓ آپؐ کو پہاڑ پر لائے تو ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے۔ ابوسفیان نے پکارا کہ محمدؐ زندہ ہیں؟ کوئی جواب نہ ملا تو ابو

نے ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا نام لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار بھی حضورؐ کے بعد ابوبکرؓ ہی کو سردارِ امت سمجھتے تھے۔

غزوۂ خندق میں بھی حضرت ابوبکرؓ نے اپنی فدویت کا مظاہرہ کیا۔ خندق کھودنے۔ خندق کی حفاظت کرنے۔ اور دوسرے کاموں میں برابر شریک رہے۔ غزوہ بنو مصطلق میں بھی حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کے ساتھ تھے۔ جب یہ مہم سر ہو گئی تو واپسی میں رات کے وقت لشکر نے مدینہ کے قریب قیام کیا۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ ۶ھ میں پیش آیا حضورؐ چودہ سو صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کی نیت سے مکہ روانہ ہوئے۔ جب مکہ کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش مزاحمت کریں گے۔ حضورؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ آپ لڑنے نہیں جا رہے ہیں۔ بلکہ صرف کعبہ کی زیارت مقصد ہے اس لیے ضرور چلیے اگر کوئی مزاحم ہوگا تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ حضورؐ نے آگے بڑھ کر حدیبیہ میں قیام کیا دونوں طرف سے صلح کی گفتگو ہوئی۔ اسی اثناء میں خبر مشہور ہوئی کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کو جو سفیر ہو کر مکہ گئے تھے شہید کر دیا۔ یہ سن کر آپ نے تمام صحابہؓ سے جہاد کی بیعت لی۔

قریش مکہ یہ عزم دیکھ کر نرم پڑ گئے اور انہوں نے عروہ کو سفیر بنا کر بھیجا اس نے آپؐ سے کہا "اے محمدؐ میں تمہارے گرد ایسے لوگ دیکھتا ہوں، جو مصیبت کے وقت تم سے الگ ہو جائیں گے یہ طعنہ سن کر حضرت ابوبکرؓ جیسے حلیم الطبع انسان سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ اور انہوں نے نہایت غصہ کے لہجہ میں اس سے کہا "کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم آنحضرتؐ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟" عروہ نے پوچھا "یہ کون ہیں؟" لوگوں نے کہا "ابوبکرؓ"، یہ سن کر اس نے کہا اگر میں تمہارا ممنونِ احسان نہ ہوتا تو نہایت سخت جواب دیتا"۔

• صلح حدیبیہ کی شرائط بظاہر کفار کے حق میں مفید تھیں اس لیے حضرت عمرؓ نے کہا کہ جب ہم حق پر ہیں تو پھر کفار سے دب کر صلح کیوں کریں یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے

کہا اور اے عمرؓ! آنحضرتؐ رسول خدا ہیں اس لیے آپؐ خدا کی مرضی سے انحراف نہیں کر سکتے اور خدا ہر حال میں آپؐ کا ناصر اور مددگار ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے جنگ خیبر میں شرکت کی۔ بعد ازاں بنو کلاب اور بنو فزارہ کی سرکوبی پر مامور ہوئے اور کامیابی کے ساتھ بہت سے قیدی اور مال غنیمت لے کر واپس آئے۔

سنہ ۸ھ میں حضورؐ نے دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ کا قصد فرمایا اور فاتحانہ انداز میں داخل مکہ ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی ہمرکاب تھے فتح مکہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کے ساتھ جنگ حنین میں شرکت کی اور انتہائی خطرہ کی حالت میں بھی ثابت قدم رہے۔

سنہ ۹ھ میں غزوہ تبوک ہوا۔ آنحضرتؐ نے جنگی تیاریوں کے لیے صحابہؓ کو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت عثمانؓ نے سب سے زیادہ رقم اور جنس پیش کی۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنا سارا اثاثہ حضورؐ کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ آنحضرتؐ نے دریافت فرمایا "تم نے اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا؟" انہوں نے جواب دیا "ان کے لیے اللہ اور اس کا رسولؐ کافی ہے۔"

اسی سال آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ اعلان کر دیں کہ اس سال کے بعد کوئی شخص برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف نہیں کرنے پائے گا اور نہ کوئی مشرک حج میں شرکت کر سکے گا۔

منصب امامت: سنہ ۱۰ھ میں حج سے واپس تشریف لانے کے بعد آنحضرتؐ کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیماری روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ آپؐ مسجد میں تشریف لانے سے بھی معذور ہو گئے اس لیے آپؐ نے حکم دیا کہ ابوبکرؓ امامت کے فرائض انجام دیں۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی کہ ابوبکرؓ نہایت رقیق القلب ہیں اس

لیے یہ منصب حضرت عمرؓ کو عطا کیا جائے۔ مگر آپؐ نے ان کی درخواست رد فرما دی اور حضرت ابوبکرؓ نے امامت کی خدمت انجام دینی شروع کی۔ ایک دن جب کہ وہ نماز پڑھا رہے تھے۔ آنحضرتؐ تشریف لائے۔ انہوں نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر آپؐ نے اشارہ سے منع فرمایا اور ان کے دائیں پہلو میں بیٹھ کر نماز ادا کی۔

۱۲ ربیع الاوّل دوشنبہ کے دن حضرت ابوبکرؓ اپنے گھر سے جب سہ پہر کو واپس آئے آنحضرتؐ کا وصال ہو چکا تھا اور مسجد کے دروازہ پر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ سیدھے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں گئے اور اپنے محبوب آقاؐ کے روئے مبارک سے چادر اٹھا کر پیشانی کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد باہر آئے۔ حضرت عمرؓ عالم وارفتگی میں لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ آنحضرتؐ نے وفات نہیں پائی۔ یہ دیکھ کر آپ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا "جو لوگ محمدؐ کی عبادت کرتے تھے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپؐ وفات پا گئے اور اگر لوگ خدا کی پرستش کرتے تھے۔ تو بے شک خدا زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی۔ "محمدؐ صرف ایک رسولؐ ہیں اور بلاشبہ ان سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ اس لیے اگر وہ وفات پا جائیں اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟" یہ تقریر اس قدر موثر ثابت ہوئی کہ ہر شخص مطمئن ہو گیا۔

انتخاب خلافت: حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہؓ شدید رنج و غم میں مبتلا ہو گئے حضرت عمرؓ جیسے با ہمت بزرگ غم سے نڈھال تھے، اتنے میں معلوم ہوا کہ انصار مدینہ سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کا معاملہ طے کرنے کے لیے جمع ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کوئی غلط فیصلہ کر بیٹھیں۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح سقیفہ بنو ساعدہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینہ میں اوس اور خزرج کے دو قبیلے آباد تھے اسلام سے قبل

ان میں اکثر جنگ رہتی تھی ۔ یہاں پر خزرج قبیلہ کے سردار سعد بن عبادہ موجود تھے ۔ اور ان کے قبیلے کے اکثر لوگ انہیں خلیفہ بنانے پر مُصر تھے ۔

انصار کا خیال یہ تھا کہ ہم نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی ہے ۔ مکہ والے رسولؐ پاک کی دس سالہ تعلیم اور تبلیغ کے باوجود حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہوئے تھے مکہ میں صرف چند نیک لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا مگر ہم سب جلد ایمان لے آئے ہم نے رسولؐ خدا کے ساتھ مل کر دشمنوں سے جہاد کیا اور عرب قوم کو مطیع کیا ۔ لہٰذا حکومت کے حق دار ہم ہیں ۔

حضرت ابوبکرؓ نے انصار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" ہمیں تمہارے فضائل اور خوبیوں کا اعتراف ہے ۔ لیکن بدوی قبیلے قریش کے علاوہ کسی اور کی امارت کو تسلیم نہ کریں گے لہٰذا مناسب یہی ہے کہ امیر مہاجرین میں سے ہو ۔ تم مشیر رہو ۔ تمہارے مشورے کے بغیر معاملات طے نہ ہوں گے ۔ پھر اگر انصار میں سے خزرج کا امیر ہوا تو اوس خوش نہ ہوں گے اور اگر اوس کا امیر ہوا تو خزرج راضی نہ ہوں گے ۔

اس تقریر کے بعد انصار میں سے حُباب بن منذر خزرجی نے جوش میں آکر کہا اے انصار! تم خلافت پر قبضہ کر لو ۔ سب تمہاری تائید کرتے ہیں کسی میں مخالفت کی نہیں ۔ تم دولتمند ہو جنگ جو ہو ۔ تمہاری قوت اور تعداد بھی زیادہ ہے اگر مہاجرین کو انکار ہے تو ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے ۔

ظاہر ہے دو امیر ہونا کس قدر پُر خطر بات تھی ۔ حضرت عمرؓ نے سختی سے اس کی مخالفت کی ۔ سرزنش کلامی کو ختم کرتے ہوئے حضرت ابو عبیدہؓ نے انصار کو مخاطب کیا "تم سب سے پہلے اسلام کے پشت پناہ بنے اب تمہیں اس کی تخریب میں سبقت نہ کرنی چاہیئے"

اس بات کا انصار پر بڑا اثر ہوا ۔ حضرت بشیرؓ بن سعد انصاری نے کھڑے ہو کر کہا "اے انصار! ہم نے اسلام کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ فقط اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول کریمؐ کی اطاعت کے لیے کیا ہے یہ مناسب نہیں کہ ہم اس کے عوض متاعِ دنیا کے خواہاں ہوں ۔ ہمارا اجر اللہ کے پاس ہے ۔ خلافت کی مستحق ہم سے زیادہ

خود حضور صلعم کی قوم ہو سکتی ہے ۔"

اس تقریر سے انصار کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ عمرؓ اور ابو عبیدہؓ موجود ہیں۔ ان میں سے تم جسے پسند کرو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ ان دونوں نے بیک زبان کہا کہ آپ مہاجرین میں سے سب سے افضل اور حضرت رسولؐ خدا کے سب سے قریبی ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے کون مستحق ہو سکتا ہے۔ یہ کہہ کر دونوں نے آپ ہاتھ پر بیعت کر لی۔ باہر اطلاع پہنچی تو لوگ بہت خوش ہوئے۔ دوڑ دوڑ کر لوگوں نے آپ کے ہاتھ بیعت کر لی۔

دوسرے دن مسجد نبوی میں عام مسلمانوں نے بیعت کی اور حضرت ابو بکرؓ نے منبر پر بیٹھ کر حسب ذیل خطبہ دیا۔

"اے لوگو! میں تم پر والی و حاکم مقرر کیا گیا ہوں۔ لیکن میں تم سے برتر نہیں ہوں اگر میں نیک کام کروں تو اس میں میری امداد کرو اور اگر برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت ہے۔ انشاء اللہ تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ اس کا حق اسے واپس دلا دوں

جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دیتی ہے اللہ اسے ذلیل و خوار کر دیتا ہے اور جس قوم میں بدکاری عام ہو جاتی ہے اس پر مصائب کا نزول ہوتا ہے۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو۔ لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تم پر میری اطاعت لازم نہیں ہے۔"

عہدِ خلافت

خلافت کا منصب سنبھالتے ہی حضرت ابو بکرؓ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف جھوٹے مدعیانِ نبوت اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسری طرف بہت سے

بعد عرب مرتد ہو گئے اور ارتداد کے ساتھ انہوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ تیسری طرف مانعین زکوٰۃ کا ایک گروہ پیدا ہو گیا۔ جو یہ کہتا تھا کہ ہم زکوٰۃ خود خرچ کریں گے بیت المال میں داخل نہیں کریں گے۔ ان تین مشکلات کے علاوہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کی مہم بھی درپیش تھی۔

صحابہ کرامؓ نے یہ مشورہ دیا کہ پہلے ان مشکلات کو حل کیا جائے۔ لیکن صدیق اکبرؓ نے کہا کہ پہلے میں آنحضرتؐ کی مرضی کے مطابق اسامہؓ کی روانہ کروں گا۔ چنانچہ آپ نے داخلی خطرات کے باوجود اسامہؓ کو مہم پر روانہ کیا اور دور تک ان کے ساتھ پیدل گئے انہوں نے کہا کہ آپ بھی سوار ہو جائیں یا میں پیدل ہو جاتا ہوں مگر آپ نے کہا کہ اگر میں تھوڑی دور تک راہ خدا میں اپنا پاؤں غبار آلود کر لوں تو کیا حرج ہے۔ غازی کے ہر قدم پر سات سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

حضرت اسامہؓ حدود شام میں پہنچے اور حضرت زیدؓ کا انتقام لے کر کامیاب واپس آئے۔ واپسی پر بھی حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔ اس کا عرب کے باغی قبائل پر بہت اچھا اثر پڑا۔ اس سے ان پر اسلام کی قوت کی دھاک بیٹھ گئی۔

مسیلمہ کذاب نے ۱۰ھ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے آنحضرتؐ کو لکھا تھا کہ میں بھی نبی ہوں۔ اس لیے آدھی دنیا میری ہے آدھی آپ کی۔ آنحضرتؐ نے اس کو یہ جواب دیا تھا کہ یہ دنیا خدا کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے گا اس کا وارث بنائے گا اور عاقبت تو متقی لوگوں کی ہے۔

آنحضرتؐ کے وصال کے بعد طلیحہ بن خویلد نے حجاز میں اسود عنسی نے یمن میں مسیلمہ بن حبیب نے یمامہ میں اور سجاح بنت حارثہ نے اپنے اپنے علاقہ میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ سجاح نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے مسیلمہ سے نکاح کر لیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ کو ان مدعیان نبوت کی سرکوبی پر مقرر کیا۔ چنانچہ ۱۱ھ میں وہ اس مہم پر روانہ ہوئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ

نے سب سے پہلے طلیحہ کی جمعیت پر حملہ کیا اور اس کی فوج کے سالار کو گرفتار کر کے ۳۰ قیدیوں کے ہمراہ مدینہ روانہ کیا۔ طلیحہ نے شام کا رُخ کیا مگر وہاں سے معافی نامہ لکھ کر بھیجا اور اسلام قبول کر لیا۔

مسیلمہ کی سرکوبی کے لیے حضرت شرجیلؓ کو بھیجا گیا۔ حضرت خالدؓ کو ان کی مدد کے لیے بطور کمک روانہ کیا گیا۔ انھوں نے مسیلمہ کے سپہ سالار کو شکست فاش دی پھر خود مسیلمہ سے مقابلہ ہوا۔ مسیلمہ نے بہت زور شور سے حملہ کیا لیکن وحشیؓ کے ہاتھ سے مارا گیا اور مسلمان کامیاب ہو گئے۔ مسیلمہ کی بیوی سجاح بھاگ کر بصرہ پہنچی اور کچھ عرصہ بعد وہیں مر گئی۔

اسود عنسی نے دعوی نبوت کئی سال پہلے کیا تھا۔ عہد صدیقی میں اس کی طاقت بڑھ گئی تھی قلیس اور فیروز نے نشہ کی حالت میں اس کو قتل کر دیا۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے سامنے دوسرا مسئلہ مرتدین کا تھا۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بہت سے سرداران عرب مرتد ہو گئے تھے لقمان بن منذر نے بحرین میں اور لقیط بن مالک نے عمان میں بغاوت کر دی اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے علاء بن حضرمیؓ کو بحرین بھیجا اور حذیفہ بن محصنؓ کو عمان بھیجا اور زیاد بن لبیدؓ کو ملوک کندہ کی سرکوبی پر مامور کیا ان حضرات نے بہت جلد تمام دشمنوں کا قلع قمع کر دیا اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں اس طرف سے بھی اطمینان ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے لیے تیسرا سوال منکرین زکوٰۃ کا تھا دوسرے صحابہ کے علاوہ حضرت عمرؓ نے بھی ان لوگوں سے خلاف جہاد کرنے کے خلاف رائے دی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے صاف کہہ دیا کہ میں ان لوگوں کے خلاف ضرور جہاد کروں گا چنانچہ ان لوگوں کے خلاف فوج کشی کی گئی اور یہ لوگ خود زکوٰۃ لے کر حاضر ہوئے اور فتنہ فرو ہو گیا ان مہموں کی کامیابی حضرت صدیق اکبرؓ کی دانشمندی جرأت تدبر اور دور اندیشی کی بہترین مثال ہے۔

فتوحات

عرب کی شمالی سرحدیں دو بڑی عظیم الشان سلطنتوں سے ملحق تھیں ملکِ شام رومی سلطنت کے زیرِ نگیں تھا۔ اور ملک عراق پر ایرانی سلطنت کا قبضہ تھا۔ ان دونوں سلطنتوں نے ہمیشہ عربوں کو محکوم بنانے کی کوشش کی۔

عرب فطرتاً آزاد طبع تھے وہ ہمیشہ برسرِ بغاوت رہتے تھے چنانچہ انہوں نے کئی مرتبہ عراق میں اپنی حکومت قائم کی اور حیرہ کو اپنا پایہ تخت بنایا اگرچہ ایرانیوں نے شاہان حیرہ کو اپنا باجگذار بنا لیا تاہم عربی قبائل وقتاً فوقتاً عراق میں آباد ہوتے رہے۔ رومی سلطنت سے بھی عربوں کا دیرینہ تعلق تھا۔ بہت سے عربی قبائل نے جو شام میں آباد ہو گئے تھے۔ عیسائی مذہب اختیار کر کے ملک شام میں اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ اور مذہبی یگانگت کی بنا پر انہیں رومیوں سے ایک قسم کی وابستگی ہو گئی تھی۔

جب اسلام طلوع ہوا تو عرب مشرکین کی طرح عرب عیسائیوں نے بھی مخالفت کی چنانچہ جب سنہ ۶ھ میں دحیہ کلبی قیصرِ روم کو اسلام کا پیغام پہنچا کر واپس آرہے تھے تو شامی عربوں نے ان کا مال واسباب لوٹ لیا۔ ۹ھ میں رومیوں نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کیں۔ لیکن جب آنحضرتؐ نے پیشقدمی کر کے مقام تبوک تک پہنچ گئے تو ان کی ہمت پست ہو گئی سنہ ۱۱ھ میں آنحضرتؐ نے اپنی وفات سے چند روز قبل دوبارہ رومیوں کے حملہ کی خبر سن کر اسامہ بن زیدؓ کو شام کی مہم پر مامور فرمایا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں یہ مہم مکمل ہوئی۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ رومی اور ایرانی دونوں عرب کو فتح کرنے کے آرزومند تھے اور اسلام کی روز افزوں ترقی نے انہیں اور بھی بیرونی دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔

عراق کے عربی قبائل میں سے مثنیٰ مسلمان ہو چکے تھے اور ایرانی سلطنت کی غلامی سے آزادی چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے امداد طلب کی آپؓ نے خالد بن ولیدؓ کو مثنیٰ کی کمک پر روانہ کیا۔

حضرت خالدؓ نے عراق پہنچ کر بڑی تیزی کے ساتھ فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا بانقیا اور کسکر وغیرہ فتح کر کے ایرانی سلطنت کی سرحد میں داخل ہو گئے ایرانی سپہ سالار جابان کو شکست دی۔ پھر حیرہ کے بادشاہ نعمان کو مار بھگایا پھر خورنق پر حملہ کیا۔ مگر اہل خورنق نے خراج دینا قبول کر لیا۔ اس طرح عراق کا بڑا حصہ مسخر ہو گیا۔

صحابہؓ سے مشورہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے شام پر کئی طرف سے حملہ کا انتظام کیا۔ چنانچہ ابوعبیدہؓ تسخیر حمص پر یزید بن ابی سفیانؓ تسخیر دمشق پر شرحبیلؓ تسخیر اردن اور عمرو بن عاصؓ تسخیر فلسطین پر مامور ہوئے مجاہدین کی کل تعداد ۲۷ ہزار تھی۔ رومیوں نے مقابلہ کے لیے زبردست تیاری کی تھی، اس لئے مسلمان سرداروں نے مزید کمک کے لئے لکھا چونکہ دارالخلافت میں مزید فوج موجود نہ تھی اس لئے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ کو لکھا کہ شامی مہم پر روانہ ہو جائیں۔

اس حکم کے مطابق خالدؓ عراق کی حکومت مثنیٰ کے سپرد کر کے شام کی طرف روانہ ہوئے اور راستہ میں دشمنوں کو شکستیں دیتے ہوئے شام کی اسلامی مہم سے مل گئے اور متحدہ طاقت سے بصریٰ فحل اور اجنادین کو فتح کیا۔ اجنادین کے معرکہ میں خالدؓ نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اور اس کو سر کرنے کے بعد دمشق کا محاصرہ کیا۔ لیکن دوران محاصرہ میں حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہو گئی۔

ان فتوحات کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں عثمان ابن ابی العاصؓ نے توج، مکران اور نواحی علاقوں کو فتح کیا۔ علاء بن حضرمی نے زرارہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو فتح کیا۔

وفات: خلافت کو سوا دو سال ہوئے تھے کہ ایک دن سخت سردی میں غسل کیا۔ بعد غسل بخار آگیا اور پندرہ دن کے بعد اس قدر ضعیف ہو گئے کہ حضرت عمرؓ نے امامت کے فرائض انجام دیئے جب مایوسی ہو گئی تو صحابہؓ کو بلا کر حضرت عمرؓ کو جانشینی نامزد کیا۔

اس کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ کو بلایا کہ عہد نامہ لکھیں۔ ابتدائی الفاظ لکھوانے کے بعد ابو بکرؓ کو غشی ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ نے یہ دیکھ کر از خود حضرت عمرؓ کا نام لکھ دیا جب ہوش آیا تو پوچھا کیا لکھا ہے؟ انہوں نے پڑھ کر سنایا تو بے ساختہ اللہ اکبر پکار اُٹھے اور کہا عثمانؓ! خدا تمہیں جزائے خیر دے! تم نے میرے دل کی بات لکھ دی۔

آپ نے غلام سے کہا کہ اس عہد نامہ کو مجمع عام میں سُنا دو خود بالا خانہ پر آ کر لوگوں سے کہا کہ میں نے اپنے بھائی یا رشتہ دار کو خلیفہ نہیں بنایا بلکہ اُسے منتخب کیا ہے جو تم میں سب سے بہتر اور برتر ہے۔

اس سے فارغ ہو کر حضرت عائشہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ جو جاگیر میں نے تمہیں دی ہے اس میں دوسرے بھائی بہنوں کو بھی شریک کر لینا۔ بعد ازاں فرمایا کہ بیت المال کے مال میں سے میرے پاس ایک لونڈی اور دو اونٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے میری وفات کے بعد یہ چیزیں عمرؓ کے پاس بھیج دینا۔

اپنی تجہیز تکفین کے متعلق یہ کہا کہ جو لباس میرے بدن پر ہے اسی کو دھو کر دو سرے کپڑوں کے ساتھ کفن دینا۔ آخر دوشنبہ کی شام کو ۶۳ برس کی عمر میں ۱۳ھ میں وفات پائی۔

آپ کی زوجہ اسماءؓ بنت عمیس نے غسل دیا۔ فاروق اعظمؓ نے نماز پڑھائی عثمانؓ طلحہؓ۔ عمرؓ اور عبدالرحمنؓ بن ابی بکرؓ نے قبر میں اتارا۔ آنحضرتؐ کے پہلوئے مبارک میں جگہ پائی۔ اور بعد وفات بھی رفاقت قائم رہی۔

انتظام سلطنت

حضرت ابوبکرؓ نے ملکی نظم و نسق کو بہترین اصولوں پہ قائم کیا اور عہدیداروں کا بہترین انتخاب کیا۔ ملک عرب کو چند صوبوں پہ تقسیم کیا جن کے نام یہ تھے۔ مدینہ، مکہ، طائف، نجران۔ صنعا، حضرموت، دومتہ الجندل اور بحرین۔

عاملوں کے انتخاب میں ہمیشہ ان لوگوں کو ترجیح دی جو آنحضرتؐ کے زمانہ میں عامل رہ چکے تھے۔ جب کسی شخص کو کوئی عہدہ سپرد کرتے تو اسے مناسب ہدایات دیتے۔ مثلاً جب عمرو بن العاصؓ کو محصل بنا کر بھیجا تو نصیحت کی "ہر حال میں تقویٰ اختیار کرنا اللہ تعالیٰ متقی کو ایسی رزق دیتا ہے جو اس کے گمان میں بھی نہیں آسکتا، اور وہ اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

یزید بن سفیان کو شام کی مہم پہ روانہ کیا تو فرمایا "اپنی امارت سے اپنے رشتہ داروں کو فائدہ نہ پہنچانا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے جو شخص والی ہو کر اپنے رشتہ داروں کو استحقاق کے بغیر عہدہ دے اس پہ خدا کی لعنت ہو۔"

حضرت ابوبکرؓ اپنی ذاتی رحم دلی کے باوجود حکام کی سخت نگرانی کرتے اگر کسی عامل سے کوئی قصور سرزد ہوتا تو سختی کے ساتھ باز پرس کرتے چنانچہ خالد بن ولیدؓ نے مالک بن نویرہ کے بھائی کو زبانی ہدایت سے پہلے ہی قتل کر دیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان سخت عتاب کیا۔

حضرت ابوبکرؓ نہیت رحمدل تھے لیکن رعایا کے جان و مال کی حفاظت کے معاملہ میں کسی کوتاہی نہ کی جرائم کی سزائیں متعین کر دیں مثلاً شرابی کے لئے چالیس دروں کی سزا ایسے ہی دوسری سزائیں۔ کوئی شخص امن عامہ کو خراب کرتا تو اسے نہایت سخت سزا دیتے۔ مثلاً عبداللہ بن ایاس مشہور ڈاکو تھا۔ انہوں نے اسے گرفتار کرایا اور آگ میں جلوا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا ملک راہزنی سے محفوظ ہو گیا۔

مالی انتظام: ابتدا میں صیغہ مال کا کوئی باقاعدہ محکمہ نہ تھا۔ مختلف ذرائع سے جو رقوم آتیں فوراً تقسیم کر دی جاتی تھیں چنانچہ پہلے سال ہر شخص کو دس دس درہم اور دوسرے سال بیس بیس درہم عطا کئے۔ ایک شخص نے اس مساوات پر اعتراض کیا تو جواب دیا ذاتی بزرگی کو رزق کی کمی بیشی سے کوئی تعلق نہیں۔

آخر عہد حکومت میں بیت المال تعمیر کرایا۔ لیکن اس میں کوئی بڑی رقم جمع نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المال کے دروازہ پر کوئی محافظ نہ تھا صرف ایک قفل تھا وفات کے بعد بیت المال سے صرف ایک درہم برآمد ہوا۔

فوجی انتظام: حضرت رسول اکرم کے زمانہ میں کوئی باضابطہ فوجی شعبہ نہ تھا یہی صورت خلیفہ اول کے زمانہ میں تھی۔ مگر انہوں نے اتنا اضافہ کیا کہ جب کوئی فوج روانہ ہوتی تو اسے قبائل کے اعتبار سے مختلف دستوں میں تقسیم کر کے ہر دستہ پر ایک افسر مقرر کر دیتے اور پوری فوج پر ایک امیر الامرا (سپہ سالار) ہوتا۔

دستہ بندی کی بدولت مسلمانوں کو رومیوں کی باقاعدہ فوج کے مقابلہ میں بڑی مدد ملی۔ خالد بن ولیدؓ نے تعبیہ کا طریقہ ایجاد کیا۔ یعنی ہر دستہ کی جگہ، اور اس کا فرض متعین کر دیا جاتا۔ اس کی بدولت بدنظمی کبھی نہ ہوتی۔

صدیق اکبرؓ نے ہمیشہ فوج کی اخلاقی حالت کو بلند کرنے کی کوشش کی چنانچہ جب ملک شام پر فوج کشی ہوئی تو سپہ سالار سے کہا۔

"راہبوں اور زاہدوں سے تعرض نہ کرنا عورت بچے۔ بوڑھے کو قتل نہ کرنا۔ پھلوں والے درختوں کو نہ کاٹنا۔ کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا۔ اونٹ اور بکریوں کو بلاوجہ ذبح نہ کرنا۔ ہرے بھرے کھیتوں اور باغوں کو نہ جلانا۔ غنیمت میں خیانت نہ کرنا۔

اہلبیت کا خیال: چونکہ آنحضرت کے قرضوں کا ادا کرنا اور وعدوں کا پورا کرنا بھی خلیفہ کے فرائض میں داخل تھا۔ اس لئے جب بحرین کی فتح کے بعد مال غنیمت مدینہ آیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اعلان کیا کہ آنحضرت کے ذمہ کسی کا کچھ نکلتا ہو یا آپ نے کسی سے

کوئی وعدہ فرمایا تو میرے پاس آئے چنانچہ حضرت جابرؓ نے کہا کہ آنحضرت ابوبکرؓ نے اس کے مطابق انہیں تین مرتبہ دونوں ہاتھوں سے عطا کیا۔

اگرچہ باغ فدک اور خمس کے تنازعہ کی وجہ سے آنحضرتؐ کے اقربا میں کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی بخصوصاً حضرت فاطمہؓ کو اس وجہ سے بہت ملال ہوا تھا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ہمیشہ ان کے ساتھ بڑی مہربانی کا برتاؤ کیا اور وفات کے وقت ان سے معذرت کر کے ان کا دل بالکل صاف کر دیا۔

ذمیوں سے سلوک:۔ عہد نبوتؐ میں جن غیر مذاہب کے لوگوں کو پناہ دی گئی اور ان کے حقوق متعین کئے گئے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کی توثیق کی، اور جو نئے ملک فتح ہوئے ان کی ذمی رعایا کو مسلمانوں کے برابر حقوق عطا کیے چنانچہ اہل حیرہ سے جو معاہدہ ہوا۔ اس میں صراحت کی گئی کہ ان کے گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے۔ ان کو ناقوس بجانے کی اجازت ہو گئی۔ وہ اپنی عید کے موقع پر صلیبوں کا جلوس بھی نکال سکیں گے۔

اگرچہ ذمی رعایا سے جزیہ لیا جاتا تھا۔ مگر اس کی شرح بہت کم تھی جزیہ صرف صاحب استطاعت لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حیرہ کے سات ہزار ذمیوں میں سے ایک ہزار آدمی جزیہ سے مستثنیٰ تھے۔ باقی ماندہ افراد سے صرف دس درہم سالانہ وصول کیا جاتا تھا اور یہ رعایت بھی دی گئی تھی کہ جو ذمی ضعیف معذور یا مفلس ہو جائے گا۔ اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا بلکہ بیت المال سے اس کی امداد کی جائے گی۔

خود لفظ ذمی دراصل ،،اہل الذمہ،، کا خلاصہ ہے، یعنی وہ غیر مسلم رعایا جس کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر لازم اور واجب ہے چنانچہ طریقہ یہ تھا کہ دشمنوں سے مقابلہ کے وقت ان سے فوجی خدمات نہ لی جاتیں بلکہ ذمی (غیر مسلم رعایا) مستثنیٰ ہوتی اگر یہ خود جنگ میں شریک ہوتے تو جزیہ چھوڑ دیا جاتا۔ گویا حفاظت کا ٹیکس تھا۔ جزیہ کے مقابل مسلمان صدقات اور زکوٰۃ کئی گنا زیادہ ادا کرتے تھے۔

تدوینِ قرآن :

حضرت ابوبکرؓ کی سب سے بڑی خدمت جمع و تدوینِ قرآن ہے ۔ یمامہ کی لڑائی میں بہت سے حفاظِ قرآن شہید ہو گئے ۔ اس لیے حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا کہ خدانخواستہ یوں تمام حفاظِ قرآن شہید ہو گئے تو قرآن کا کچھ حصہ ضائع نہ ہو جائے ۔ اس بنا پر انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو قرآن کریم کی حفاظت یعنی جمع و ترتیب کا مشورہ دیا چنانچہ انہوں نے زید بن ثابتؓ کو جو کاتبِ وحی رہ چکے تھے اس خدمت پر مامور کیا ۔ انہوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ متفرق اجزا کو جمع کر کے کتاب کی شکل میں مدون کر دیا ۔

جمع و ترتیب قرآن کے متعلق عام غلط فہمی یہ ہے کہ عہدِ نبوت میں کلام مجید کی آیتوں اور سورتوں میں کوئی ترتیب نہیں تھی اور نہ سورتوں کے نام رکھے گئے تھے اور یہ سب کام حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں ہوا ۔ یہ ایک افسوسناک غلط فہمی ہے دراصل جس طرح قرآن کریم کی ہر آیت الہامی ہے اسی طرح آیتوں اور سورتوں کی ترتیب اور ان کے نام بھی الہامی ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تھی ۔ تو صحابہؓ ان کو ہڈی ۔ چمڑے ، پتھر وغیرہ پر لکھ لیتے تھے اور آنحضرتؐ کی ہدایت کے مطابق ترتیب دیتے جاتے تھے کبھی دو سورتیں ایک ساتھ نازل ہوتی تھیں اور آنحضرتؐ دونوں کو الگ الگ لکھواتے جاتے تھے ۔ یعنی آپؐ کی زندگی ہی میں تمام سورتیں مدون ہو چکی تھیں اور ان کے نام بھی رکھے جا چکے ہیں ۔

حضرت ابوبکرؓ نے صرف یہ کیا کہ ان متفرق اجزاء کو جمع کر کے ایک کتاب کی صورت میں مدون کر دیا ۔ تاکہ متفرق اجزاء کی وجہ سے بعد میں کسی وقت کوئی غلط فہمی یا تلاوت اور ترتیب میں اختلاف نہ پیدا ہو ۔

حضرت زید بن ثابتؓ کا مرتب شدہ یہ نسخہ حضرت ابوبکرؓ کی تحویل میں رہا ۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ کے قبضہ میں رہا ۔ بوقت وفات انہوں نے اس نسخہ کو اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے سپرد کر دیا اور وصیت کر دی کہ کسی کو نہ دیں لیکن جو چاہے نقل کرے ۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کی چند نقلیں کرا کے مختلف مقامات پر روانہ کیں۔

اہم کارنامے:- آپ نے زمانۂ خلافت میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے وہ قیامت تک نہیں مٹ سکتے۔

(ا) آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ثقیف اور قریش کے علاوہ تقریباً تمام عرب باغی ہو گیا تھا۔ لیکن انہوں نے تمام باغیوں کی سرکوبی کر کے اسلامی حکومت دوبارہ قائم کی۔

(ب) مدعیان نبوت نے اسلام کی شمع کو گل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر انہوں نے نہ صرف اس شمع کو گل ہونے سے بچایا بلکہ پھر دوبارہ تمام عرب کو اس کی روشنی سے منور کر دیا۔

(ج) منکرین زکوٰۃ مدینہ کو لوٹنے کے درپے ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے ان کی سرکوبی کر کے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے فرد کر دیا۔

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت کے بعد انہوں نے اسلام کو دوبارہ زندہ کیا۔ اور دنیائے اسلام پر ان سے زیادہ کسی فرد کا احسان نہیں ہے۔

(د) اسلام میں جمہوریت کی بنیاد سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ ہی نے ڈالی خود ان کا انتخاب جمہوری طریقہ سے ہوا۔ اور انہوں نے ہر معاملہ میں جمہور سے مشورہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صاحب رائے صحابہؓ کو ہمیشہ دارالخلافت میں رکھا اور سب کام ان کے مشورہ سے کئے۔ جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تھا۔ تو وہ تمام اکابر صحابہؓ مثلاً عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، معاذ بن جبل طلحہؓ، زبیرؓ عبدالرحمن بن عوفؓ اور زید بن ثابت سے مشورہ کرتے تھے۔

(ھ) ایک طرف آپ نے ملکی انتظامات بہترین طور پر کئے دوسری طرف فتوحات سے بھی غافل نہ رہے۔ عراق، شام اور سرحدی علاقوں میں مسلسل فتوحات ہوئیں اور اسلامی خلافت کی سرحدیں دور دور تک پھیل گئیں۔

(۹) ان فتوحات کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام اور خدمت اسلام کا کام پوری قوت سے جاری رکھا۔ قرآن مجید کی جمع و تدوین آپ ہی کے عہد میں ہوئی۔ آپ نے دور و نزدیک اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ قائم کیا۔

سیرت و کردار: حضرت ابوبکرؓ پیدائشی طور پر نیک نہاد تھے، شراب اور فسق و فجور سے کوسوں دور تھے۔ فیاضی، غریب نوازی اور ہمدردی میں مشہور تھے جب سرکار دو عالم کی صحبت نصیب ہوئی اور دولت ایمان سے مالا مال ہوئے تو یہ تمام خوبیاں اور بھی چمک گئیں۔

زمانہ جاہلیت میں ایک شخص انہیں نامعلوم راستہ سے لے چلا راہ میں کہنے لگا کہ اس راستہ میں بڑے بدکار لوگ رہتے ہیں، یہ سنکر الٹے پاؤں واپس ہو گئے اور کہا کہ میں ایسے گندے راستہ سے گذرنا پسند نہیں کرتا۔

ایک دن ان کے غلام نے کھانے کی کوئی چیز پیش کی جب کھا چکے تو اس نے کہا کہ میں نے ایک شخص کی جھوٹی فال کھولی تھی اس نے اس کے صلہ میں یہ کھانا مجھے دیا، یہ سن کر منہ میں انگلی ڈال کر سب کھانا نکال دیا فرماتے تھے کہ لقمہ حرام جہنم میں لے جاتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت ربیعہؓ کو ایسا جملہ کہہ دیا جو انہیں ناگوار ہوا لیکن جب غصہ فرو ہو گیا تو ان سے کہا تم بھی مجھے کوئی ایسی ہی بات کہہ دو۔ انہوں نے انکار کیا تو آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ربیعہؓ بھی ساتھ تھے۔ آنحضرتؐ نے ربیعہؓ سے فرمایا تم کوئی سخت بات مت کہو بلکہ یہ کہو خدا کہ ابوبکرؓ! خدا تمہیں معاف کرے۔ حضرت ابوبکرؓ پر اس واقعہ کا اس درجہ اثر ہوا کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

جاہ پسندی اور دنیا طلبی سے بالکل نفرت تھی۔ خلافت کا بوجھ انہوں نے محض اس لیے اٹھایا کہ وہ امت کو تفرقہ سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ وفات کے بعد جب جائزہ لیا گیا۔ تو بیت المال کی طرف یہ چیزیں زیادہ نکلیں۔ ایک غلام، ایک کنیز اور دو اونٹنیاں جب یہ چیزیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیجی گئیں تو انہوں نے رو کر کہا۔ ابوبکرؓ! تم پر خدا کی رحمت ہو تم نے مرنے کے بعد

میں زہد کا دامن نہ چھوڑا اور کسی کو نکتہ چینی کا موقع نہ دیا۔

خلیفہ ہونے سے پہلے بھیڑ بکریاں خود چراتے اور محلہ والوں کی بکریاں بھی دودھ دیا کرتے جب خلیفہ ہو گئے تو محلہ کی ایک عورت نے کہا "اب ہماری بکریاں کون دوہے گا؟" فرمایا تم فکر مت کرو۔ میں یہ کام اسی طرح انجام دوں گا۔ جس طرح قبل ازیں دیا کرتا تھا۔

اللہ کی راہ میں ان سے زیادہ کسی صحابی نے اپنا مال صرف نہیں کیا۔ سرکار دو عالم فرماتے ہیں۔ کہ "ابوبکرؓ کے مال سے زیادہ کسی کے مال نے مجھے نفع نہیں دیا" جب کبھی آنحضرتؐ فرماتے کہ "بلحاظ مال و جان ابوبکرؓ سے بڑھ کر کسی کا مجھ پر احسان نہیں ہے۔ تو آبدیدہ ہو کر عرض کرتے "یا رسول اللہ۔ میری جان اور مال سب حضور ہی کے لیے ہے"

ان کی ساری زندگی مخلوق الٰہی کی خدمت میں بسر ہوئی۔ محلہ والوں کا کام کرتے بیماروں کی تیمارداری کرتے۔ ضعیفوں کی خدمت میں انہیں خاص مسرت حاصل ہوتی تھی۔ مدینہ کے باہر ایک اندھی عورت رہتی تھی۔ حضرت عمرؓ صبح کے وقت اس کی خدمت کرنے جایا کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے دیکھا کہ کوئی شخص ان سے بھی پہلے اس کا کام کر جاتا ہے۔ ایک دن قبل از وقت آئے تو دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ خدمت سے فارغ ہو کر جھونپڑی سے نکل رہے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ اکثر ساری ساری رات نماز پڑھتے تھے اور آئے دن روزہ رکھتے تھے۔ نماز میں بہت وقت طاری ہوتی تھی۔ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت بھی آنسو رواں ہو جاتے تھے، درختوں اور پرندوں کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کاش میں درخت یا پرند ہوتا تو عاقبت کے جھگڑوں سے چھوٹ جاتا۔

ان کا ذریعہ معاش تجارت تھا اور اسی کی بدولت انھوں نے لاکھوں درہم کماتے اور راہ خدا میں صرف کیے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے میں قریش میں سب سے بڑا تاجر تھا۔ جب وہ خلیفہ ہوئے تو تجارت کے لیے ان کے پاس بالکل وقت نہیں رہا۔ اس لیے صحابہؓ نے ان کے لیے روزینہ (خرچ خوراک اور خرچ لباس) مقرر کر دیا۔

فضائل و مناقب: حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کی نگاہوں میں بہت محبوب اور محرم اسرار

تھے۔ مکہ میں آنحضرتؐ روزانہ ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ اس خصوصیت میں کوئی صحابی ان کا شریک نہیں ہے۔

ہجرت کے سفر میں آنحضرتؐ نے ان کو شرف معیت عطا فرمایا چنانچہ دنیا انہیں "یار غار" کے لقب سے جانتی پہچانتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ ساری زندگی حضورؐ کی رفاقت میں بسر ہوئی۔ وفات کے بعد بھی حضورؐ کی رفاقت نصیب ہوئی۔

آنحضرتؐ نے فرمایا "جتنا نفع میں نے ابوبکرؓ کے مال سے اٹھایا اس قدر نفع کسی کے مال سے نہیں اٹھایا۔"

مختلف قبیلوں کے ناموں اور ان کے نسب کو یاد رکھنا عربوں کا مایۂ ناز فن تھا اور صدیق اکبرؓ اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی نسب دانی سے تبلیغ اسلام میں بہت کام لیا۔ جب آنحضرتؐ کے ساتھ تبلیغ کے لیے مختلف قبیلوں میں جاتے تھے تو آپ کا تعارف لوگوں سے کراتے تھے۔

اسی طرح خواب کی تعبیر دینے میں خداداد ملکہ تھا حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کی وفات سے پہلے خواب میں تین چاند اپنے حجرے میں گرتے دیکھے۔ باپ سے تعبیر پوچھی، تو خاموش ہو گئے جب حضورؐ ان کے حجرہ میں مدفون ہوئے تو کہا "عائشہ! یہ ان چاندوں میں سے پہلا چاند ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ چونکہ سفر اور حضر میں آنحضرتؐ کے ساتھ رہتے تھے اور ہر معاملہ میں مشیر اور معاون تھے اس لئے وہ اکثر و بیشتر آیات کی شان نزول اور ان کے مفہوم سے آگاہ تھے۔ یوں بھی قرآن حکیم سے ان کو غیر معمولی شغف تھا اور اکثر آنحضرتؐ سے مشکل آیات کی تفسیر دریافت کرتے رہتے تھے۔ آپ نے ان احادیث کو خاص طور سے شائع کیا جن کا تعلق شرعی مسائل سے تھا۔ مثلاً نصاب زکوٰۃ کا مفصل ہدایت نامہ تمام صوبوں میں مشتہر کیا۔

جب خلافت کا مسئلہ درپیش تھا۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے اس حدیث سے استنباط کیا "الائمۃ من القریش" یعنی امام قریش میں سے ہوں گا۔ جب مدفن رسول کا سوال پیدا ہوا تو انہوں نے یہ حدیث پیش کی "انبیاء کی جائے وفات ہی ان کا مدفن ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد اعلان کر دیا کہ میں انبیاء کی طرح معصوم نہیں ہوں۔ اس لئے اگر مجھ میں کوئی کجی دیکھو تو سیدھا کر دو۔ ایک شخص نے خلیفۃ اللہ کہہ کر خطاب کیا تو کہا میں خلیفۃ اللہ نہیں ہوں بلکہ خلیفۃ رسول ہوں۔

ان کی عدالت میں جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو پہلے قرآن حکیم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اگر اس مقدمہ کے متعلق اس میں کوئی حکم مذکور ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ ورنہ سنتِ رسول کی طرف رجوع کرتے تھے اور اگر اس میں بھی کوئی حکم نہ ملتا تو پھر مسلمانوں سے دریافت کرتے تھے۔

قرآنی آیات میں اپنی رائے کو دخل نہیں دیتے تھے۔ بلکہ فرمایا کرتے کہ اگر میں قرآن میں خواہ مخواہ رائے زنی کروں تو کونسی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا؟ ایک دفعہ ایک مقدمہ کا فیصلہ اپنے قیاس سے کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر میری رائے صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری طرف سے۔

خلیفہ دوم

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

جمادی الثانی سنہ ۱۳ھ تا ذوالحجہ سنہ ۲۳ھ

بمطابق

اگست سنہ ۶۳۴ء تا نومبر سنہ ۶۴۴ء

حضرت عمر فاروق رضؓ

ابتدائی حالات:- عمر نام، ابوحفص کنیت، فاروق لقب، باپ کا نام خطاب تھا۔ خاندان جاہلیت میں بھی ممتاز تھا۔ منازعات میں ثالثی اور ملکی معاملات میں سفارت انہی کے خاندان سے مخصوص تھی۔ آپ کے نانا مغیرہ بھی بہت معزز شخص تھے فوج کا اہتمام انہی کے سپرد ہوتا تھا۔

حضرت عمرؓ ہجرت سے ۴۰ سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ بچپن اور جوانی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ جوانی میں لکھنا پڑھنا سیکھا۔ اس کے بعد علم الانساب، سپہ گری، پہلوانی شہسواری، تیغ زنی اور خطابت میں مہارت پیدا کر کے ناموری حاصل کی۔

اس کے بعد تجارت کا سلسلہ شروع کیا۔ اور دور دراز ممالک کا سفر کر کے بہت سے تجربے حاصل کیے۔ خودداری، غیرت، بلندی حوصلہ، تجربہ کاری، معاملہ فہمی اور خطابت کے اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے۔ اس لیے جب قبائل میں کوئی جھگڑا ہوتا تو قریش کی طرف سے سفیر بن کر جاتے۔

جب ۲۷ سال کے ہوئے تو اسلام کا آغاز ہوا۔ چونکہ طبیعت میں بہت زیادہ سختی تھی، اس لیے جن کی نسبت یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ مسلمان ہو گیا ہے اس کے دشمن ہو جاتے۔

✓ ابوجہل اور عمرؓ دونوں اسلام کے شدید ترین مخالف تھے۔ اس لیے آنحضرت یہ دعا کیا کرتے تھے کہ "اے اللہ! اسلام کو ابوجہل یا عمر بن الخطاب کے مسلمان ہو جانے سے معزز فرما"

✓ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی دعا حضرت عمرؓ کے حق میں قبول فرمائی اور ۶ بنوی میں حضرت عمرؓ نے اپنے قبول اسلام کا اعلان کر دیا۔ ارباب سیرت لکھتے ہیں کہ آپ چالیسویں مسلمان تھے۔

✓ آپ کے اسلام قبول کرنے سے اسلام کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اس وقت تک اگرچہ ۴۰-۵۰ آدمی اسلام لا چکے تھے۔ لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ کعبہ میں جا کر نماز

پڑھ سکیں۔ لیکن جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو انہوں نے آنحضرت کی خدمت میں عرض کی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کفار تو اعلانیہ کعبہ میں بت پرستی کریں۔ اور ہم خدا کی عبادت نہ کر سکیں، چنانچہ انہوں نے مشرکین تمام مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں نماز پڑھی۔

غزوات میں شرکت:۔ ہجرت مدینہ کے بعد حضرت عمرؓ نے تمام غزوات میں شرکت کی۔ غزوۂ بدر میں اپنی جانبازی اور ثابت قدمی کی بنا پر آپ آنحضرتؐ کے معاون اور مددگار رہے، حضرت عمرؓ اسلام کے مقابلہ میں خاندانی تعلقات سے قطعاً متاثر نہیں ہوتے تھے۔ اسی لیے میدان جنگ میں ان کی تلوار سے ان کے رشتے کا ماموں عاص بن وائل بھی نہ بچ سکا۔

فتح کے بعد آنحضرتؐ نے قیدیوں کے متعلق مشورہ کیا حضرت عمرؓ نے یہ رائے دی کہ سب کو قتل کر دینا چاہیئے۔ اگرچہ آنحضرت نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق کیا اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا مگر حضرت عمرؓ کی یہ رائے آپ کے جوش ایمانی کی دلیل تھی۔

۳ھ ہجری میں احد کی جنگ ہوئی۔ آنحضرتؐ نے پچاس تیر اندازوں کو درہ کے سرے پر متعین کر دیا تھا کہ خواہ فتح ہو یا شکست، تم اس جگہ سے نہ ہلنا جب تک میں حکم نہ دوں۔ کفار نے بھاگنا شروع کیا تو مسلمانوں نے غنیمت جمع کرنی شروع کر دی تیر اندازوں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ان کے ہٹتے ہی خالد بن ولید نے دفعتاً عقب سے پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا، مسلمان غافل تھے۔ فتح شکست میں بدل گئی۔

آنحضرتؐ کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی، مسلمانوں نے اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر حفاظت کا فرض انجام دیا جب خالد کو کچھ سپاہیوں کے ساتھ ادھر آتے دیکھا تو فرمایا۔ "اے خدا! یہ لوگ ادھر نہ آنے پائیں" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کچھ مہاجرین اور انصار کو ساتھ لے کر آگے بڑھ کر حملہ کیا اور لوگوں کو دفع کر دیا۔

۵ھ میں یہود اور مشرکین عرب نے مدینہ پر حملہ کیا۔ آنحضرتؐ نے مدینے سے باہر نکل کر خندق کھدوائی۔ ۲۴ ہزار کفار نے خندق کا محاصرہ کیا محاصرہ کیا آنحضرت نے خندق کے ادھر

اُدھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ آزمودہ کار صحابہؓ کو متعین کر دیا کہ دشمن ادھر نہ آسکے۔ ایک حصہ پہ حضرت عمرؓ متعین تھے۔ ایک دن کفار کے مقابلہ میں ان کو اس قدر مصروف رہنا پڑا کہ نماز عصر قضا ہوتے ہوتے رہ گئی۔

سنہ ۶ ہجری میں آنحضرت نے طواف کعبہ کا عزم فرمایا۔ کچھ دور جا کر حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ دشمنوں میں بالکل غیر مسلح جانا سراسر خلافِ مصلحت ہے۔ آنحضرت نے ان کی رائے سے اتفاق کر کے مدینہ سے ضروری اسلحہ منگوا لیا۔

قریش نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ طویل گفت و شنید کے بعد طرفین میں معاہدہ ہو گیا جس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر قریش کا کوئی آدمی مدینہ چلا جائے گا تو واپس کرنا ہو گا۔ لیکن مدینہ سے کوئی مسلمان مکہ چلا جائے گا تو قریش کو اختیار ہو گا کہ واپس کریں یا نہ کریں۔ حضرت عمرؓ کو یہ شرط گوارا نہ ہوئی اس لیے آنحضرتؐ سے عرض کی کہ جب ہم حق پہ ہیں تو دب کر صلح کیوں کریں؟ آنحضرت نے فرمایا کہ میں حکم خداوندی کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا۔

صلحنامہ پر دستخط ہو جانے کے بعد آنحضرتؐ مدینہ کی طرف واپس روانہ ہوئے راستہ میں سورۂ فتح نازل ہوئی۔ آنحضرت نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا۔ آج ایسی سورت نازل ہے جو مجھے اس کائنات کی تمام اشیاء سے زیادہ محبوب ہے۔

سنہ ۷ھ میں خیبر کی جنگ ہوئی۔ یہود نے یہاں بہت سے مضبوط قلعے بنائے ہوئے تھے۔ پہلے حضرت ابوبکرؓ کو سرداری ملی۔ بعد ازاں حضرت عمرؓ سپہ سالار مقرر ہوئے۔ لیکن فتح حضرت علیؓ کے لیے مقدر ہو چکی تھی۔ آنحضرتؐ نے خیبر کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی۔ حضرت عمرؓ کے حصہ میں جو قطعہ زمین آیا اسے انہوں نے اللہ کی راہ میں وقف کر دیا۔ اسلامی تاریخ میں یہ پہلا وقف تھا۔

سنہ ۸ھ میں آنحضرتؐ نے مکہ کا قصد فرمایا اور بڑے جاہ و جلال سے مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ خانہ خدا کو بتوں سے پاک کرنے کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت عمرؓ کو ساتھ لے کر مقام صفا میں لوگوں سے بیعت لی۔ مردوں کی بیعت ہو چکی تو آپ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا

کہ میری طرف سے عورتوں کی بیعت لیں۔

سنہ ۹ ھ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر آنحضرتؐ نے تمام صحابہؓ کو تیاری کا حکم دیا۔ اور سامان جنگ فراہم کرنے کے لیے مالی امداد طلب فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر اپنا نصف مال حضورؐ کی خدمت میں لاکر حاضر کر دیا۔

انتخاب خلافت :۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے جب آخری ایام تھے تو صحابہ کرامؓ نے مشورہ دیا کہ وہ کسی کو اپنی جانشین نامزد کریں۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ یوں تو عمر ہر طرح موزوں ہیں مگر مزاج میں سختی بہت ہے بعض دوسرے حضرات نے بھی یہی خیال ظاہر کیا۔ مثلاً حضرت طلحہؓ نے درشتی اور سخت مزاجی کا خدشہ ظاہر کیا۔ ایک صحابی نے عرض کیا کہ آپ جان بوجھ کر ایک سخت آدمی کو ہم پر مسلط کر رہے ہیں کل خدا کو اس بارے میں کیا جواب دیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ میں عرض کروں گا خدایا میں نے تیرے بندوں میں سے ایسے شخص کا انتخاب کیا تھا جو اس منصب کے لئے سب سے زیادہ اہل تھا حضرت عثمانؓ نے یہ رائے دی ان کا باطن ظاہر سے اچھا ہے حضرت ابوبکرؓ نے سب سے یہی کہا کہ جب خلافت کا بار پڑے گا تو خود بخود نرم ہو جائیں گے۔

فتوحات

حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے تو عراق اور شام دونوں محاذوں پر جنگ جاری تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان مہارت کی تکمیل کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

فتوحات عراق :۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے مہم عراق کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ جو لوگ بیعت خلافت کے لیے مختلف مقامات سے آئے ہوئے تھے انہیں جہاد پر آمادہ کیا۔ مثنیٰ شیبانی اور ابو عبیدہ کو سپہ سالار بنا کر روانہ کیا۔

ایرانیوں کو اطلاع ملی تو ان کی ملکہ پوران دخت نے رستم کو وزیر جنگ بنایا اور تمام قوم

کو مقابلہ پر آمادہ کیا۔ رستم نے ان تمام مقامات پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ جو خلیفہ اوّل کے زمانہ میں فتح ہوئے تھے۔ ملکہ ایران نے رستم کی مدد کے لیے ایک اور فوج تیار کی اور جابان کو اس کا سپہ سالار بنایا۔

ایران کے دوسرے سپہ سالار جابان کی فوج سے نمارق میں ابوعبیدہ کی فوج کا مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں نے فتح حاصل کی۔ جابان گرفتار ہوا۔ لیکن۔ اس نے اپنے گرفتار کرنے والے سے کہا کہ میں بوڑھا سپاہی ہوں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں گا؟ میرے بدلے دو جوان لے لو اور مجھے رہا کر دو۔ وہ مسلمان جابان کو پہچانتا نہ تھا۔ راضی ہو گیا۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ یہ ایرانی فوج کا سپہ سالار ہے تو انہوں نے اس کے قتل کا مطالبہ کیا۔ مگر ابوعبیدہؓ نے کہا کہ اسلام بدعہدی کی اجازت نہیں دیتا۔ جابان کو بحفاظت اس کے لشکر میں پہنچا دیا گیا۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے جابان کی فوج کو شکست دینے کے بعد نرسی کی فوج کو بھی شکست دی۔ نرسی ایران کا ایک مشہور بہادر سپہ سالار تھا۔ ان دونوں سپہ سالاروں کی شکست کے بعد رستم نے بہمن کو چار ہزار فوج دے کر ابوعبیدہؓ کے مقابلہ پر بھیجا۔ ابوعبیدہؓ نے دریائے فرات کو عبور کر کے غنیم کا مقابلہ کیا۔ بہمن اپنے ساتھ جنگی ہاتھی لایا تھا۔ مسلمان اُن کا مقابلہ نہ کر سکے اور بُری طرح شکست کھائی۔

حضرت عمرؓ شکست کی خبر سن کر بہت افسردہ خاطر اور غضب ناک ہوئے انھوں نے اپنے خطبوں سے تمام مسلمانوں کے قلوب گرمائے۔ عرب کے عیسائی بھی ایرانیوں کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو گئے حضرت عمر فاروقؓ نے جریر بجلی کے زیر کمان ایک بڑی فوج ابوعبیدہ کی اعانت کے لیے روانہ کی۔ مسلمانوں کے دوسرے سپہ سالار مثنیٰ نے بھی بھاری جمعیت فراہم کی۔ دونوں فوجیں شکست کا بدلہ لینے کے لیے آگے بڑھیں۔

ملکہ ایران نے یہ خبر سنی تو مہران کی ماتحتی میں ۱۲ ہزار جوان مقابلہ کے لیے روانہ کیے۔ حیرہ کے قریب زور کا رن پڑا۔ ایرانی شکست کھا کر بھاگے مہران ایک مسلمان نوجوان کے

ہاتھ سے مارا گیا۔ اس فتح کے بعد مسلمان ایک کثیر علاقے پر قابض ہو گئے۔

جب ایران کے پایہ تخت میں یہ خبریں پہنچیں تو ملک کے سرداروں نے ملکہ کو تخت سے اتار کر سولہ سالہ یزدگرد کو اپنا بادشاہ بنایا اور عراق میں مسلمانوں کے خلاف دوبارہ بغاوت برپا کرا دی۔ چنانچہ عراق و عجم خالی کر کے مثنیٰ مجبوراً پھر عرب کی سرحد میں داخل ہو گئے۔

جنگ قادسیہ: حضرت عمرؓ نے جب عراق میں بغاوت کی خبر سنی تو سعد بن ابی وقاصؓ کو جو اکابر صحابہؓ میں سے تھے ۲۰ ہزار مجاہدین کے ساتھ عراق کی مہم پہ مامور کیا۔ اپنی ابتدائی زندگی میں حضرت عمرؓ بارہا تجارت کے سلسلہ میں عراق کا سفر کر چکے تھے۔ وہ تمام مقامات سے واقف تھے۔ انھوں نے سپہ سالار اسلامی کو تمام ضروری ہدایات بھی دیں مثلاً یہ کہ قادسیہ کو میدان جنگ بنایا جائے۔ مورچے اس طرح قائم کیے جائیں کہ عرب کا پہاڑ پشت پر حفاظت کے لیے ہو۔ اور ایرانی سرزمین سامنے ہو وغیرہ۔

حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایات کے مطابق پہلے حضرت سعدؓ نے چودہ آدمیوں کو سفیر بنا کر ایرانی دربار میں بھیجا کہ بادشاہ کو اسلام کی دعوت دیں۔ لیکن یہ سفارت ناکام واپس آگئی۔

قادسیہ سے کچھ فاصلہ پر ساباط میں رستم ۱۰۰ ہزار فوج لیے پڑا تھا۔ اور مقابلہ سے جی چرا رہا تھا۔ یزدگرد کے اصرار سے مقابلہ کے لیے بڑھا۔ اور قادسیہ میں خیمہ زن ہوا۔ یہاں پہنچ کر اس نے مصالحت کی کوشش کی۔ چونکہ وہ مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ کر چکا تھا۔ مسلمانوں نے تین صورتیں پیش کیں۔ "یا اسلام قبول کرو۔ یا جزیہ دو یا مقابلہ کرو"۔ رستم پہلی شرطوں میں سے کسی شرط پہ راضی نہ ہوا۔ بلکہ اس نے اعلان جنگ کر دیا۔

جنگ قادسیہ تاریخ اسلامی میں بڑی اہم ہے۔ کیونکہ اس جنگ نے ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ رستم نے صبح کے وقت جنگ شروع کی۔ تمام دن گھمسان کا رن پڑا۔ جب تاریکی پھیلنے لگی تو دونوں فوجیں اپنے اپنے خیموں میں واپس آگئیں۔ قادسیہ کے پہلے معرکہ کو یوم الارماث کہتے ہیں۔

دوسرے دن پھر جنگ شروع ہوئی۔ اس معرکہ میں شام کی چھ ہزار فوج بھی شامل ہو گئی،

اس دن حضرت عمرؓ کے قاصد تحائف لے کر پہنچے کہ جو لوگ لڑائی کا حق ادا کریں گے انھیں یہ تحفے دیئے جائیں گے۔ شام تک زبردست لڑائی ہوئی۔ دس ہزار ایرانی مارے گئے۔ دوسرے دن کے معرکہ کو "یوم الاغواث" کہتے ہیں۔

مسلمانوں کو اس سے قبل ایک بار ہاتھیوں سے بہت نقصان پہنچا تھا۔ اس لیے انھوں نے ہاتھیوں کو بےکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت سے بہادروں نے ہاتھیوں کو نرغے میں لے کر برچھے مار مار کر ان کی آنکھیں اور سونڈیں بیکار کیں۔ قعقاع نے سب ہاتھیوں کے سردار "پیل سفید" کو سونڈ کاٹ کر بھگا دیا۔ اس کو بھاگتے دیکھ کر سارے ہاتھی الٹے بھاگ کھڑے ہوئے۔

تمام دن جنگ جاری رہی۔ لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔ شام ہونے پر بھی جنگ نہ رکی بلکہ رات کی تاریکی میں بھی جاری رہی۔ رستم نے تمام رات مقابلہ کیا۔ لیکن زخموں سے عاجز ہو کر صبح راہ فرار اختیار کر لی۔ ہلال نامی ایک مسلمان سپاہی نے اس کا تعاقب کر کے ہی وار میں کام تمام کر دیا۔ رستم کی موت نے سلطنت ایران کا بھی فیصلہ کر دیا۔

فتوحات ایران

جنگ قادسیہ میں فتح یاب ہونے کے بعد مسلمانوں نے پے در پے بابل، کوثی، بہرہ ایسان کے دارالحکومت مدائن پر قبضہ کر لیا۔ ایرانیوں نے پایۂ تخت کو خالی کرنے کے بعد جلولا کو اپنا مستقر بنایا۔ اور رستم کے بھائی خرزاد نے ایک بڑی جمع کر کے آخری مدافعت کی کوشش کی۔

حضرت سعد وقاصؓ نے ہاشم بن عتبہ کو جلولا کے معرکہ پر مامور کیا۔ انھوں نے کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد اسے فتح کیا۔ قعقاع نے حلوان فتح کر لیا۔ اور منادی کرا دی کہ جو لوگ اسلام یا جزیہ قبول لیں گے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

تسخیر عراق کے بعد حضرت عمرؓ کی دلی آرزو تھی کہ جنگ ختم کر دی جائے لیکن ایرانیوں کو عراق کے ہاتھ سے نکل جانے کا سخت ملال تھا۔ اس لیے یزدگرد نے جلولا کے بعد مرو کو دارالحکومت بنایا

اور ازسرنو مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

معرکہ نہاوند: یزدگرد نے ڈیڑھ لاکھ فوج پر مردان شاہ کو سپہ سالار مقرر کر کے نہاوند کی طرف روانہ کیا۔ جب یہ خبر حضرت عمرؓ کو پہنچی تو انہوں نے نعمان بن مقرن کو ۳۰ ہزار فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے مقابلہ پر بھیجا۔ نہاوند کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اس دن ایسی خونریزی ہوئی کہ قادسیہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا۔

اسلامی سپہ سالار نعمانؓ شہید ہو گئے تو ان کے بھائی نعیمؓ نے علم ہاتھ میں لیا۔ ساری رات جنگ جاری رہی صبح ہوتے ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے اس فتح نے ایران کی تسخیر کا دروازہ کھول دیا۔ اس لیے مسلمانوں نے اس کا نام "فتح الفتوح" رکھا۔

معرکہ نہاوند کے بعد حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ سارے ملک کو مسخر کیا جائے۔ اور یزدگرد کو ملک بدر کیا جائے۔ چنانچہ بہت سے آزمودہ کار افسروں کو ایران کے مختلف صوبوں کی تسخیر پر مامور کیا گیا۔ ان لوگوں نے دو سال کی قلیل مدت میں سارے ایران کو فتح کر کے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

خاندان کیانی کا آخری بادشاہ ایران سے بھاگ کر خاقان کے دربار میں پہنچا۔ اس نے حسب دستور بہت آؤ بھگت کی اور ایک فوج لے کر خراسان کی طرف بڑھا۔ احنف بن قیس نے مقابلہ کیا اور پہلے ہی معرکہ میں خاقان کو معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں سے مقابلہ بہت مشکل ہے۔ اس لیے دوسرے ہی دن اپنی حدود میں واپس چلا گیا۔

یزدگرد کو جب اس کی خبر ملی تو خزانہ اور جواہرات ساتھ لے کر ترکستان کا قصد کیا۔ درباریوں نے اس ارادہ سے روکنا چاہا۔ وہ نہ مانا تو انھوں نے تمام خزانہ چھین لیا۔ مجبوراً بے سروسامانی کی حالت میں فرغانہ پہنچا اور بے کسی کی حالت میں وہیں مر گیا۔

احنف نے خلیفہ وقت کو یہ مژدہ لکھ کر بھیجا کہ خدا کے فضل و کرم سے مجوسیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اور ایران مکمل طور پر اسلامی حکومت کے زیر نگیں آگیا ہے۔

فتوحات شام

رجب سنہ ۱۴ھ میں خالدؓ بن ولید نے دمشق فتح کیا۔ رومیوں نے دمشق کی شکست کا انتقام لینے کے لیے فحل میں زبردست جنگ کی لیکن یہاں بھی شکست کھائی۔ اس فتح کے بعد اردن کا سارا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

دمشق اور اردن کے بعد مسلمانوں نے حمص کا محاصرہ کیا۔ عیسائیوں نے زبردست مقابلہ کیا لیکن بالآخر صلح کر لی۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ سپہ سالار اعظم نے عبادہ بن صامتؓ کو عامل مقرر کر کے لاذقیہ کا رُخ کیا اور بڑی جانفشانی کے بعد اس علاقہ کے قلعوں کو فتح کر لیا۔

دمشق اور حمص کی شکستوں نے قیصر کو برافروختہ کر دیا۔ اس نے انطاکیہ میں بہت سی فوجیں جمع کیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے صلاح مشورہ کے بعد دمشق میں اپنی پوری قوت جمع کی۔ جن مفتوحہ علاقوں کو خالی کیا وہاں کے عیسائیوں سے جزیہ کی جو رقم وصول کی تھی وہ واپس کر دی۔ اس ایمانداری کا یہود و نصاریٰ پر ایسا اثر ہوا کہ جب مسلمان حمص سے رخصت ہوئے تو ان لوگوں نے بایں الفاظ رخصت کیا کہ:

"خداوند آپ صاحبان کو جلد واپس لائے۔ ہمیں اپنے ہم مذہبوں سے اتنا آرام نہیں ملا جس قدر تم سے ملا ہے۔"

حضرت عمرؓ کو جب یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے مفتوحہ علاقے خالی کر دیئے۔ تو بہت رنجیدہ ہوئے۔ انہوں نے صبر سے کام لے کر سعد بن عامر کو ایک ہزار کی جماعت دے کر دمشق روانہ کیا اور قاصد کو حکم دیا کہ میرا یہ پیغام ساری فوج کو پہنچا دے۔

"اے مسلمان بھائیو! عمرؓ نے سلام کے بعد تمہیں یہ پیغام بھجوایا ہے کہ پوری قوت کے ساتھ جنگ کرو۔ اور دشمنوں پر شیروں کی طرح حملہ کرو تاکہ وہ تمہیں چیونٹیاں بلکہ ان سے بھی زیادہ حقیر معلوم ہوں۔"

مسلمانوں نے مقابلہ کے لیے یرموک کا وسیع میدان منتخب کیا۔ رومیوں کی تعداد دو لاکھ تھی۔ مسلمان صرف ۳۲ ہزار تھے۔ یرموک کا پہلا معرکہ فیصلہ کن نہ ہوا چند روز کے بعد ۵ رجب

الرجب ۱۵ھ کو دوسرا ہوا۔ بہت سے رومی سپاہیوں نے پاؤں میں بیڑیاں پہن لی تھیں تاکہ بھاگ نہ سکیں۔ پادری صلیب ہاتھوں میں اٹھائے آگے آگے تھے۔ بڑی شدت کی لڑائی ہوئی آخر عیسائیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اس معرکہ میں تقریباً ایک لاکھ عیسائی قتل ہوئے ان کے مقابلہ میں مسلمان شہداء کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ قیصر شکست کی خبر سن کر شام سے ہمیشہ کے لیے قسطنطنیہ چلا گیا۔ حضرت عمرؓ نے فتح کی خبر سنی تو سجدہ شکر ادا کیا۔

فتح بیت المقدس :۔ عمرو بن العاصؓ نے ۱۶ھ میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا۔ یرموک کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ بھی ان کی مدد کو آگئے۔ عیسائیوں نے کچھ عرصہ مدافعت کی۔ آخر کار صلح پر راضی ہو گئے اور خواہش ظاہر کی۔ کہ امیر المومنین خود یہاں آکر معاہدہ پہ دستخط کریں۔ حضرت عمرؓ نے تمام صحابہؓ سے مشورہ کے بعد حضرت علیؓ کو اپنا نائب مقرر کیا اور ۱۶ھ میں مدینہ سے روانہ ہوئے۔

حضرت عمرؓ کا یہ سفر اسلامی مساوات کا قابل ذکر نمونہ تھا۔ تمام راستہ اس طرح طے کیا کہ ایک منزل خود سوار ہوتے۔ دوسری منزل غلام سوار ہوتا اس صورت میں منزل بہ منزل بیت المقدس پہنچے۔ غلام کی باری سواری کی تھی آپ اس شان سے داخل ہوئے کہ غلام سوار تھا اور آقا پیدل۔

افسران فوج نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔

مسلمان حکام نے ایک ترکی گھوڑا سواری کے لیے پیش کیا۔ کہ اونٹ کی سواری خلیفہ کے شایانِ شان نہیں۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے تو اس نے شوخی دکھائی آپ فوراً اتر پڑے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ اس کی چال مجھے مغرور نہ کر دے۔" عمدہ لباس پیش کیا گیا کہ یہ پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑے اچھے نہیں لگتے۔ آپ نے جواب دیا۔ "ہمارے لیے اسلام کا رعب کافی ہے۔"

پادریوں نے آپ کو شہر کی سیر کرائی۔ ایک گرجا میں تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا عیسائی پادریوں نے کہا یہیں نماز ادا کر لیجیے۔ آپ نے فرمایا "نہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ زمانہ

کے مسلمان تمہارے گرجے کو اس بنا پر مسجد بنالیں کہ ہم نے یہاں نماز ادا کی ہے۔

تنزل خالد بن ولید:

حضرت خالد بن ولید کا لقب، سیف اللہ تھا وہ جس معرکہ میں گئے کامیاب و کامران لوٹے۔ کبھی انہوں نے ناکامی کا منہ نہ دیکھا۔ عراق و شام کی فتوحات میں ان کا بڑا دخل ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۳ھ میں انہیں سپہ سالاری سے معزول کیا اور ۱۷ھ میں فوجی خدمات سے معزول کر دیا۔ آپ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے چند دن بعد حکم جاری کیا کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کل اختیارات ابوعبیدہ بن جراح کے سپرد کر دیں اور خود ان کے تحت کام کریں۔ انہوں نے حکم کی کامل طور پر اطاعت کی۔

حضرت خالد کی معزولی کی فوری وجہ کوئی خاص نہ تھی۔ بلکہ آپ ابتداء سے ہی ان کی امارت پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ نے خلیفہ اوّل کو بھی کئی بار اس کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن انہوں نے آپ سے اس مسئلہ پر اتفاق نہیں کیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی ناپسندیدگی کی وجوہات کچھ اس نوعیت کی تھیں۔

اوّل تو بعض اوقات شجاعت کے جوش میں انجام سے بے نیاز ہو جاتے تھے اور بے دھڑک ایسے کام کر گزرتے جو مصلحت اور دور اندیشی کے بالکل منافی ہوتے تھے مثلاً خلیفہ اوّل کے عہد میں عراق کی مہم زوروں پر تھی کہ آپ اچانک مکّہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ اور پوشیدہ طور پر حج ادا کر کے واپس لوٹے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس واقعہ پر شدید باز پرس کی۔

دوسرے حضرت خالدؓ جوش انتقام میں بہت تیز تھے بدعہد دشمن کو سزا دینا درست ہے لیکن اسلام جس مروّت اور حسن خلق کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کی رو سے کچھ پابندیاں عاید ہوتی ہیں۔ انہوں نے خلیفہ اوّل کے عہد میں مالک بن نویرہ کو اجازت کے بغیر ہی قتل کر دیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس وقت بھی اس طریق کار کو پسند نہیں کیا تھا۔

تیسرے حضرت عمر فاروقؓ کی نگاہ میں یہ بات مناسب نہ تھی کہ کوئی حاکم یا سپہ سالار

اس قدر قوت اور طاقت پکڑ لے کہ اطاعت ہی سے نکل جائے۔

چوتھی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ عوام خصوصاً غیر مسلم اور نو مسلم حضرت خالد کی تیغ رانی سے اس درجہ متاثر تھے۔ کہ وہ تمام فتوحات انہیں کے سبب سمجھتے تھے یہ بات سیاسی اعتبار سے بھی اور اسلامی عقاید کے لحاظ سے بھی مناسب نہ تھی۔ شخصیت پرستی بعض اوقات بہت بڑے نتایج کا باعث ہوا کرتی ہے لوگ خیال کرتے تھے کہ عراق کی مہم ان کے بغیر سر نہ ہو سکے گی۔ جہاد عراق پر لوگوں کو تیار کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کو بہت سمجھانا اور ابھارنا پڑا۔

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کی معزولی کے بارے میں جو فرمان نافذ کیا اس میں لکھا میں نے خالد کا تنزل کسی ناراضی یا خیانت کی بناء پر نہیں کیا بلکہ اس لیے کیا کہ لوگ مفتون ہو گئے تھے۔ مجھے ڈر ہوا کہ لوگ ان پر توکل نہ کرنے لگیں اس لیے میں نے بتانا چاہا کہ کارساز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

حضرت خالد جب تک سپہ سالار رہے ان کی خدمات بے مثال تھیں۔ لیکن جب سپہ سالاری سے تنزل ہو گیا تو ایک ادنیٰ سپاہی کی طرح بھی ان کے کارنامے اسی طرح بے مثال تھے۔ انہوں نے ایک وفادار ماتحت کی تحت خلیفہ کا حکم بسر وچشم قبول کیا اور اپنے فرائض پوری طرح مستعدی سے انجام دیئے۔

۱۷ھ میں حضرت عمر فاروقؓ کو اطلاع ملی کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے ایک سردار اشعث بن قیس کو دس ہزار اشرفیاں انعام دی ہیں۔ آپ نے اس قسم کی سخاوت کو پسند نہ فرمایا۔ حضرت ابو عبیدہ کو لکھا کہ جواب طلب کریں اگر سرکاری روپیہ تھا تو خیانت کی اور اگر جیب سے دیا تو فضول خرچی کی۔

حضرت ابو عبیدہؓ نے سب لوگوں کے سامنے جواب طلب کیا مگر وہ چپ رہے حضرت بلالؓ اٹھے اور ان کی پگڑی گلے میں ڈال کر گرفتار کر لیا۔ پھر پوچھا مال کہاں سے دیا ہے انہوں نے جواب دیا۔ جیب سے چنانچہ حضرت بلالؓ نے چھوڑ دیا۔ اور اپنے ہاتھ سے پگڑی باندھی کس قدر صبر آزما تھا یہ موقع ▌ مگر کیا مجال سپہ سالار اعظم اپنے خلیفہ کے حکم

کے ساتھ ذرا دراسی سرتابی کرے۔

فتح مصر

مصر کی فتح قیصر نے شام میں شکست کھانے کے بعد مصریوں کو اسلام کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا۔ ۱۷ھ میں حمص کے معرکہ میں مصریوں نے اسلام کے خلاف جنگ کی۔ ان حالات میں ضروری ہو گیا کہ دشمن کا یہ اڈا توڑا جائے اور ان کا زور ختم کر دیا جائے۔ مزید برآں مصر پر رومیوں کا قبضہ غاصبانہ تھا انہیں رومیوں سے چھڑانا بھی کچھ کم ضروری نہ تھا۔

۱۸ھ میں حضرت عمر فاروقؓ شام گئے تو عمرو بن العاصؓ نے مصر پر چڑھائی کی تجویز پیش کی۔ اس وقت میدان جنگ کا وسیع کرنا مناسب نہ تھا۔ آپ نے اتفاق نہ کیا ڈیڑھ دو برس کے بعد اجازت دی۔

آپ نے عمرو بن العاص کو لکھا کہ مصر کی حدود میں داخلہ سے قبل اگر میرا خط مل جائے تو واپس آ جائیں مگر وہ مصر میں داخل ہو چکے تھے چنانچہ پیش قدمی جاری رکھی قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آئیں۔ لیکن وہ بڑھتے گئے اور ہر جگہ غلبہ حاصل کرتے گئے۔

الیونہ کے نام سے موجودہ قاہرہ کے قریب ایک مضبوط قلعہ تھا۔ مقوقس حاکم مصر اپنے دارالخلافہ اسکندریہ سے خود یہاں پہنچا۔ فوج کی کمان خود سنبھالی لی۔ انہوں نے خلیفہ دوم کو مدد کے لیے لکھا۔ چنانچہ آپ نے دس بارہ ہزار فوج حضرت زبیرؓ کی زیر سرکردگی روانہ کی۔ مصری قلعہ بند ہو گئے محاصرہ تقریباً سات ماہ جاری رہا۔

ایک دن حضرت زبیرؓ جان کی بازی لگا کر سیڑھی کے ذریعہ فصیل پر چڑھ گئے چند اور سرفروش بھی ساتھ گئے۔ نعرۂ تکبیر بلند ہوا تو قلعہ کے محصور گھبرا گئے۔ مجاہدین نے دروازہ کھول لیا۔ اسلامی فوج اندر داخل ہو گئی۔ مقوقس نے ہتھیار ڈال دیئے اور صلح کی

درخواست کی سب کو امان دیدی گئی۔

قیصر نے اس مصالحت کو منظور نہ کیا۔ اسکندریہ کی طرف ایک زبردست فوج روانہ کی۔ اور مقوقس کو لکھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرے ان حالات میں اسکندریہ پہنچ کر مقابلہ ضروری تھا۔ اسلامی فوج کے سپہ سالار عمرو بن عاص نے اسکندریہ کا رخ کیا۔ قریب پہنچ کر شدید جنگیں ہوئیں۔ مسلمانوں نے اسکندریہ والوں کو قلعہ نشین ہونے پر مجبور کر دیا۔

اسکندریہ والے کبھی قلعہ سے باہر آئے مگر مقابلہ سخت ہوتا تو قلعہ میں گھس جاتے ایک دن مقابلہ کرتے کرتے مسلمان اندر گھس گئے مقابلہ کرکے پسپا ہونے لگے تو حضرت عمرو بن عاص اور تین دوسرے بہادر رہ گئے۔ اسکندریہ والوں نے گرفتار کرنا چاہا انہوں نے مقابلہ شروع کر دیا۔ طے پایا کہ ایک آدمی مقابلہ کرے اگر مسلمان جیت جائے تو چاروں بخوشی باہر چلے جائیں اور اگر مارا جائے تو چاروں گرفتار ہو جائیں۔ مقابلہ ہوا اور مسلمان سپاہی نے دشمن کو مار گرایا۔ اور چاروں آرام سے باہر آگئے۔

مدت زیادہ گذرتی جا رہی تھی۔ حضرت عمر فاروق نے ایک سخت خط لکھا کہ تم لوگ آرام پسند ہو گئے ہو۔ دو برس میں بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکے ہو اس خط سے جوش پیدا ہوا۔ اور ایک ہی حملے میں شہر پر قبضہ ہو گیا۔ سب کو امان دے دی گئی نہ مال لوٹا۔ نہ کسی کو گرفتار کیا گیا اسکندریہ کی فتح مصر کی کامل فتح تھی۔

فسطاط کی آبادکاری!

مقوقس کو شکست دے کر اور الیونہ کا قلعہ فتح کرکے حضرت عمرو ابن عاص جب اسکندریہ کی طرف روانہ ہونے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے خیمے میں ایک کبوتر نے گھونسلا بنایا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میرا خیمہ نہ اکھاڑا جائے ہمارے مہمان پرندوں کو تکلیف ہوگی اسکندریہ فتح کرکے جب واپس لوٹے تو خیمہ موجود تھا چنانچہ اس کے گرد ایک شہر بسایا گیا۔ اس شہر کا نام فسطاط رکھا گیا۔ فسطاط کے معنی ہیں خیمہ،، خاص خیمہ کی جگہ ایک شاندار مسجد تعمیر کی گئی۔ جو جامع عمرو بن عاص کے نام سے مشہور ہوئی۔ فسطاط شہر مٹ چکا ہے

قاہرہ سے کچھ فاصلے پر اس کی صرف کھنڈرات باقی ہیں۔

فتوحات پر تبصرہ: حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ خلافت تقریباً دس سال پر مشتمل ہے اس مختصر سی مدت میں جس قدر فتوحات مسلمانوں کو حاصل ہوئیں وہ تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتی ہیں۔

ایک طرف ایران کی عظیم الشان حکومت مسلمانوں کے زیرنگیں آئی۔ اور صدیوں کی ایرانی سلطنت کا خاتمہ چند سالوں میں ہوگیا۔ دوسری طرف رومۃ الکبریٰ کا خاتمہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا ایک قلیل ترین مدت میں قیصر کی حکومت کا نام ونشان مٹ گیا۔ کسریٰ اور قیصر کی دو عظیم سلطنتوں کا خاتمہ تاریخ کا ایک عجوبہ ہے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں عراق کے دور دراز حصے۔ مضبوط ترین قلعے اور دشوار ترین مقامات یوں فتح ہوئے جیسے بچوں کا کھیل ہو۔ کمال یہ ہے کہ صرف فتوحات نہیں ہوئیں بلکہ تعمیری کام۔ اصلاحات نظم ونسق اور اسلامی تبلیغ ساتھ ساتھ جاری رہی۔

فاروقی فتوحات کو دوگونہ حیثیت حاصل ہے۔ سیاسی اور دینی یعنی ایک طرف اسلامی حکومت میں وسعت ہوئی۔ دوسری طرف اسلام کا پیغام ارتقائے عالم میں پہنچا۔

تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں مل سکتی کہ کسی قوم نے دس سال کی قلیل مدت میں دو عظیم الشان سلطنتوں کو ختم کرکے دنیا میں انقلاب عظیم برپا کردیا ہو۔ بے شک سکندر، چنگیز اور تیمور نے عالم کو تہ وبالا کردیا۔ مگر ان کی فتوحات کو مسلمانوں کی جہانگیری سے کوئی نسبت نہیں ہے ان فاتحین نے ہر جگہ قتل وغارت کا بازار گرم کیا۔ لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ کی فتوحات میں قتل وغارت اور ظلم اور ستم کا ایک واقعہ بھی نہیں مل سکتا۔ انہوں نے فوج کو ہدایت کردی تھی کہ کسی بوڑھے بچے یا عورت کو قتل نہ کیا جائے۔ کسی کھیت نہ جلایا جائے کسی پھل دینے والے درخت کو نہ کاٹا جائے۔ کسی انسان پر ظلم نہ کیا جائے کسی

کا مال نہ چھینا جائے۔ کسی معبد یا راہب کی بے حرمتی نہ کی جائے۔

مسلمانوں نے مفتوحہ اقوام کے ساتھ ایسا عمدہ سلوک کیا کہ تمام لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے۔ بلکہ اپنی قوم کے مقابلہ میں ان کی مدد کی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مسلمانوں نے ہر شخص کے ساتھ انصاف کیا۔ فاتح اور مفتوح میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ انتہا یہ ہے کہ جب حمص خالی کیا تو جزیہ کی رقم واپس کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ غیر مسلموں نے مسلمانوں کو خدا کی رحمت سمجھا۔

بعض یورپین مصنفین فاروق اعظمؓ کے اس عدیم المثال کارنامہ کی عظمت اور اہمیت کم کرنے کے لیے یہ وجہ بیان کی ہے کہ روم اور ایران کی عظیم الشان سلطنتیں اس وقت اندرونی بد نظمیوں اور خانہ جنگیوں کی بنا پر بہت کمزور ہو چکی تھیں اس لیے مسلمان باسانی کامیاب ہو گئے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ سلطنتیں اس قدر کمزور ہو گئی تھیں کہ بے سرو سامان صحرا نشینوں کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی تھیں؟ ان سلطنتوں کا عربوں جیسی قوم کے ہاتھوں صفحۂ ہستی سے مٹ جانا دنیا کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اور ان کے زوال کا سبب ان کی کمزوری نہیں بلکہ مسلمانوں کی اخلاقی برتری اور اسلامی نظام کی خوبی تھا اور سب سے بڑھ کر خلیفہ وقت کی پاکیزہ سیرت۔ بلند سیاسی بصیرت اور بے داغ عدل و انصاف۔

شہادت! مدینہ میں ایک ایرانی النسل پارسی غلام رہتا تھا۔ فیروز اس کا نام تھا ابو لؤلؤ اس کی کنیت تھی یہ شخص حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا غلام تھا۔ اس نے ایک دن حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ میرا آقا مجھ سے روزانہ دو درہم وصول کرتا ہے۔ فیروز نقاشی۔ نجاری اور آہنگری میں بڑا ماہر تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے پیشے اور آمدنی کا خیال رکھتے ہوئے اس رقم کو مناسب قرار دیا۔ فیروز نے اس فیصلے سے ناراض ہو کر دوسرے دن امیر المومنین پر حملہ کر دیا۔ اس بد باطن انسان نے دنیا کو ایک بہترین انسان سے اور مسلمانوں کو ایک عظیم المرتبت خلیفہ سے محروم کر دیا۔

حضرت فاروقؓ بدھ کے دن ۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ کو صبح سویرے نماز فجر کے لیے

مسجد میں تشریف لے گئے۔ نماز پڑھانے میں مشغول تھے کہ اس ازلی بدبخت فیروز نے آپ پر خنجر سے حملہ کر کے سخت زخمی کر دیا۔

امیرالمومنین زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے ان کی جگہ نماز پڑھائی۔ کچھ لوگ قاتل کو پکڑنے کے لیے دوڑے اس نے پکڑنے والوں پر بھی حملہ کر دیا۔ اور جب گرفتار ہوا تو خنجر مار کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ آپ نے پوچھا میرا قاتل کون تھا۔ جب معلوم ہوا فیروز تھا۔ تو فرمایا۔ الحمدللہ! میرا قاتل ایسا نہیں جس نے اللہ کے حضور ایک سجدہ بھی کیا ہو۔ ۱۱

حضرت عمرؓ زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ ساڑھے دس سال کی خلافت کے بعد آپ نے ۶۳ برس کی عمر میں شہادت پائی۔ آپ کو حضرت عائشہؓ کے حجرے میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ دفن کیا گیا۔

عصر حاضر کے بڑے بڑے مورخوں نے حضرت عمرؓ کی شہادت کو سازش کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کی رائے میں دو درہم والی رقم کو شہادت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایران میں اسلامی اقتدار کے خلاف سازش کی گئی جس میں ہرمزان ابولولو فیروز اور کعب بن احبار یہودی بھی شامل تھے۔ اور اسی سازش کے ماتحت حضرت عمرؓ کی شہادت واقع ہوئی۔ وفات سے قبل آپ نے ۶ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی جس نے آپ کی جانشینی کا فیصلہ کیا۔

انتظام سلطنت

حضرت عمرؓ کی خلافت جمہوری حکومت سے مشابہ تھی یعنی تمام قومی اور ملکی مسائل مجلس شوریٰ میں پیش ہو کر اتفاق رائے یا کثرت رائے سے طے ہوا کرتے تھے۔ حسب ذیل افراد اس کے ممتاز ارکان تھے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ،

حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ حضرت سعد وقاصؓ ۔ حضرت معاذ بن جبلؓ حضرت ابی ابن ثابتؓ۔

اس خاص مجلس شوریٰ کے علاوہ عام مشورہ بھی ہوتا تھا جس میں مہاجرین۔ اور انصار کے علاوہ تمام قبیلوں کے سردار بھی شریک ہوتے تھے۔

مقصد یہ تھا کہ ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار اور اپنے حقوق کی حفاظت کا موقع مل سکے۔ اور ہر شخص بڑے سے بڑے حاکم کے طرز عمل پر نکتہ چینی کر سکے حضرت عمرؓ کی خلافت ان تمام باتوں کی جامع تھی۔ انہوں نے خود ہی اپنی حیثیت ان الفاظ میں واضح کر دی تھی۔

"صاحبو! اگر میں دولت مند ہو جاؤں تو تم سے اپنی گذر اوقات کے لیے کچھ نہ لوں گا۔ لیکن اگر حاجت مند ہوں گا تو ضرورت کے مطابق لوں گا۔ میرے اوپر تمہارے کچھ حقوق ہیں ایک یہ کہ ملک کا خراج اور مال غنیمت بے جا طور پر خرچ نہ ہو دوسرے یہ کہ تمہارے روزینے بڑھاؤں تیسرے یہ کہ تمہاری سرحدوں کی حفاظت کروں اور تم کو خطروں میں نہ ڈالوں"

ان کے نزدیک معمولی انسان کو بھی پورا حق حاصل تھا۔ کہ خلیفہ وقت سے محاسبہ کر سکے اور قاضی کے سامنے بڑے سے بڑے حاکم کے خلاف استغاثہ کر سکے ان کے نظام سلطنت کو بھی واضح کرنے کے لیے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت حفصہؓ یہ سن کر کہ بہت سا مال غنیمت آیا ہے حضرت عمرؓ کے پاس آئیں اور کہا کہ میں آپ کی بیٹی ہوں اس لیے اس مال میں سے کچھ مجھے بھی عنایت فرمائیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ بے شک تم میرے ذاتی مال میں حق رکھتی ہو مگر یہ تو عام مسلمانوں کا مال ہے۔ کیا تم مجھے دھوکہ دینا چاہتی ہو؟ یہ سن کر وہ خاموش واپس چلی گئیں۔

ایک مرتبہ خود بیمار ہو گئے۔ طبیب نے شہد تجویز کیا۔ حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی

میں آکر لوگوں سے کہا اور اگر آپ اجازت دیں تو میں تھوڑا سا شہید لے لوں۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں یہ کہہ رہے تھے کہ مہر کی مقدار زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔ یہ سنکر ایک عورت نے کہا کہ جب قرآن حکیم نے مہر کی کوئی مقدار معین نہیں کی ہے تو آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ بے شک تم سچ کہتی ہو۔ میں غلطی پر تھا۔

ایک دن حضرت عمرؓ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو ایک شخص نے کہا تقریر کرنے سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ چند روز ہوتے ہر شخص کو دو دو گز کپڑا ملا تھا آپ کا کرتہ دو گز میں نہیں بن سکتا۔ تو باقی ماندہ کپڑا کہاں سے آیا؟ حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند عبداللہ کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا میں نے اپنے حصہ کا کپڑا اپنے باپ کو دے دیا تھا۔ یہ سن کر اس شخص نے کہا "اب تقریر کیجئے ہم سنیں گے۔" ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں میں حریت کی روح کس حد تک پیدا کر دی تھی اور عدل و مساوات کا کیا نمونہ قائم کیا تھا۔

صوبائی انتظام: حضرت عمرؓ نے تمام ممالک مفتوحہ کو گیارہ صوبوں میں تقسیم کیا، مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ، فلسطین، مصر، فارس، خراسان اور آذربائیجان ہر صوبہ میں حسب ذیل عہدیدار متعین کیئے۔ والی (حاکم صوبہ) کاتب (میر منشی) کاتب دیوان (فوج کا میر منشی) صاحب الخراج (کلکٹر) صاحب احداث (سپرنٹنڈنٹ پولیس) صاحب بیت المال (افسر خزانہ) قاضی (جج) ان عہدیداروں کا انتخاب مجلس شوریٰ میں ہوتا تھا۔

خلیفہ کا سب سے بڑا فرض حکام کی نگرانی اور قوم کے اخلاق و عادات کی حفاظت ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس فرض کو ایسی عمدگی کے ساتھ انجام دیا کہ تاریخ عالم میں اس سے بہتر مثال شاید ہی مل سکے۔ آپ اپنے ہر عامل سے اس بات کا عہد لیتے تھے کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا۔ باریک کپڑے نہیں پہنوں گا، چھنا ہوا

آٹا نہیں کھاؤں گا۔ دروازہ پر دربان مقرر نہیں کروں گا۔ اپنا دروازہ حاجت مندوں کے لیے ہمیشہ کھلا رکھوں گا۔ شریعت کی پابندی کروں گا۔

تقرر کے وقت ہر عامل کے ذاتی مال و اسباب کی فہرست تیار کرا کے محفوظ رکھتے تھے اور جب کسی عامل کی مالی حالت میں غیر معمولی ترقی کا علم ہوتا تو جائزہ لے کر نصف مال اس سے وصول کر لیتے اور بیت المال میں داخل کر دیتے۔

حج کے زمانہ میں اعلان عام کرا دیتے تھے کہ جس شخص کو کسی عامل کے خلاف کوئی شکایت ہو۔ بلا تامل بارگاہ خلافت میں پیش کرے۔

حکام کے علاوہ عام مسلمانوں کے اخلاق کی درستی کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے عرب جیسی متکبر قوم سے فخر و غرور کی تمام علامات مٹا دیں۔ حتیٰ کہ آقا اور غلام کی تمیز مٹا دی۔

ملکی اصلاحات!

جب شام، عراق اور ایران فتح ہو گیا تو اکثر صحابہؓ کی رائے یہ ہوئی کہ یہ تمام علاقے امرائے فوج کو دے دیئے جائیں لیکن حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ زمین کو حکومت کی ملک قرار دیا جائے اور وہاں کے باشندوں کے قبضہ میں ہی رہنے دی جائے چنانچہ یہ مسئلہ مجلس عام میں پیش ہوا۔ حضرات علیؓ، عثمانؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ نے آپ کی تائید کی اور آپ کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اسلام میں سرمایہ داری کی طرح جاگیرداری کی بھی گنجائش نہیں۔

آپ نے عراق کی پیمائش کرائی۔ اراضی کا بندوبست کیا۔ عشر و خراج کا طریقہ قائم کیا۔ تجارتی مال پر چنگی لگائی۔ تجارتی گھوڑوں پر بھی زکوٰۃ عائد کی۔ تمام ملکوں میں مردم شماری کرائی۔ اضلاع میں باقاعدہ عدالتیں قائم کیں۔ محکمہ قضاء کے لیے قواعد وضع کیے۔ حل طلب مسائل کے لیے افتاد کا محکمہ قائم کیا۔ امن و امان قائم کرنے کے لیے پولیس کا محکمہ قائم کیا۔ بڑے بڑے شہروں میں محتسب مقرر کیے۔ تاکہ دوکاندار ناپ تول میں کمی نہ کریں۔ جانوروں

پر زیادہ بوجھ نہ لادا جائے۔ شراب فروخت نہ ہو۔

انہوں نے ۱۵ھ میں مدینہ میں بیت المال (اسلامی حکومت کا خزانہ) قائم کیا تمام صوبوں میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں۔ ان شاخوں میں سالانہ مصارف کے بعد جس قدر رقوم بچ جاتیں۔ وہ مدینہ کے صدر بیت المال میں بھیج دی جاتی تھیں اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ صرف باشندگان مدینہ کو تین کروڑ درہم سالانہ تقسیم کئے جاتے تھے۔

عدالتی نظام:

عدل و انصاف حضرت عمرؓ کی شخصیت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے انہوں نے ساری عمر کسی معاملہ میں بھی عدل و انصاف سے انحراف نہیں کیا۔ امیر غریب شریف رذیل۔ اپنے بیگانے سب کے لیے ایک ہی قانون تھا۔

ایک دفعہ عمرو بن عاصؓ فاتح مصر کے بیٹے عبداللہ نے ایک شخص کو بلا وجہ مارا حضرت عمرؓ نے اسی شخص سے عبداللہ کے کوڑے لگوائے۔

جبلہ ابن ایہم رئیس شام نے طواف کے موقع پر ایک شخص کے تھپڑ مار دیا اس نے بھی اسی وقت بدلہ لے لیا۔ جبلہ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی انہوں نے جواب دیا۔ "اس نے بالکل ٹھیک کیا۔" یہ سن کر جبلہ حیران رہ گیا۔

ایک مسلمان نے ایک عیسائی کو قتل کر دیا حضرت عمرؓ نے اس مسلمان کو مقتول کے ورثاء کے حوالہ کر دیا اور قطعاً کوئی رو رعایت نہ کی۔

انہوں نے ایک ضعیف کو بھیک مانگتے دیکھا۔ سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا "میں مفلس ہوں لیکن مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

حضرت عمر فاروقؓ کا عدل تاریخ میں ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ہندوستان میں جب پہلی بار کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں تو مسٹر گاندھی نے کانگریسی

وزراء سے کہا میں تمہیں اشوک یا کسی دوسرے راجہ کی مثال دینا نہیں چاہتا البتہ نصیحت کرتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کے نمونے کو اپنے سامنے رکھنا۔

انہوں نے انصاف کے معاملے میں کسی سے کوئی رو رعایت نہیں برتی عرب کے بڑے سے بڑے سردار فوج کے بڑے سے بڑے سپہ سالار خود اپنے بیٹے اور بیٹی کوحتی کہ اپنی ذات کو قانونِ عدل و انصاف سے بالاتر نہ دیا۔

آپ کی شخصیت اس قدر جلال و ہیبت کا نشان تھی کہ بڑے بڑے بہادر سامنے آتے ہوئے کانپتے تھے۔ لیکن ایک بڑھیا اور معمولی بدو بھی انصاف اور برابری کے سلسلہ میں بے جھجک محاسبہ اور جواب طلبی کرسکتا تھا۔

مالی نظام: عہد فاروقی میں مندرجہ ذیل ذرائع آمدن تھے۔

(الف) خراج یہ رقم کاشتکاروں سے وصول کی جاتی تھی خراج غلے یا رقم کی صورت میں لیا جاتا تھا۔۔۔ زمین کی حیثیت کے مطابق خراج کی شرح مقرر کی جاتی تھی۔

خراج اس زمین سے وصول کیا جاتا تھا جو فتح کے بعد غیر مسلم کاشتکاروں کے قبضے میں رہتی تھی۔

حضرت عمرؓ نے زمینوں کی پیمائش کا خاص بندوبست کر کے فی جریب کے حساب سے خراج مقرر کیا۔ اس کی شرح دو درہم سے دس درہم سالانہ تک تھی۔ عراق کے وصول شدہ خراج کی مقدار بارہ کروڑ درہم سالانہ تک پہنچ گئی تھی۔ خراج آمدنی کا ایک خاص ذریعہ تھا۔

آپ مال افسروں کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ وصولی کے وقت بڑی نرمی اور انصاف سے کام لیں۔ کسی کاشتکار پر ظلم و زیادتی نہ ہو۔ اس معاملے میں اتنی احتیاط برتی جاتی تھی کہ ہر علاقے کے لوگوں سے شہادت لی جاتی کہ کسی پر ظلم و جور تو نہیں ہوا۔

حضرت عمرؓ کے مال افسروں اور خراج وصول کرنے والوں پر بھی کڑی نگرانی رکھتے

تقرر سے پہلے ان کی جائداد اور دولت کا تخمینہ لگایا جاتا تھا اور خراج کی وصولی اور بیت المال میں جمع کرنے کے بعد پھر ان کی جائداد کا جائزہ لیا جاتا تھا۔

مصر میں خراج یا لگان کا بندو بست پرانے دستور پر ہی رہا۔ مصر کا خراج ایک کروڑ ۲۰ لاکھ درہم تک پہنچ گیا تھا۔

(ب) جزیہ۔ یہ ٹیکس غیر مسلم رعایا سے وصول کیا جاتا تھا۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد جزیہ ختم ہو جاتا تھا۔ جزیہ صرف عاقل۔ بالغ اور دفاع کے قابل لوگوں پر واجب تھا بے کار۔ فقیر۔ مسکین۔ اندھے۔ اپاہج۔ دیوانے، بیمار۔ راہب۔ بچے۔ بوڑھے اور عورتیں جزیے سے مستثنیٰ تھیں۔ اہل کتاب کے قابل جنگ لوگوں پر اسی طرح جزیہ واجب تھا جس طرح مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔

مسلمان حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ ذمیوں کو اندرونِ ملک میں امن وامان دے اور بیرونی حملوں سے بچاتے۔ جزیہ دراصل اس حفاظت وحمایت کا معاوضہ تھا اور جو لوگ اسلامی لشکر میں شامل ہو کر فوجی خدمات انجام دیتے۔ انہیں جزیہ معاف ہو جاتا۔

جزیے کی شرح ذمیوں کی مالی حیثیت کے مطابق ہوتی تھی فی آدمی سالانہ ایک دینار سے لے کر چار دینار تک ہوتی تھی۔

اگر کوئی شخص محتاج یا بیمار ہو جاتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اس کا جزیہ معاف کر کے اس کا وظیفہ مقرر کر دیتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے وفات کے وقت یہ وصیت فرمائی تھی۔

"میں اپنے جانشین کو وصیت کرتا ہوں کہ اہل ذمہ سے وعدہ پورا کیا جائے، ان کی حفاظت کی جائے اور انہیں دشمنوں سے بچایا جائے۔ ان کی استطاعت سے زیادہ بوجھ ان پر نہ ڈالا جائے۔"

(ج) زکوٰۃ۔ اس رقم کا نام ہے۔ جو مسلمانوں سے نقد۔ مال مویشی اور پیداوار میں

سے وصول کیا جاتا ہے۔ نقد روپیہ۔ سونا۔ چاندی جو ایک سال تک کسی مسلمان کے پاس رہے۔ اس پر اڑھائی فی صدی سالانہ کے حساب سے زکواۃ واجب ہو جاتی ہے۔ زکواۃ امیروں اور دولتمندوں سے وصول کر کے غریبوں اور محتاجوں پر صرف کی جاتی ہے۔ اس سے امیری غریبی کا سوال مٹ جاتا ہے۔

(د) مال غنیمت۔ دشمنوں کی ہر وہ چیز جو مسلمان مجاہدوں کے ہاتھ آئے مال غنیمت کہلاتی ہے۔ مال و دولت۔ منقولہ اور غیر منقولہ جائداد حتیٰ کہ جنگی قیدی سب مال غنیمت میں شامل ہیں اس کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوتا تھا۔ باقی مجاہدوں کا حق تھا۔ یہ بھی بیت المال کی آمدنی کا معقول ذریعہ تھا۔

عشور۔ یہ ایک تجارتی ٹیکس تھا ابتداء میں غیر مسلم غیر ملکی تاجروں پر لگایا گیا رفتہ رفتہ یہ ٹیکس تجارتی ٹیکس قرار پایا۔ اس کا اطلاق ذمیوں اور مسلمانوں پر لگا ذمیوں سے ۵ فی صدی کی شرح سے وصول ہوتا تھا اور مسلمان تاجروں سے اڑھائی فی صدی دوسو درہم سے کم مقدار کی چیز پر ٹیکس عائد نہ ہوتا تھا۔ آج کل محصول چنگی اسی قسم کا ٹیکس ہے۔

فوجی نظام

۱۵ھ میں حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ سارے ملک کو فوجی بنا دیا جائے پہلے انہوں نے قریش اور انصار کی مردم شماری کرائی اور ہر شخص کے بیوی بچوں کے لیے وظیفے مقرر کیے بیویوں کی تنخواہ دوسو سے چار سو درہم تک مقرر کی۔ البتہ اہل بدر کی اولاد ذکور کی تنخواہ دو ہزار درہم سالانہ مقرر کی۔ ہر اسلامی عرب فوج کا سپاہی تصور کر لیا گیا۔ ہر شخص کو تنخواہ کے علاوہ کھانا اور کپڑا بھی حکومت کی طرف سے ملتا تھا۔ انہوں نے حکم نافذ کیا کہ ممالک مفتوحہ میں کوئی عرب، زراعت یا تجارت کا پیشہ اختیار نہ کرے اس سے فوجی جذبہ کے کمزور ہو جانے کا امکان تھا۔

فوجی قواعد (پریڈ) میں چار باتیں لازمی تھیں۔ تیراکی، سواری، تیر اندازی اور ننگے پاؤں چلنا۔ حضرت عمرؓ نے جفاکشی کی روح برقرار رکھنے کے لیے یہ حکم دیا کہ کوئی سپاہی

رکاب میں پاؤں ڈال کر سوار نہ ہو۔ ریشمی لباس نہ پہنے دھوپ سے نہ بچے اور حمام میں نہ نہائے۔

موسم گرما میں تمام فوجیں سرسبز اور شاداب علاقوں میں بھیج دی جاتی تھیں چھاؤنیوں میں حفظانِ صحت کا خاص رکھا جاتا تھا۔ کوچ کے موقع پر جمعہ کے دن لازماً قیام کیا جاتا ہر چار ماہ کے بعد ہر سپاہی کو رخصت ملتی تھی اور اسے گھر بھیج دیا جاتا تھا۔

مکہ۔ مدینہ۔ کوفہ۔ موصل۔ بصرہ دمشق فسطاط۔ اردن حمص اور فلسطین کو فوجی مرکز قرار دیا ان بڑے مرکزوں کے علاوہ ہر ضلع میں تھوڑی بہت فوج رہتی تھی۔ فوج میں حسب ذیل یہ عہدہ دار ہوتے تھے۔ خزانچی۔ مترجم۔ محاسب۔ طبیب۔ جاسوس اور جراح فوج کو حسب ذیل شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ مقدمہ۔ میمنہ۔ میسرہ۔ قلب۔ طلیعہ۔ ساقہ سفر مینا۔ پیدل۔ شتر سوار۔ اسپ سوار اور تیر انداز ہر حصہ کا افسر جدا ہوتا تھا

حضرت عمرؓ نے گھوڑوں کی پرورش کا بھی خاص انتظام کیا۔ ان کے لیے وسیع چراگاہیں تیار کرائیں ہر گھوڑے کی ران پر "جیش فی سبیل اللہ" داغا جاتا۔ ہر مرکز میں چار ہزار گھوڑے ہر وقت ساز و سامان سے تیار رہتے تاکہ بوقت ضرورت جہاد میں شریک ہو سکیں۔

ذمیوں سے سلوک!

"ذمی" در اصل "اہل الذمہ" کا خلاصہ ہے یعنی وہ غیر مسلم رعایا جن کی حفاظت مسلمانوں کے ذمے ہو۔ یہ لوگ فوج میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر خدمات انجام نہیں دیتے تھے اس کے بدلے انہیں معمولی ٹیکس دینا پڑتا تھا جسے جزیہ کہتے ہیں۔ اس کا مفصل بیان سوال نمبر ۲ میں موجود ہے۔

حضرت عمرؓ کو ذمیوں کی فلاح بہبود کا اس قدر دھیان رہتا تھا کہ آخری وصیت میں بھی اپنے جانشینوں کو ان کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی۔ اسی حسن سلوک کا ثمر تھا کہ ذمی آپ کے عہد میں جوق در جوق اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔ تبدیلی مذہب میں

کوئی جبر نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کا ایک عیسائی غلام تھا۔ آپ نے اسے اسلام کی تلقین کی لیکن اس نے صاف انکار کیا۔ آپ نے فرمایا۔ لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ دین کی تبدیلی میں کوئی جبر نہیں) یعنی تم آزاد ہو۔ اب چاہو اسلام قبول کرو نہ کرو۔

ذمی عدل و انصاف کے بارے میں مسلم رعایا کے ساتھ مکمل مساوات رکھتے تھے۔ یرموک کی جنگ سے پہلے جب اسلامی افواج نے شام کو خالی کیا تو وہاں کے لوگوں سے جزیہ وصول کیا تھا۔ لوٹا دیا۔ ایک دفعہ ایک مسلمان نے کسی عیسائی کو قتل کر دیا تو آپ نے قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دیا کہ اس سے قصاص لیں۔

ذمیوں میں جو غریب اور حاجت مند ہوتے تھے۔ ان کو حکومت مدد دیتی تھی۔ ایک دفعہ جابیہ کے مقام پر آپ کچھ کوڑھی عیسائیوں کے پاس سے گزرے آپ نے ہدایت کی کہ بیت المال سے ان کی مدد کی جائے۔

نجران اور خیبر کے عیسائیوں کو خارج البلد کرنا پڑا تو ان کے آرام و آسائش کے انتظامات کئے۔ حضرت عمرؓ کی فتوحات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے اس بارہ میں اور بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔

دینی خدمات

سب سے بڑی خدمت اشاعت اسلام ہے حضرت عمرؓ نے اس فرض کو پورے انہماک کے ساتھ انجام دیا۔ لیکن انہوں نے اس اصول کو ہمیشہ مدِنظر رکھا کہ مذہب میں کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے تمام مسلمانوں کو اپنی تربیت سے اسلام کا ایسا دلکش نمونہ بنا دیا تھا کہ غیر مسلم ان کے طرز کو دیکھ کر خود بخود اسلام کی طرف کھچے چلے آتے تھے انہوں نے عراق اور شام کے عربوں میں خاص طور سے اسلام کی تبلیغ کی۔ اسلامی فتوحات کا بھی غیر مسلموں کے دلوں میں بہت اچھا اثر پڑا اور بہت سے غیر مسلم اپنی خوشی سے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اس کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کے اندر مذہبی تعلیم اور اسلامی اشعار

رائج کرنے کے لیے بڑا اہتمام کیا۔ ہر بڑے شہر میں قرآن حکیم کی تعلیم کا انتظام کیا۔ معلمین، حفاظ۔ اور موذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔

بعض عالم صحابہؓ کو عراق، شام اور مصر بھیجا تاکہ وہاں کے باشندوں کو قرآن پڑھائیں۔ انہیں کوششوں کی بدولت ان کے عہد میں حفاظ کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی ہر طرح دین کا چرچا اور اسلام کا غلغلہ بلند کیا۔

قرآن کے بعد حدیث کا درجہ ہے اور انہوں نے اس کی اشاعت میں بھی حصہ لیا چنانچہ احادیث کی نقلیں کرا کے نامور صحابہؓ کو سنت نبوی کی تعلیم کے لیے مختلف صوبوں میں بھیجا۔ لیکن وہ لوگوں کو کثرتِ روایت سے منع کرتے تھے۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کی توجہ قرآن سے ہٹ کر حدیث پر مبذول ہو جائے گی۔

حضرت عمرؓ اپنے خطبوں میں اور تقریروں میں فقہ کے ضروری مسائل بیان کرتے نیز مختلف صوبوں کے حکام کو فقہ کے مسائل لکھ کر بھیجتے مختلف فیہ مسائل کو صحابہؓ کی مجلس میں پیش کر کے طے کراتے حکام اور عمال کے تقرر میں علماء اور فقہا کو ترجیح دی جاتی تھی۔ انہوں نے مذہبی احکام کی تعلیم دینے کے لیے بڑے بڑے شہروں میں فقہا مقرر کیے ان کو معقول تنخواہیں دی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ وہ باعزت زندگی بسر کر سکیں اور ان کا وقار قائم رہے۔

انہوں نے تمام صوبوں میں بکثرت مسجدیں تعمیر کرائیں۔ حرم کی مسجد ناکافی اور مختصر تھی۔ ۱۷ھ میں اس کو وسیع کیا۔ مسجد نبوی کو بھی وسعت دی ہر مسجد میں خلافت کی طرف سے روشنی اور فرش کا انتظام کیا گیا۔ حاجیوں کی آسائش کا پورا پورا خیال رکھا جاتا خود ہر سال حج کو جاتے اور خود بھی ان کی خدمت میں حصہ لیتے تھے۔

رفاہ عامہ کے کام: حضرت عمرؓ نے تمام صوبوں میں حکام کی زیر نگرانی سرکاری عمارتیں بنوائیں عوام کی بہبودی کے لیے دریاؤں کے پل۔ سڑکیں اور مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ فوجوں کے لیے بارکیں اور قلعے بنے

مسافروں کے لیے مہمان خانے اور سرائیں تعمیر ہوئیں خزانہ کے لیے بیت المال بنوائے گئے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان جو سڑک تھی اس کی ہر منزل پر چوکیاں اور سرائیں بنائی گئیں۔ آب پاشی کے لیے نہریں کھدوائیں زراعت کو ترقی دی گئی۔ غرض ہر شعبہ میں تعمیر و ترتیب کی۔

حضرت عمرؓ کے حکم سے ۱۷ھ میں عتبہؓ نے بصرہ شہر کو بسایا اور کچھ عرصہ کے بعد یہ شہر مسلمانوں کا فوجی اور علمی مرکز بن گیا۔

حضرت سعد وقاصؓ نے کوفہ کے قدیم قصبہ کو آباد کیا۔ ۴۰ ہزار آدمیوں کے رہنے کے لیے مکانات بنوائے گئے۔ حضرت عمرؓ کی زندگی ہی میں یہ شہر اس قدر عظیم الشان ہو گیا تھا کہ وہ اسے "راس الاسلام" کہا کرتے تھے۔ علمی حیثیت سے بصرہ سے بھی زیادہ زیادہ مشہور ہو گیا۔ یہاں بڑے بڑے فقہاء مثلاً نخعیؒ، حمادؒ، امام ابو حنیفہؒ پیدا ہوئے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں متعدد نہریں کھدوائی گئیں۔ مثلاً

نہر ابو موسیٰ:- دجلہ سے بصرہ کو پانی پہنچانے کے لیے یہ نہر بنائی گئی اس وقت ابو موسیٰ اشعری بصرہ کے حاکم تھے اس لیے ان کے نام سے یہ نہر موسوم ہوئی۔

نہر معقل:- یہ نہر بھی دجلہ سے نکالی گئی اس کی تیاری ایک صحابی معقل بن یسار نے انجام دی تھی۔

نہر سعد:- آپ کے عہد میں یہ نہر شروع ہوئی مگر اموی عہد میں مکمل ہوئی تا اس کی ابتدا آپ کے حکم سے سعد بن ابی وقاص نے کی تھی۔

نہر امیر المومنین:- یہ نہر نیل کو بحیرۂ قلزم سے ملاتی تھی۔ آپ کے حکم سے یہ نہر کھدوائی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعہ قحط دبایا جاسکے۔ بعد میں نہر بند ہو گئی۔ ان نہروں کے علاوہ آپ نے مکہ اور مدینہ کے درمیان منزل بمنزل سرائیں بنوائیں۔ اور جو کنوئیں بند ہو گئے تھے انہیں صاف کرا کے پانی جاری کرایا۔

مصر فتح کرنے کے بعد عمرو بن العاصؓ نے فسطاط کے نام سے ایک شہر آباد کیا بہت

جلد یہ شہر مصر کا صدر مقام بن گیا۔ چوتھی صدی ہجری میں یہ شہر مسلمانوں کا علمی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہ شہر موجودہ قاہرہ کے قریب تھا۔ اب صرف اس کے کھنڈر باقی ہیں۔

موصل پہلے محض ایک گاؤں تھا۔ حضرت عمرؓ کے حکم سے ہرثمہ نے اس کو آباد کیا اور یہاں ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کرائی۔

سیرت و کردار: آنحضرتؐ کے فیض صحبت کی بدولت حضرت عمرؓ مکارم اخلاق کی مجسم تصویر بن گئے تھے۔ ان کے اندر اخلاص، تقویٰ، زہد، قناعت، خوف خدا، اتباع رسول، حق پرستی، تواضع اور سادگی یہ تمام محاسن بدرجہ اتم موجود تھے۔

حضرت عمرؓ کا دل خوف خدا سے لبریز تھا۔ وہ اکثر رات بھر نماز میں پڑھتے اور خدا کے خوف سے روتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر آسمان سے آواز آئے کہ ایک شخص کے سوا باقی تمام سب لوگ جنت میں جائیں گے تو بھی میرے دل سے مواخذہ کا خوف زائل نہیں ہوگا۔ ممکن ہے وہ بدنصیب انسان میں ہی ہوں۔

ایک دفعہ آنحضرتؐ سے عرض کی کہ آپؐ مجھے اپنی جان کے سوا ساری دنیا سے زیادہ محبوب ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا "عمرؓ! میری محبت کو اپنی جان پر بھی مقدم رکھو" یہ سن کر انہوں نے کہا حضور اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ ان کی پوری زندگی اس کا ثبوت ہے۔ جنگ بدر میں ان کی تلوار ماموں کے خون سے بھی رنگین ہو گئی جب آنحضرت نے ازواج سے علیحدگی اختیار کی تو انہوں نے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر باآواز بلند کہا "اگر آپ حکم دیں تو اپنی بیٹی حفصہؓ کا سر پیش کر دوں"

جب حضورؐ نے وفات پائی تو ان کو اس بات کا یقین نہیں آتا تھا چنانچہ مسجد نبوی میں وارفتگی کے عالم میں لوگوں سے کہنے لگے کہ جس نے کہا کہ میرے محبوبؐ کا وصال ہو گیا اس کا سر قلم کر دوں گا۔

جفاکشی کی کامل پیروی ان کی زندگی کی نمایاں ترین خصوصیت تھی چونکہ آنحضرت ؐ نے فقر و فاقہ میں زندگی بسر کی تھی۔ اس لیے حضرت عمر ؓ نے ایران اور روم فتح کرنے کے بعد آسائش و آرام کی زندگی اختیار نہ کی ایک دفعہ ان کی بیٹی حفصہ ؓ نے کہا اب خدا نے ہر قسم کی راحت عطا کی ہے اس لیے آپ بھی اچھا لباس استعمال کریں اور نفیس غذا کھائیں۔" یہ سن کر انہوں نے کہا "جان پدر! تم آنحضرت ؐ کی سادہ زندگی کو بھول گئیں۔ بخدا کی قسم میں اپنے آقا کے نقش قدم پر چلوں گا تاکہ آخری سعادت حاصل ہو۔

انہوں نے ساری عمر نرم کپڑا نہیں پہنا۔ ان کے کرتے میں بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے اور اس صورت میں قیصر و کسریٰ کے سفیروں کو شرف باریابی عطا کرتے۔ لباس کی طرح ان کی غذا بھی بہت سادہ ہوتی تھی۔ عموماً روغن زیتون میں روٹی تر کر کے کھاتے۔ قناعت کا یہ عالم تھا کہ خلیفہ ہو جانے کے بعد کئی سال تک بیت المال سے کچھ نہیں لیا۔ جب صحابہ ؓ نے دیکھا کہ فاقوں پر فاقے ہو رہے ہیں تو ان کو وظیفہ لینے پر مجبور کیا وہ اپنے وسیع خاندان کے لیے صرف دو درہم روزانہ لیتے تھے امام حسن ؓ کا بیان ہے۔ کہ ایک دن میں نے ان کے تہبند پر بارہ پیوند شمار کیے۔

ایک دفعہ ایک عامل نے ان کی بیوی کی خدمت میں ایک قیمتی چادر بھیجی جب انہیں اس کا علم ہوا تو چادر واپس کر دی۔

ایک مرتبہ ان کی بیوی نے قیصر کی ملکہ کو عطر کی چند شیشیاں تحفۃً بھیجیں اس نے ان شیشیوں کو جواہرات سے پر کر کے بھیجیں جب حضرت عمر ؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے وہ جواہرات بیت المال میں داخل کر دیئے اور اپنی بیوی کو کچھ معاوضہ دے دیا۔

ایک دفعہ بازار میں ایک فربہ اونٹ فروخت ہو رہا تھا معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے عبداللہ نے اسے سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا تھا۔ اس لیے اس قدر فربہ ہو گیا ہے یہ سن کر ان سے کہا کہ تم صرف اصل قیمت کے مستحق ہو۔ زائد قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے

انتہائے ورع و تقویٰ یہ ہے کہ ایک مرتبہ بحرین سے مال غنیمت میں مشک اور

عنبر آیا۔ اس کی تقسیم کے لیے ایسے آدمی کی ضرورت ہوئی جو عطریات کے وزن سے آگاہ ہو ان کی بیوی عاتکہ نے کہا میں یہ کام کرسکتی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری انگلیوں میں کچھ لگ جائے گا تم اسے اپنے جسم پر مل لوگی اس طرح میرے حصہ میں عام مسلمانوں سے زیادہ آجائے گا۔

ان کی تواضع اور خاکساری کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ وہ بیوہ عورتوں کے لیے پانی بھر کر لاتے تھے۔ اور مجاہدین کی بیویوں کا سودا سلف بازار سے خرید کر ان کے گھروں میں پہنچاتے تھے۔

ایک دن وہ صدقہ کے اونٹوں پر تیل مل رہے تھے ایک شخص نے کہا کہ آپ یہ کام غلاموں سے لے سکتے تھے۔ جواب دیا: مجھ سے بڑھ کر مسلمانوں کا غلام اور کون ہوسکتا ہے؟ جو شخص ان کا والی ہے وہ ان کا غلام بھی ہے۔

اگرچہ وہ تند مزاج تھے لیکن ان میں نرمی اور رحم دلی بھی تھی۔ چنانچہ خود کہتے ہیں " میرا دل جب خدا کے لیے نرم ہوتا ہے تو جھاگ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتا ہے اور جب سخت ہوتا ہے تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ دراصل ان کا غضب اور ان کا رحم خدا کے لئے تھا۔

فضائل ومناقب: آنحضرتؐ جب مبعوث ہوئے تو اس وقت قبیلہ قریش میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان گنے چنے افراد میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ ان کے خطبات اور فرامین سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ تحریر و تقریر دونوں میں بے مثال عبارت کے مالک تھے۔ وہ تیز زبان اور شیریں کلام خطیب تھے۔ ان کی تحریر بھی زود کلام کا نادر نمونہ تھی۔

انہیں شعر و سخن کا ذوق بھی تھا۔ زہیر کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے کبھی کبھی خود بھی شعر کہہ لیتے تھے۔

انہوں نے فصاحت و بلاغت سے بہرۂ وافر پایا تھا ان کے بہت سے مقولے

ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انہیں علم الانساب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ بعد ہجرت عبرانی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ فطرتاً ذہین اور طباع تھے۔

اصابت رائے کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آذان کا طریقہ الہٰی کی رائے کے مطابق قائم ہوا۔ شراب کی حرمت۔ ازواج رسولؐ کے پردے اور مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے کی رائے۔ نزول وحی سے پہلے آنحضرتؐ کو دی تھی۔

حضرت عمرؓ نے طبیعت نکتہ رس پائی تھی ہمیشہ فقہی مسائل میں غور و فکر کرتے جو بات سمجھ میں نہ آتی۔ اسے آنحضرتؐ سے دریافت کر لیتے۔ قرآن کریم بہت غور و فکر کے ساتھ پڑھتے۔ ہر آیت میں تدبر کرتے۔ معاملاتِ دینی و دنیوی میں قرآن مجید سے استدلال کرتے۔ روایات کے قبول کرنے میں ثبوت اور شہادت دونوں کا لحاظ رکھتے تھے۔

مختصر یہ کہ آپ بے مثال شجاعت کے ساتھ ساتھ بے نظیر علم و فضل کے مالک تھے تحریر و تقریر دونوں میں کامل مہارت رکھتے تھے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خلیفہ سوم

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

محرم ۲۴ھ یا ذوالحجہ ۳۵ھ

بمطابق

نومبر ۶۴۴ء تا جون ۶۵۶ء

حضرت عثمان غنیؓ

ابتدائی حالات: عثمان نام، ابوعبداللہ کنیت اور ذوالنورین لقب تھا باپ کا نام عفان اور والدہ کا نام اروی تھا پانچویں پشت میں ان کا سلسلہ نسب آنحضرتؐ سے مل جاتا ہے انہیں ذوالنورین (دو نوروں والا) اس لیے کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے ان کے نکاح میں آئیں اور انہیں حضور کی دامادی کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت عثمانؓ کا خاندان جاہلیت میں بھی بہت معزز تھا آپ کے پردادا اُمیہ رؤسائے قریش سے تھے۔ جنگ فجار میں اسی خاندان کا ایک فرد حرب ابن امیہ قریش کا سپہ سالار تھا۔ ابوسفیان جس نے اکثر غزوات میں سردار قریش کی حیثیت سے آنحضرتؐ کا مقابلہ کیا۔ اسی حرب کا بیٹا تھا۔ عزت شرافت اور ریاست کے اعتبار سے حضرت عثمان کا خاندان عرب میں نہایت ممتاز سمجھا جاتا تھا۔

حضرت عثمانؓ ہجرت سے ۴۷ سال پہلے پیدا ہوتے تھے بچپن میں لکھنا پڑھنا سیکھا۔ اور جوانی میں تجارت شروع کی۔ اپنی دیانت۔ امانت۔ صداقت اور راستبازی کی بدولت غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ آپ کو غنی (مالدار) کہا کہتے تھے چونکہ مال و دولت اور دل کے غنی اور بے نیاز تھے۔

قبول اسلام اور ہجرت: آنحضرتؐ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو حضرت عثمانؓ کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔ اگرچہ یہ آواز عربوں کے لیے غیر مانوس تھی لیکن اپنی فطری صلاحیت کی

بنا وہ قبول حق کے لیے بالکل آمادہ تھے۔ چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو قبول اسلام کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ کس قدر خوش نصیب کہ ایک دن آنحضرتؐ خود آپ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا۔ "عثمان خدا کی جنت قبول کر! میں تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوا ہوں"۔ حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ نہ معلوم ان الفاظ میں کیا تاثیر تھی۔ کہ بے اختیار کلمہ شہادت میری زبان پر جاری ہو گیا۔ اس طرح آپ بالکل ابتدائی دور میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

آپ اموی خاندان سے تھے اور یہ خاندان چونکہ بنو ہاشم کا حریف تھا اس لیے اس کے تمام افراد خصوصاً عتبہ اور ابوسفیان آنحضرتؐ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ لیکن حضرت عثمانؓ کا دل خاندانی تعصب سے بالکل پاک تھا اس لیے انہوں نے اپنی خاندانی روش کے خلاف ابتداء ہی میں اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آنحضرتؐ نے انہیں یہ عزت عطا فرمائی کہ اپنی بیٹی حضرت رقیہؓ کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا۔

اسلام کی اشاعت سے کفار مکہ کی مخالفت ابتدائے اسلام میں مکہ کے اندر جب بہت بڑھ گئی اور ان کا ظلم غریب مسلمانوں کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ تو آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ بھی اپنی اہلیہ کو لے کر ملک حبش کی طرف روانہ ہو گئے۔ چند سال تک وہاں رہے۔ پھر واپس آ گئے۔ یہ حبشہ کی طرف ان کی پہلی ہجرت تھی۔

جب آنحضرتؐ نے تمام صحابہؓ کو مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا تو حضرت عثمانؓ بھی مدینہ چلے گئے اور حضرت اوس بن ثابتؓ کے مہمان ہوئے بعد ازاں انہی کے ساتھ آنحضرتؐ نے تمام کی مواخات (دینی بھائی چارہ) کر دی۔

مدینہ میں مہاجرین کو پانی کی بہت تکلیف تھی سارے شہر میں صرف ایک کنواں (بیر رومہ) ایسا تھا جس کا پانی میٹھا تھا لیکن وہ ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ حضرت

عثمانؓ نے بارہ ہزار درہم میں آدھا کنواں اس شرط کے ساتھ خریدا کہ ایک دن مسلمان مفت پانی لیں گے۔ دوسرے دن یہودی کو پانی کا اختیار ہوگا۔ کچھ عرصہ بعد یہودی نے بقیہ نصف بھی ۸ ہزار درہم پر دے دیا حضرت عثمانؓ نے اس کنویں کو مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔

غزوات میں شرکت!

حضرت عثمانؓ نے ہر غزوہ میں شرکت کی اور اللہ کی راہ میں بڑھ چڑھ کر روپیہ خرچ کیا۔ البتہ آپ غزوہ بدر میں۔ آنحضرتؐ کی بیٹی اور اپنی بیوی حضرت رقیہؓ کی شدید علالت کے باعث شریک نہ ہو سکے۔ جس دن مدینہ میں فتح بدر کی خبر پہنچی اسی دن حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا ان کو آنحضرتؐ نے خود تیمارداری کے لیے چھوڑ دیا تھا اس لیے ان کو بھی مجاہد قرار دے کر اجر و ثواب میں شریک فرما دیا۔

آنحضرتؐ نے محسوس فرمایا کہ حضرت عثمانؓ خاندانِ رسالت سے اپنا رشتہ منقطع ہو جانے کی وجہ بہت رنجیدہ ہیں۔ اس لیے ازراہِ نوازش آپؐ نے اپنی دوسری بیٹی حضرت ام کلثومؓ سے ان کا نکاح کر دیا۔ انہیں رشتوں کے باعث انہیں ذوالنورینؓ کا لقب ملا۔

حضرت عثمانؓ نے غزوۂ احد میں شرکت کی۔ تیراندازوں کی نادانستہ غلطی کے سبب مسلمانوں کے نقصان اور حضورؐ کے زخمی ہو جانے کا آپ کو ہمیشہ افسوس رہا۔

سنہ ۶ھ میں آنحضرتؐ نے جب عمرہ کا قصد فرمایا اور حدیبیہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ میں داخل نہیں دیں گے۔ بلکہ لڑنے مرنے کو تیار ہیں تو آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا۔ کفار نے ان کو قید کر لیا۔ اور یہ خبر پھیل گئی کہ انہیں شہید کر دیا ہے۔ آنحضرتؐ نے یہ خبر سن کر تمام جاں نثاروں سے اُن کے خون کا بدلہ لینے اور سرفروشی کی بیعت لی۔ حضرت عثمانؓ کی طرف سے خود اپنے دستِ مبارک پر دوسرا ہاتھ رکھ کر بیعت کی رسم ادا کی انجام کار مشرکین نے صلح کر لی اور حضرت عثمانؓ بخیر و عافیت واپس تشریف لے آئے۔

سنہ ۹ھ رجب میں خبر ملی کہ قیصر روم عرب پر حملہ کرنے والا ہے آنحضرتؐ نے مدافعت کا انتظام شروع کیا اور صحابہؓ کو مالی امداد کرنے کی ترغیب دی حضرت عثمانؓ نے ایک تہائی فوج کے جملہ اخراجات اپنے ذمہ لیئے (تبوک کی مہم ۳۰ ہزار پیدل اور ۱۰ ہزار سوار پر مشتمل تھی) گویا انہوں نے دس ہزار سے زیادہ افراد کے لیے جنگ کا سامان اور خوراک کا انتظام کیا۔ اس کے علاوہ ایک ہزار اونٹ۔ ستر گھوڑے اور ایک ہزار دینار نقد حضورؐ کی خدمت میں پیش کیے۔ حضور اس ایثار سے اس قدر خوش ہوئے کہ حضرت عثمانؓ کے لیے دعا فرمائی۔

"اے اللہ! میں عثمانؓ سے راضی ہو گیا تو بھی اس سے راضی ہو جا"

سنہ ۱۰ھ میں آنحضرتؐ نے آخری حج ادا کیا۔ حضرت عثمانؓ بھی آپ کے ہمراہ تھے

سنہ ۱۱ھ میں حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے ان کی خلافت میں حضرت عثمانؓ مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کا وصیت نامہ حضرت عثمانؓ ہی نے لکھا تھا حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں بھی آپ مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔

انتخاب خلافت! حضرت ابولؤلؤ مجوسی کے خنجر سے بری طرح زخمی ہوئے اور ان کے جان بر ہونے کی کوئی امید نہ رہی تو صحابہ کرامؓ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا جانشین مقرر کرنے کی درخواست کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر امین الامت ابوعبیدہ بن جراحؓ زندہ ہوتے تو میں اپنا جانشین بنا دیتا۔ اب میرے لیے یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔

جب آپ کی حالت زیادہ بگڑتی نظر آئی تو پھر صحابہؓ نے پریشان ہو کر جانشین کے بارے میں عرض کیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل چھ اصحاب کی مجلس قائم کی (۱) حضرت عثمانؓ بن عفان (۲) حضرت علیؓ بن ابی طالب۔ (۳) حضرت زبیرؓ بن عوام (۴) حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ (۵) حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ (۶) حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اپنے بیٹے عبداللہ کو بھی مشورے کے لیے اس کمیٹی میں

شامل کیا۔ لیکن ساتھ ہی انہیں خلافت سے محروم کر دیا۔ ان حضرات کو حکم دیا کہ میری وفات کے بعد آپس میں مشورہ کر کے اپنے میں سے کسی ایک کو امیرالمومنین منتخب کرلیں۔

حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد مذکور حضرات مسور بن مخرمہ کے مکان میں جمع ہوتے سب نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو اختیار دیا کہ وہ مسلمانوں کی بہتری اور بھلائی کے پیش نظر بہترین شخص کو خلیفہ منتخب کر دیں۔ حضرت عبدالرحمٰن نے مسلسل تین دن تک خلافت کے امیدواروں، شہر کے اہل الرائے لوگوں اور لشکروں کے سپہ سالاروں سے مل کر مشورہ کیا۔

حضرت زبیرؓ نے خلافت کے لیے حضرت علیؓ کا نام پیش کیا۔

حضرت سعد بن وقاص نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا نام تجویز کیا۔

حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کا نام پیش کیا۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا کہ میں اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں۔ اس طرح اب خلافت کا معاملہ دو اشخاص کے درمیان رہ گیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے ان دونوں سے اس بات کی رضامندی حاصل کرلی کہ وہ دونوں میں سے جس کو مناسب سمجھیں خلیفہ منتخب کر دیں۔

اس دن غور و فکر ہوتا رہا۔ دوسرے دن تمام اصحاب مسجد نبویؐ میں جمع ہوتے اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے مختصر تقریر کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ ان کے بعد حضرت علیؓ اور دیگر اصحاب نے کی۔ انہیں دیکھ کر جملہ حاضرین مجلس نے بیعت کرلی۔ یہ واقعہ ۱۰ محرم الحرام ۲۴ھ کا ہے۔

خلافت اور فتوحات

حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو فتوحات کا سلسلہ جاری تھا۔

۲۶ھ میں عبداللہ بن ابی سرحؓ نے طرابلس پر فوج کشی کی حضرت عثمانؓ نے بھی مدینہ سے عبداللہ بن زبیرؓ

عبد اللہ ابن عمرؓ اور عبد الرحمٰن ابن ابی بکرؓ کی سرکردگی میں امدادی فوج روانہ کی۔ اہل طرابلس نے کئی ماہ تک مقابلہ کیا۔ لیکن مسلمانوں کی شجاعت کے سامنے ان کو کسی معرکہ میں بھی کامیابی نہ ہوسکی۔ اس لیے مجبوراً ان کے سرداروں نے ۲۵ لاکھ دینار پر صالحت کرلی۔ اور مسلمانوں کی برتری تسلیم کرلی۔

طرابلس کے بعد افریقیہ کی طرف پیش قدمی ہوئی افریقیہ سے وہ علاقے مراد ہیں جن کو الجیریا۔ ٹیونس اور مراکو کہتے ہیں۔ عبد اللہ بن دبیرؓ نے یہ تمام علاقے اپنی خداداد ہمت اور شجاعت کی بدولت فتح کرلیے اور اسلامی حکومت کی فتوحات میں قابل قدر اضافہ کیا۔

افریقیہ میں مسلسل فتوحات سے مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے اس لیے ۲۷ھ میں حضرت عثمانؓ نے اسلامی فوجوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا لیکن کچھ فتوحات کے بعد مصلحتاً فوجوں کو واپس بلا لیا گیا۔ عبد اللہ بن نافع ابن عبد قیس کو افریقیہ کا گورنر بنایا گیا۔

حضرت عثمانؓ نے عبد اللہ بن نافع سے وعدہ کیا تھا کہ افریقیہ کی فتح کے صلہ میں مال غنیمت کا پانچواں حصہ ان کو بطور انعام دیا جائے گا انہوں نے اپنا حصہ وصول کیا تو عام مسلمانوں نے ناراضگی ظاہر کی حضرت عثمانؓ نے ان سے یہ رقم واپس لے لی اور فرمایا کہ میں نے ضرور وعدہ کیا تھا مگر عام مسلمان اس کو پسند نہیں کرتے اس لیے میں مجبور ہوں۔

مصر اور شام کی حفاظت کے لیے قبرص پر قبضہ ضروری تھا اس لیے ۲۸ھ میں امیر معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ سے اس اہم جزیرہ پر فوج کشی کی اجازت طلب کی انہوں نے اجازت دے دی۔ عبد اللہ ابن قیس حارثی کی قیادت میں مسلمانوں کا بحری بیڑا ساحل قبرص پر لنگر انداز ہوا اور ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد اہل قبرص نے ان شرائط پر صلح کی۔ اہل قبرص سات ہزار دینار سالانہ خراج دیا کریں گے۔ مسلمان جزیرہ کی حفاظت کے

ذمہ دار نہ ہوں گے، بحری جنگوں میں اہل قبرص مسلمان کو ان کے دشمنوں کی نقل و حرکت سے مطلع کیا کریں گے۔ ۳۳ھ میں اہل قبرص نے مسلمانوں کے دشمن رومیوں کی مدد کی تھی اس لیے امیر معاویہؓ نے دوبارہ فوج کشی کر کے اسے اسلامی خلافت میں داخل کر لیا۔

۳۰ھ میں عبداللہ ابن عامرؓ والی بصرہ اور سعید ابن عاصؓ نے دو مختلف راستوں سے طبرستان اور خراسان پر حملہ کیا اور سعید نے عبداللہ کے پہنچنے سے پہلے ہی ان دونوں علاقوں کو فتح کر لیا۔ عبداللہ نے خراسان سے آگے بڑھ کر ہرات کابل اور سجستان کو فتح کیا۔ اس کے بعد نیشاپور پر حملہ کیا اس شہر کے باشندوں نے سات لاکھ درہم سالانہ پر صلح کر لی۔ یہاں سے فارغ ہو کر انہوں نے ماوراالنہر کا رخ کیا۔ اس علاقہ کے باشندوں نے بھی صلح کر لی۔ عبداللہ ابن عامر نے قیس ابن ہیثم کو اس مفتوحہ علاقہ کا گورنر بنایا اور مال غنیمت لے کر دارالخلافہ واپس آئے۔

۳۱ھ میں قیصر روم نے ایک عظیم الشان بیڑا جس میں ۵۰۰ جنگی جہاز تھے ساحل شام پر حملہ کے لیے بھیجا۔ امیرالبحر عبداللہ ابن سرح نے آگے بڑھ کر مقابلہ کیا۔ اور زبردست جنگ واقع ہوئی بے شمار رومی مارے گئے مسلمانوں کو بھی کافی نقصان ہوا لیکن انہوں نے رومیوں کو شکست دے دی۔

۳۲ھ میں امیر معاویہ نے قسطنطنیہ پہ اسلامی علم نصب کر دیا اسی سال عبداللہ ابن عامر نے طالقان۔ فاریاب اور جوزجان فتح کیا۔ ۳۳ھ میں اہل خراسان نے بغاوت کی۔ اور ۳۳ھ میں اہل طرابلس نے علم بغاوت بلند کیا۔ لیکن مسلمانوں نے دونوں بغاوتوں کو بہت جلد فرو کر دیا۔

مختصر یہ کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ دور دور تک کے علاقے اسلامی خلافت کے زیر نگیں آ گئے۔

انتظامات خلافت

حضرت عثمانؓ نے بعض حالات کے تحت چند انتظامی تبدیلیاں کیں۔ عمرو بن عاصؓ عہد فاروقی سے

مصر کے گورنر چلے آ رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے انہیں لکھا مصر کے خراج میں اضافہ ہونا چاہیئے انہوں نے جواب دیا اونٹنی اس سے زیادہ دودھ نہیں دے سکتی۔ اس جواب پر آپ نے انہیں معزول کر دیا۔ اس پر مصریوں نے بغاوت برپا کر دی۔ حضرت عثمانؓ نے بغاوت فرو کرنے کے لیے انہیں دوبارہ والی مصر مقرر کر دیا۔ انہوں نے بغاوت

ایسے حالات پیدا ہوتے گئے جو بعد سے آگے چل کر ایک باقاعدہ فتنے کی صورت اختیار کی اور یہی فتنہ بالآخر آپ کی شہادت کا باعث ہوا۔ اس فتنے کے اسباب حسب ذیل تھے۔

عربوں کے ہاتھوں بہت سے علاقے فتح ہو چکے تھے۔ دولت عام ہو گئی تھی اس صورت میں عیش و تنعم کی زندگی کے جو تلخ نتیجے مرتب ہوتے ہیں مسلمان ان سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے اس حقیقت کا اندازہ حضرت ابوذر غفاریؓ کے حالات سے ہو سکتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ نے ملک شام میں عیش پرستی اور دولت اندوزی کے وعظ کا سلسلہ شروع کیا لیکن امیر معاویہ نے ان کے وجود کو اپنے لیے خطرناک سمجھا اس لیے خلیفہ وقت کو لکھا کہ ان کی تقریروں سے نظام حکومت میں خلل پڑتا ہے ان کو یہاں سے بلا لیا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کو مدینہ بلوا لیا۔ مگر اب مدینہ بھی وہ مدینہ نہیں رہا تھا بڑے بڑے محل تیار ہو چکے تھے وہ یہاں بھی قیام نہ کر سکے۔ ربذہ کے غیر معروف گاؤں میں چلے گئے۔

(۱) حضرت عثمانؓ کے آخری عہد خلافت میں جو بدبخت فتنہ برپا ہوا اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ دولت کی فراوانی سے مسلمانوں میں وہ خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جو ہر دولت مند قوم میں لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ کہ ہر شخص جماعتی فوائد پر ذاتی فوائد کو ترجیح دینے لگتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وحدت قومی ختم ہو جاتی ہے اور ذاتیات کو مرد با ملتا ہے۔

اس اصل کے علاوہ کئی اور بھی وجوہات اس خرابی کا سبب ہوئیں مثلاً

۲۔ صحابہؓ کے بعد جو نسل پیدا ہوئی وہ زہد و اتقاء، عدل و انصاف اور حق پسندی

بھی اپنے بزرگوں سے کمتر تھی۔ ان کے سامنے اپنے بزرگوں جیسے نصب العین نہ تھے۔
۳۔ خلافت کے سبب قریش کا خاندان مخصوص ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے عہدے بھی انہی لوگوں کو ملتے تھے اس لئے قریش دوسرے عرب قبیلوں کو اپنا محکوم سمجھنے لگے۔ اس کا نتیجہ باہمی رقابت کی شکل میں ظاہر ہوا دوسرے قبائل اس صورت حال سے اندر ہی اندر ناراض ہونے لگے۔

ختم کر دی۔

آپ نے مال اور خیمے ان کو دیئے۔ اور انتظامی شعبہ عبداللہ ابن ابی سرحؓ کے حوالے کیا۔ یہ صورت حال زیادہ دیر نہ چل سکی۔ دو سال بعد دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف شکایات شروع کر دیں۔

سنہ ھ میں خلیفہ نے تحقیقات کے بعد حضرت عمرو بن عاصؓ کو معزول کر دیا۔ اور عبداللہ بن ابی سرح مستقل طور پر والی مصر مقرر ہو گئے۔

حضرت سعدؓ بن وقاص کو آپ نے مغیرہ بن شعبہ کی جگہ کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجا انہوں نے بیت المال سے ایک بڑی رقم بطور قرض لی ہوئی تھی جب بیت المال کے مہتمم نے تقاضہ کیا۔ تو انہوں نے مفصل عذر کر کے ٹال دیا مقدمہ دربار خلافت تک پہنچا۔ یہ صورت حال ایک عامل کے منصب اور دیانت کے خلاف تھی۔ اس لیے آپ نے انہیں معزول کر دیا۔

ابو موسیٰ اشعریؓ عہد فاروقی سے بصرہ کے والی چلے آ رہے تھے۔ وہاں کے کُردوں نے بغاوت کر دی۔ انہوں نے مسجد میں لوگوں کو جہاد کی تلقین کی۔ اور راہ خدا میں پیدل چلنے کی فضیلت بیان کی۔

تقریر کا اس قدر اثر ہوا کہ بعض سوار دستے بھی پیدل چلنے پر تیار ہو گئے لیکن بعض لوگوں نے کہا پہلے ہم دیکھیں گے ہمارا والی خود پیدل چلتا ہے یا سوار چلتا ہے۔ صبح کو لوگوں نے دیکھا تو آپ ایک ترکی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے چالیس خچروں پر سامان لدا ہوا تھا لوگوں

نے کہا قول و فعال میں تضاد کیوں ہے؟ آپ کے جواب سے ان کی تسلی نہ ہوئی۔ اس پر ایک مخالف جماعت مدینہ پہنچی اور ان کی معزولی کا مطالبہ کیا حضرت عثمانؓ نے انہیں بھی ۲۹ھ میں بصرہ کی گورنری سے معزول کر دیا۔ یہ انتظامی تبدیلیاں اور معزولیاں مفید ثابت نہ ہوئیں اس طرح خلیفہ وقت کے خلاف مخالفتوں اور شکایتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شورش کے اسباب:

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابتدائی سال انتہائی آرام و سکون سے گذرے مگر اس کے بعد آہستہ آہستہ

۴. مراکش سے لے کر کابل تک ممالک اسلام کے زیر حکومت تھے۔ ان ملکوں میں جتنی قومیں آباد تھیں وہ سب مسلمانوں سے دشمنی رکھتی تھی ان قوموں میں مجوسی اور یہودی سب سے آگے تھے۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف فتنہ برپا کرنے میں بڑا کام کیا۔

۵. حضرت عثمان فطری طور پر بہت نرم دل، بامروت اور بردبار تھے۔ وہ دشمنوں سے درگذر کرتے تھے اس لیے شریروں کے حوصلے بڑھ گئے انہیں خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا۔

۶. حضرت عثمانؓ اموی تھے اس لیے قدرتی طور پر اپنے خاندان کے لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے ذاتی اموال سے ان کی مدد کرتے تھے شریر لوگوں عوام میں یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ وہ بیت المال سے اپنے خاندان والوں کی مدد کرتے ہیں حالانکہ یہ بات بالکل خلافِ واقعہ تھی ان کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔

۷. غیر مسلم قوموں کے شرارت پسند لوگ اس لیے انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔ کہ شاید اس طرح ان کو کچھ اقتدار حاصل ہو سکے؟ چنانچہ اس فتنہ میں یہ لوگ پیش پیش تھے۔ ان غیر قوموں کی اولاد اگرچہ مسلمان ہو گئی تھی لیکن انہیں اسلام سے حقیقی معنی میں نسبت نہیں تھی بسلمان ہو جانے کے باوجود ان کے دل مسلمانوں سے صاف نہ تھے۔

۸. بنو ہاشم، بنو امیہ کے عروج کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ وہ خلافت کے عہدے کا سب سے زیادہ مستحق اپنے آپ کو سمجھتے تھے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی پرانی رقابت

اور عداوت اور جاگیروں کا بڑا سبب بنی۔ دوسری طرف دیگر عرب قبیلے عہدوں اور جاگیروں کے استحقاق میں اپنے آپ کو قریش سے کمتر نہیں سمجھتے تھے وہ قریش کے غرور کو توڑنا چاہتے تھے۔

۹۔ مجوسی ایسا انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے جس کی رو سے زیادہ حکومت ایسے خاندان میں منتقل ہو جائے جو انہیں زیادہ سے زیادہ مراعات دے سکے۔ حالانکہ اسلام نے ہر ایک کو مراعات دی ہوئی تھیں۔

۱۰۔ مجوسیوں کے علاوہ یہودی یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی قوت اور شوکت کا خاتمہ ہو جائے اور وہ بڑھ نہ سکیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جماعت نے خفیہ سازش کا جال بچھانا شروع کر دیا اور انجام کار یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے خلافت اسلامی کو اس سے بہت ضعف پہنچا۔

شورش کا آغاز! کوفہ کی انقلابی جماعت میں اشتر نخعی، جندب، ابن الکواء، کمیل اور عمیر قابلیوں کے لیڈر تھے یہ سب لوگ قریش کے خلاف تھے اور یہ کہتے تھے کہ امارت اور خلافت میں سب مسلمان برابر کے شریک ہیں حضرت عثمانؓ نے ان لوگوں کو شام کی طرف جلا وطن کر دیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بصرہ میں بھی کچھ لوگ شورش کے سرغنہ تھے جو عوام کو حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے حضرت عثمانؓ نے ان لوگوں کو بھی ملک بدر کر دیا لیکن اس سے نفع کے بجائے نقصان ہوا۔ کیونکہ یہ لوگ جہاں گئے وہاں بھی انہوں نے اپنے خیالات کی اشاعت کی اور اپنے گرد ایک جماعت اکٹھی کر لی۔

مصر تو اس سازش کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ عبداللہ بن سبا یہودی نو مسلم یہیں رہتا تھا اس شخص نے اپنی شر پسند غیر معمولی قابلیت کی بدولت تمام مخالفوں اور مختلف الخیال مفسدوں کو ایک مرکز پر جمع کر لیا اس نے اپنی تحریک کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے اس کو مذہبی رنگ دیا۔ بلکہ مذہب میں عجیب و غریب عقائد گھڑ لیے اور خفیہ طریق

سے تمام اسلامی ملکوں میں ان غلط خیالات کی اشاعت کی۔

عبداللہ بن سبا شورش اور فتنہ و فساد کا سرغنہ تھا۔ اس نے مختلف الخیال پارٹیوں کو ایک جگہ متحد کر لیا۔ مثلاً اہل مصر حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اہل بصرہ حضرت طلحہؓ کو اور اہل کوفہ حضرت زبیرؓ کو۔ ان کے برعکس عراقی تمام قریش سے دشمنی رکھتے۔ ایک جماعت سرے سے کام کرنے والوں کے خلاف تھی عبداللہ ابن سبا نے اپنی عیاری سے کام لے کر ان تمام مختلف الخیال لوگوں کو حضرت عثمان کی مخالفت پر متحد کر دیا اس نے تمام ملکوں میں اپنے داعی اور کارکن پھیلا دیئے اور اس مقصد کے حصول کے لیے کارکنوں کو حسب ذیل ہدایات دیں۔

ا۔ متقی اور دینداری کے لباس میں لوگوں کو وعظ و نصیحت سے اپنا معتقد بنائیں۔
ب۔ عمال اور بڑے بڑے عہدیداروں کو مختلف طریقوں سے پریشان کریں۔
ج۔ ہر مجلس میں ہر جگہ امیرالمومنین کی اقربا نوازی اور ناانصافی کی داستانیں بیان کر کے لوگوں کو بدظن کریں۔

جب رومیوں نے ساحل شام پر حملہ کیا اور تمام مسلمان مدافعت میں مصروف تھے اس زمانہ میں بھی یہ لوگ اپنی شرارت سے باز نہ آئے محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابی بکر باغیوں کے سردار تھے وہ مجاہدین سے برملا کہتے تھے کہ شام کے بجائے مدینہ میں جا کر جہاد کرنا چاہیے۔ کہ حضرت عثمانؓ کے خلاف جہاد کرنا اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

شورش اور بغاوت کی آگ اندر اندر مدت سے سلگ رہی تھی لیکن کئی سال تک علانیہ مخالفت کی جرأت نہ ہو سکی۔ ۳۵ھ میں ان کا زور اس قدر بڑھ گیا کہ ایک دن حضرت عثمانؓ منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ ایک فتنہ پرداز نے کھڑے ہو کر کہا۔ "اے عثمانؓ! کتاب اللہ کو اپنے پیش نظر بنا" انہوں نے حسب عادت نرمی سے کہا "بیٹھ جاؤ" وہ نہ مانا اور اسی طرح گستاخی کرتا رہا۔ اس کے بعد مفسدوں نے آپ کو نرغہ میں لے کر

سنگ زنی دں کی اس شدت سے بارش کی کہ نائب رسولؐ زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر پڑے لیکن اس کے باوجود کسی کو سزا نہ دی۔

حضرت عثمانؓ پر اعتراضات :

ان شر پسندوں نے حضرت عثمانؓ پر مندرجہ ذیل اعتراضات کیے۔

۱۔ بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ آپ نے بعض نامور صحابہؓ مثلاً ابو موسیٰ اشعری، مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن العاص، عمار بن یاسر، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن ارقم کو معزول کرکے ان کی جگہ اپنے خاندان کے نا اہل افراد کو مقرر کیا۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ بیت المال کے مال میں بے جا تصرف کیا اور اپنے رشتہ داروں کو بڑی بڑی رقمیں عطا کیں مثلاً حکم بن عاص کو دوبارہ مدینہ میں سکونت کی اجازت دے دی اور بیت المال سے ایک لاکھ درہم بھی عطا کیے مروان کو افریقہ کے مال غنیمت کا خمس عطا کیا۔ عبداللہ بن خالد کو تین لاکھ درہم عطا کیے۔ اپنی صاحبزادیوں کو بیت المال کے قیمتی جواہرات عطا کیے اپنے لیے بیت المال کی رقم سے ایک محل تعمیر کرایا جب عبداللہ بن ارقم مہتمم بیت المال نے اس پر اعتراض کیا تو انہیں معزول کر کے زید بن ثابت کو یہ عہدہ عطا کر دیا اور ایک مرتبہ انہیں بلا وجہ ایک لاکھ درہم کر دیے۔

۳۔ مدینہ کے اطراف میں لقیع کو سرکاری چراگاہ قرار دیا اور عوام کو اپنے جانور چرانے سے محروم کر دیا۔

۴۔ مدینہ کے بازار میں بعض اشیاء کی خرید فروخت اپنے لیے مخصوص کر لی۔ مثلاً کھجور کی گٹھلیاں ان کے گماشتہ کے علاوہ اور کوئی شخص نہیں خرید سکتا تھا۔

۵۔ بعض بلند مرتبہ صحابہؓ کو ذلیل کیا گیا اور ابوذر غفاریؓ، عمار بن یاسرؓ، جندب ابن جنادہؓ عبداللہ بن مسعود اور ابی کعب صامت کے ساتھ غیر عادلانہ سلوک کیا گیا عبداللہ بن مسعود اور ابی کعب کے وظیفے بند کر دیے۔

۶. ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ زید بن ثابت کے مرتب کردہ مصحف کے علاوہ باقی تمام مصاحف کو جلا دیا۔

۷. حدود قوانین شرعیہ کے اجراء میں تغافل سے کام لیا اور فرائض میں تمام امت کے خلاف روایاتِ شاذ پر عمل کیا گیا۔ اس کے برعکس حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ جب تک روایات کی تحقیق نہیں کر لیتے تھے ان کو تسلیم نہیں کرتے تھے مزید برآں یہ کہ بعض نئی باتیں ایجاد کیں جن کو اکثر صحابہؓ نے ناپسند کیا مثلاً حج کے موقعہ پر منیٰ میں دو کے بجائے چار رکعت نماز پڑھی۔

اعتراضات کی حقیقت :

ان اعتراضات کی حقیقت حسب ذیل ہے

(۱) بڑا اعتراض معزولی کا ہے۔ اگر عہدیداروں کو معزول کر دینا کوئی جرم ہے تو فاروق اعظمؓ اور حضرت علیؓ پر بھی اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمرو بن عاصؓ نے بغاوتِ اسکندریہ فرو کرنے میں ذمیوں کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ علاوہ بریں نہریں جاری ہو جانے کے بعد بھی وہ مصر کی مالگذاری میں اضافہ نہ کر سکے تھے۔

سعد وقاصؓ کی معزولی کا سبب بیت المال کا قرض ہوا۔ ابو موسیٰ اشعری کی معزولی کا مطالبہ خود اہل بصرہ نے کیا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ پر رشوت کا الزام تھا۔ عمار بن یاسر کو خلیفہ دوم فاروق اعظمؓ نے معزول کیا تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی معزولی البتہ بلا سبب تھی۔ عبداللہ بن ارقمؓ کی سبکدوشی کے متعلق حضرت عثمانؓ کا بیان موجود ہے کہ میں نے ان کو ضعف اور کبر سنی کی وجہ سے معزول کیا ہے۔

۲. جہاں تک نئے عہدیداروں کا تعلق ہے ولید بن عقبہ، سعید بن عاص، عبداللہ ابن عامر اور عبداللہ بن ابی سرح اگرچہ کچھ زیادہ زاہد اور متقی نہ تھے مگر ان کے کارنامے ان کو نااہل ثابت نہیں کرتے۔ طبرستان، آرمینیہ، طرابلس، مراکش، قبرص، کابل، ہرات، سجستان اور نیشاپور انہی لوگوں نے فتح کئے تھے

۲۔ اپنے خاندان کے افراد کو عہدوں پر انہوں نے ضرور فائز کیا۔ وہ اسے صلہ رحمی سمجھتے تھے ایک دفعہ جب لوگوں نے ان سے شکایت کی تو صحابہؓ کو جمع کر کے ان سے پوچھا گیا تو آنحضرتؐ تمام عربوں پر قریش کو اور بنو ہاشم کو قریش پر ترجیح نہیں دیتے تھے؟ لوگ خاموش رہے تو انہوں نے کہا اگر میرے ہاتھ میں جنت کی کنجیاں ہوتیں تو تمام بنو امیہ کو اس میں بھر دیتا۔ بہرکیف یہ ان کا اجتہاد تھا۔

۴۔ یہ الزام کہ انہوں نے بیت المال میں بے جا تصرف کیا بالکل بے بنیاد ہے حضرت عثمانؓ تمام صحابہؓ میں سب سے زیادہ دولت مند تھے۔ تاریخ اور سیرت کی تمام کتابیں ان کی سخاوت اور فیاضی کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ خود انہوں نے ایک تقریر میں اس الزام کی تردید ان الفاظ میں کی۔

"لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے خاندان والوں سے محبت کرتا ہوں اور انہیں عطیات سے نوازتا ہوں لیکن میری محبت اور فیاضی نے کبھی بھی مجھ کو ظلم کی طرف مائل نہیں کیا میں اپنے ذاتی اموال میں سے دیتا ہوں بیت المال سے نہیں دیتا مسلمانوں کے مال کو اپنے لیے یا دوسروں کے لیے حلال نہیں سمجھتا ہیں۔ آنحضرتؐ اور شیخین کے زمانہ میں بھی اپنے اموال میں سے گرانقدر عطیات دیا کرتا تھا۔ خدا کے مال میں ایک پیسہ کا تصرف بھی نہیں کیا میں کھاتا بھی ہوں تو اپنے ذاتی مال سے بیت المال سے اپنے لیے کچھ نہیں لیتا۔

۵۔ حکم بن عاص کو آنحضرتؐ نے بے شک جلاوطن کر دیا تھا مگر حضرت عثمانؓ نے آخر عہد میں آنحضرتؐ سے اس کے لیے مدینہ واپس آجانے کی اجازت لے لی تھی۔ جب انہوں نے اس کے لڑکے مروان سے اپنی لڑکی کی شادی کی۔ تو اس کو اپنے پاس سے ایک لاکھ درہم عطا کئے۔ عبد اللہ بن خالد کو تین لاکھ کا عطیہ دیا لیکن یہ رقم انہوں نے بیت المال سے قرض لی تھی۔ صاحبزادیوں کو جواہرات دینے اور بیت المال کے روپے سے محل تعمیر کرنے کا الزام بالکل غلط ہے۔ اسی طرح زید بن ثابت کو ایک لاکھ درہم دینے کی روایت بھی بے بنیاد ہے۔

۶۔ چراگاہ کے بارے میں اعتراض بھی بالکل غلط اور بے معنی ہے تمام سرکاری چراگاہیں سرکاری روپیہ سے تیار ہوئی تھیں۔ اس لیے عوام کو ان سے استفادہ کا کوئی حق نہیں تھا۔ اور اگر یہ الزام عائد کیا جائے کہ انہوں نے سرکاری چراگاہوں کو اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ خود حضرت عثمانؓ کا بیان ہے کہ جب میں خلیفہ ہوا تو کسی کے پاس مجھ سے زیادہ مویشی نہ تھے لیکن اب میرے پاس نہ کوئی اونٹ ہے نہ بکری۔ صرف حج کے لیے دو اونٹ رہ گئے ہیں

۷۔ بازار میں بعض اشیاء کی خرید و فروخت کو اپنے لیے مخصوص کر لینے کی داستان بالکل غلط ہے۔ ممکن ہے کھجور کی گٹھلیوں کو سرکاری اونٹوں کے کھلانے کے لیے مخصوص کر لیا گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

۸۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو قطعات زمین اور جاگیریں دینے کا اعتراض بھی غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یمن کے کچھ لوگ مدینہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ کہ

حضرت عثمانؓ نے ان لوگوں کی سہولت کے لیے زمینوں کا ان کی یمن کی جائیداد سے تبادلہ کر لیا تھا۔ مثلاً حضرت طلحہؓ کو یمن میں ایک قطعۂ زمین دیا تو عرب میں ان کی جائیداد اس کے معاوضہ میں لے لی۔

عراق میں بہت سی زمین غیر آباد پڑی ہوئی تھی جن لوگوں نے اسے قابلِ زراعت بنایا۔ حضرت عثمانؓ نے حدیث نبویؐ پر عمل کر کے ان لوگوں کو ان زمینوں کا مالک بنا دیا۔

۹۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو حضرت عثمانؓ نے جلاوطن نہیں کیا، بلکہ ان سے کہا۔ کہ آپ میرے ساتھ رہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھ کو تمہاری دنیا کی مطلق ضرورت نہیں عبادہ بن صامت پر بھی کوئی سختی نہیں ہوئی۔ ہاں عمار بن یاسر، جندب بن جنادہ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ کچھ سختی کا برتاؤ ہوا۔ مگر اس سے ان کی تذلیل نہیں ہوئی۔

۱۰۔ مصاحف جلا دینے کا الزام سراسر لغو اور مہمل ہے۔ حضرت عثمانؓ نے خود کوئی

صحیفہ مدون کر کے دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا۔ بلکہ جو مصحف صدیق اکبرؓ نے مرتب کرایا تھا اسی کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے کرائیں اور مختلف شہروں میں بھجوائیں اور اس طرح ساری امت کو ایک ہی قرآن پر متحد اور متفق رکھا۔

۱۱۔ حضرت عثمانؓ نے شرعی حدود کے اجراء میں کبھی تغافل سے کام نہیں لیا۔ مخالفین الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے عبید اللہ بن عمرؓ سے ہرمزان کے قتل کا قصاص نہیں لیا حالانکہ انہوں نے اس مقدمہ کا بہت عمدہ فیصلہ کیا کہ ہرمزان کا کوئی وارث نہیں اس لیے امیر المومنین کی حیثیت سے میں خود ولی ہوں اور قتل کے بجائے دیت پر راضی ہوں اس کے بعد اپنی جیب سے دیت کی رقم ادا کر دی۔ اسی طرح جب ان گواہوں پر اطمینان ہو گیا تو انہوں نے ولید بن عقبہ والیٔ کوفہ پر شراب نوشی کے جرم میں فوراً حد جاری کر دی۔

یہ الزام کہ حضرت عثمانؓ نے موثق روایات کے مقابلہ میں شاذ روایات پر عمل کیا بالکل غلط ہے۔ بعض اجتہادی مسائل میں انہوں نے دوسرے صحابہؓ سے اختلاف ظاہر کیا اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

مذہب میں بدعات کو داخل کرنے کا الزام سراسر غلط بلکہ بہتان ہے سنت نبویؐ کی پیروی تو آپ کی زندگی کا خاص شعار رہا۔ منیٰ میں چار رکعت نماز صرف اس لیے پڑھی تھی کہ وہاں کچھ قیام کی نیت کر لی تھی۔

اصلاح احوال کی کوشش: حضرت عثمانؓ نے تمام عمال کو اپنے پاس طلب کر کے مجلس شوریٰ منعقد کی۔ اس میں امیر معاویہ، عبد اللہ بن ابی سرح، سعید بن العاص، عبد اللہ بن عامر اور عمرو بن العاص خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سعید نے کہا وہ مفسدین کے سرداروں کو قتل کر دینا چاہیے۔

معاویہ نے کہا ''ہر عامل اپنے صوبہ میں امن قائم رکھنے کا ذمہ لے''

عبداللہ بن عامر نے کہا "کسی ملک پر فوج کشی کر دی جاتے۔ تاکہ لوگوں کی توجہ جہاد پر مبذول ہو جائے۔

عبداللہ بن سعد نے کہا "چونکہ شورش پسند گروہ لالچی ہے اس لیے مال و زر سے اس کا منہ بند کر دینا چاہیے۔

عمرو بن عاص نے کہا "آپ کی بے اعتدالیوں نے لوگوں کو شورش پر آمادہ کیا ہے یا تو آپ عدل و انصاف سے کام لیں یا خلافت سے کنارہ کش ہو جائیں۔

کوفہ کے مفسد سعید بن عاص والی کوفہ سے بغض و عناد رکھتے تھے جب وہ مدینہ سے واپس آتے تو مفسدین نے ان کو پھر مدینہ واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

حضرت عثمانؓ نے ان کی خواہش کے مطابق سعید کو معزول کر کے ابو موسیٰ اشعری کو کوفہ کا والی مقرر کر دیا۔

حضرت طلحہؓ نے مشورہ دیا کہ تحقیق حال کے لیے مختلف صوبوں میں وفود روانہ کئے جائیں چنانچہ ۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ نے محمد بن مسلمہ کو کوفہ اسامہ بن زید کو بصرہ، عمار بن یاسر کو مصر اور عبداللہ بن عمرؓ کو شام روانہ کیا۔ نیز اعلان جاری کیا کہ جس شخص کو مجھ سے یا میرے کسی عامل سے کوئی شکایت ہو وہ حج کے موقع پر بلا تامل بیان کرے میں تحقیقات کے بعد ظالم سے مظلوم کا حق دلاؤں گا۔

حضرت عثمانؓ تو یوں اصلاح کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کوفہ، بصرہ اور مصر کے فتنہ پردازوں نے حاجیوں کے لباس میں مدینہ کا رخ کیا۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر ان لوگوں نے باری باری حضرت علیؓ، طلحہؓ و زبیرؓ سے مل کر ان سے درخواست کی کہ معاملے کرا دیں۔ لیکن سب نے اس جھگڑے میں پڑنے سے انکار کر دیا۔

جب حضرت عثمانؓ نے مفسدین کے اجتماع کی خبر سنی تو حضرت علیؓ کو بلا کر کہا کہ ان لوگوں کو راضی کر کے واپس بھیج دیجئے میں ان کے جائز مطالبات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں، چنانچہ حضرت علیؓ کے سمجھانے سے یہ لوگ واپس چلے گئے۔

چند روز کے بعد یہ لوگ پھر واپس آ گئے اور انتقام انتقام کی صدائیں بلند کرنے لگے۔ حضرت علیؓ نے ان کی واپسی کا سبب دریافت کیا تو مصریوں نے کہا کہ راہ میں ہم کو دربار خلافت کا ایک قاصد ملا جو نہایت تیزی کے ساتھ مصر جا رہا تھا اس کی مشتبہ حالت سے ہمیں بدگمانی ہوئی چنانچہ ہم نے اس کی تلاشی لی تو یہ فرمان برآمد ہوا کہ جب ہم لوگ مصر پہنچیں تو ہمیں قتل کر دیا جائے۔ اب ہم اس بدعہدی کا انتقام لینے آئے ہیں۔

حضرت عثمانؓ اس واقعہ کو سن کر بہت متعجب ہوئے انہوں نے قسم کھا کر بیان کیا کہ میں نے اس قسم کا کوئی خط نہیں لکھوایا۔ مصریوں نے کہا کہ ہم آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ میں اس خلعت کو جو اللہ نے مجھے پہنایا ہے خود اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں اتاروں گا۔ اور آنحضرتؐ کی وصیت کے مطابق آخر وقت تک صبر کروں گا۔

شہادت کی سازش: مصر کے فتنہ پردازوں نے حضرت عثمانؓ کے مکان کا سختی کے ساتھ محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ چالیس روز تک مسلسل قائم رہا۔ اس عرصہ میں پانی اندر پہنچانا بھی بند کر دیا۔ امیر المومنین حضرت ام حبیبہؓ نے ایک مرتبہ کھانا اور پانی اندر پہنچانے کی کوشش کی مگر باغیوں کے دل چونکہ نور ایمان سے بالکل خالی ہو چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے بے ادبی کے ساتھ انہیں واپس کر دیا۔

حضرت عثمان نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کو مشورہ کے لیے طلب کیا لیکن مفسدوں نے ان کو بھی روک دیا۔ مجبوراً انہوں نے اپنا سیاہ عمامہ قاصد کو دے کر کہا کہ اسے لے جاؤ اور حالات سے مطلع کر دو۔ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ نے بھی مصالحت کی کوشش کی لیکن باغیوں نے کوئی بات نہ مانی۔ حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دروازہ پر حفاظت کے لیے متعین کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ خلیفہ مظلوم کے مکان میں حفاظت کے لیے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اتمام حجت کے لیے حضرت عثمانؓ اپنے مکان کی چھت پر تشریف لاتے اور فرمایا کہ

اے لوگو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب آنحضرتؐ مدینہ تشریف لائے تو یہ مسجد بہت چھوٹی تھی۔ آپ نے فرمایا "کون شخص اس مسجد سے متصل زمین کو خرید کر مسلمانوں پر وقف کرے گا تاکہ اسے جنت میں اس سے بہتر جگہ ملے؟ میں نے آپؐ کے ارشاد کی تعمیل کی۔ لیکن آج تم مجھے اسی مسجد میں نماز بھی نہیں پڑھنے دیتے۔ پھر فرمایا۔ جب آنحضرتؐ مدینہ تشریف لائے تو بیر رومہ کے سوا میٹھے پانی کا کوئی کنواں اس شہر میں نہ تھا آپؐ نے فرمایا کون اس کنویں کو خرید کر مسلمانوں پر وقف کرتا ہے تاکہ اللہ اس سے بہتر کنواں اسے جنت میں دے؟ میں نے آپؐ کے ارشاد کی تعمیل کی لیکن آج تم نے مجھے اسی کنواں کے پانی سے محروم رکھا ہے۔" پھر فرمایا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر میں نے لاکھوں روپے خرچ کر کے فوج کے لئے سامان جنگ مہیا کیا تھا؟ پھر فرمایا "بیعت رضوان کے موقع پر جب مجھے سفیر بنا کر مکہ بھیجا تھا۔ کیا آنحضرت نے اپنے ایک دست مبارک کو میرا ہاتھ قرار نہیں دیا تھا؟" باغیوں پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

آپ نے باغیوں سے کہا کہ تم لوگ کس خطا پر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو؟ اسلام میں کسی کو قتل کرنے کی تین ہی وجوہ ہو سکتی ہیں یا اس شخص نے بدکاری کی ہو یا کسی بے گناہ کو قتل کیا ہو یا مرتد ہو گیا ہو۔ میں نے نہ کبھی زنا کیا نہ کسی کو قتل کیا نہ اسلام ترک کیا۔ لیکن باغیوں پر اس تقریر کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

مغیرہ بن شعبہ نے عرض کی کہ تین باتوں میں سے ایک کو اختیار کر لیجئے یا تو ان باغیوں کا قلع قمع کر دیجئے یا دیوار توڑ کر خفیہ طریق سے مکہ معظمہ چلے جائیے یا پھر شام کا رخ کیجئے وہاں سب لوگ آپ کے وفادار ہیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے کوئی بات پسند نہ کی۔

واقعات شہادت:۔ حضرت عثمانؓ کا مکان بہت وسیع تھا۔ اس کے اندر سات سو سے زیادہ جان نثار موجود تھے۔ عبداللہ ابن زبیرؓ اس جمعیت کے سردار تھے۔ وہ اپنے عہد کے مشہور بہادروں میں سے تھے۔ انہوں نے عرض کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان باغیوں سے جنگ کروں۔" فرمایا "میں ہر شخص کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ

میرے لئے خونریزی نہ کرے حضرت زید بن ثابت نے عرض کی کہ انصار مدینہ دروازہ پر کھڑے ہیں اور عرض کرتے ہیں "اگر اجازت ہو تو ہم اپنی شجاعت کے کارنامے دنیا کو دکھائیں" جواب دیا میں خونریزی کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں دوں گا۔"

آپ کو آنحضرت ؐ کی پیش گوئی کے مطابق اپنی شہادت کا یقین کامل تھا۔ شہادت سے پہلے انہوں نے اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا اور اپنی اہلیہ سے کہا کہ میری شہادت کا وقت قریب آگیا ہے میں چاہتا ہوں کہ پاجامہ پہن لوں تاکہ بعد شہادت میرا جسم برہنہ نہ ہو جائے اس کے بعد قرآن مجید کھول کر تلاوت میں مشغول ہو گئے۔

باغیوں نے مکان پر حملہ کر دیا، اور چار باغی جن میں حضرت ابوبکرؓ کا چھوٹا بیٹا محمد آگے آگے تھا، چھت پر چڑھ کر نیچے اُترے۔ یہ لوگ اس جگہ پہنچے جہاں حضرت عثمانؓ تلاوت کر رہے تھے۔ صدیق اکبرؓ کے نالائق بیٹے نے (جس نے حضرت علیؓ جیسے بزرگ کی آغوش میں پرورش پائی تھی) خلیفہ وقت کی ریش مبارک پکڑ کر زور زور سے کھینچی اور دشنام دہی سے اپنے نامہ اعمال کو سیاہ کیا صبر و حلم کے مجسمہ حضرت عثمانؓ نے جواب میں صرف اس قدر کہا کہ بھتیجے! اگر تمہارے باپ تمہاری اس حرکت کو دیکھتے تو یقیناً ناپسند کرتے" یہ سُن کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے بدبخت کنانہ ابن بشر نے پیشانی مبارک پر لوہے کی لاٹھ اس زور سے ماری کہ امیر المومنینؓ پہلو کے بل گر پڑے لیکن اس حال میں بھی "بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ" زبان سے نکلا۔ سودان بن حمران نے دوسری ضرب لگائی۔ عمرو بن الحمق نے سینہ پر چڑھ کر نو زخم لگائے۔ پانچویں شقی نے تلوار کا وار کیا۔ وفادار بیوی حضرت نائلہ نے ہاتھ پر روکا ان کی تین انگلیاں کٹ کر گر پڑیں یہ وار اس قدر کاری تھا کہ حضرت عثمانؓ مرتبہ شہادت پر فائز ہو گئے۔ (اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ)

شہادت کے وقت حضرت عثمانؓ تلاوت کر رہے تھے ان کے خون نے جس آیت کو رنگین کیا وہ یہ تھی۔ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

حضرت عثمانؓ جمعہ کے دن عصر کے وقت شہید کئے گئے۔ مدینہ میں باغیوں کا قبضہ تھا۔ دو دن تک کسی کو علانیہ دفن کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر ہفتہ کی رات میں چند آدمیوں نے

تدفین کی ہمت کی اور غسل وکفن کے بغیر اسی خون آلود پیرہن میں شہید مظلوم کا جنازہ اٹھایا۔ صرف سترہ آدمیوں نے جنازہ کی نماز پڑھی اور جنت البقیع کے پیچھے خاموشی کے ساتھ دفن کر دیا

شہادت کے نتائج:۔ حضرت عثمان غنی کی شہادت سے اسلام اور مسلمانوں کو سخت صدمہ پہنچا ان کی شہادت صرف ایک فرد کی شہادت نہ تھی۔ بلکہ ایک مقدس اصول کی پامالی تھی۔ اور اُن کے خلاف سازش صرف ایک خلیفہ وقت کے خلاف وقتی اور ہنگامی سازش نہ تھی۔ بلکہ اُس نے آئندہ کے لئے ایک خوفناک دور کا آغاز کر دیا۔

حضرت عثمان نے کئی بار فتنہ انگیزوں کو کہا تھا۔ اگر تم نے مجھے شہید کر دیا۔ تو یاد رکھو آئندہ کبھی متحدہ نہ رہ سکو گے۔ نماز بھی یک جا ادا نہ کر سکو گے آپ کی یہ تنبیہ حرف بحرف پوری ثابت ہوئی۔ آپ کی شہادت کے بعد مسلمان فوراً مستقل طور پر اہل سنت والجماعت، شیعہ اور خارجی وغیرہ فرقوں میں بٹ گئے۔ اور وحدت اسلامی پارہ پارہ ہو گئی۔

آپ کی شہادت سے قتل وغارت گری کا وہ دروازہ کھلا جو مدتوں بند نہ ہو سکا۔ مسلمان آپس میں یوں دست وگریبان ہوئے کہ مدتوں قتل وخون کا بازار گرم رہا۔ آپ کی خون آلود قمیص اور حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں شام میں پہنچیں اور مجمع عام میں لوگوں کو دکھائی گئیں۔ اس سے ایک شور قیامت بپا ہو گیا۔ اور ہر طرف سے انتقام انتقام کی صدا بلند ہو گئی۔

اسلام کی فتوحات کا سیلاب ایسا رُکا کہ مدتوں اسلام کے مجاہد باہر کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے۔ باہمی آویزشوں نے بیرونی دشمنوں سے یکسر غافل کر دیا۔

نظامِ خلافت

اسلامی حکومت کی بنیاد شوریٰ پر تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کو زیادہ منظم کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی اپنے ابتدائی عہد میں اس نظام کو برقرار رکھا۔ لیکن آخر عہد میں مروان بن حکم نے حضرت عثمانؓ کی نیکی اور سادگی سے ناجائز فائدہ

اٹھا کر شوریٰ کے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ اس کے باوجود لوگوں میں آزادی کی روح موجود تھی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے عبداللہ ابن ابی سرح کو طرابلس کے مال غنیمت کا پانچواں حصّہ عطا کیا۔ تو بہت آدمیوں نے اس پر اعتراض کیا اور خلیفہ کو اُسے واپس لینا پڑا۔ یہ اسی آزادی رائے کی برکت تھی۔

حضرت عثمانؓ نے تمام صوبوں کے عاملوں کی مجلس شوریٰ قائم کی اس کے ارکان سے تمام اہم معاملات میں تحریری رائے طلب کی جاتی تھی۔ کبھی کبھی دارالخلافت میں اس مجلس کے باقاعدہ جلسے بھی منعقد ہوتے تھے۔ چنانچہ ۳۴ھ میں اس قسم کا جلسہ منعقد ہوا تھا۔

آپ نے ملک شام کے تینوں صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ بنا دیا تھا۔ دوسرے صوبے بعینہٖ برقرار رکھے گئے۔ البتہ نئے مفتوحہ ممالک یعنی طرابلس، قبرص، آرمینیہ، طبرستان جداگانہ صوبے قرار پائے۔

آپ نے افسر فوج کا عہدہ ایجاد کیا۔ اس سے پہلے صوبہ کا گورنر ہی فوج کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ عمرو بن عاص مصر کے گورنر اور عبداللہ بن ابی سرح مصری فوج کے سپہ سالار مقرر کئے گئے۔

حضرت عثمانؓ بہت رحم دل تھے۔ اور ہر شخص سے نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن حکام سے باز پرس کرنے میں سختی سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت سعد وقاص کو اس بنا پر معزول کر دیا کہ انہوں نے بیت المال سے جو رقم قرض لی تھی اسے واپس نہیں کیا۔ ولید بن عقبہ نے شراب پی تو علانیہ حد جاری کی۔ ابو موسیٰ اشعریؓ نے امیرانہ زندگی اختیار کی تو انہیں معزول کر دیا۔ عمرو بن العاص کو اس لئے معزول کر دیا کہ وہ مصر کے خراج میں اضافہ نہ کر سکے۔

آپ حالات معلوم کرنے کے لئے مدینہ سے وفد روانہ کرتے رہتے تھے۔ اور ہر جمعہ خطبہ سے پہلے لوگوں سے ملکی خبریں دریافت کرتے۔ حج کے ایام میں ہر شخص براہ راست

اپنا مسئلہ پیش کر سکتا تھا۔

حضرت عثمانؓ نے تمام صوبوں میں مختلف دفاتر کے لئے اچھی عمارتیں بنوائیں رفاہ عام کے لئے سڑکیں، پل اور مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ مہمان خانے اور مسافر خانے بنوائے راستوں پر چوکیاں، سرائیں اور کنوئیں تعمیر کرائے مدینہ کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے بند بندھوایا، اور نہر کھدوا کر سیلاب کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔

فوجی خدمات کے صلہ میں جن لوگوں کے وظیفے مقرر تھے۔ آپ نے ان میں سو سو درہم کا اضافہ کیا۔ فوجی محکمہ کو انتظامی محکموں سے الگ کر دیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ فوجوں کی نقل و حرکت میں بہت آسانی ہو گئی طرابلس، قبرص، آرمینیہ اور طبرستان میں نئے فوجی مرکز قائم کئے۔ تمام ملک میں اونٹوں اور گھوڑوں کی پرورش کے لئے وسیع چراگاہیں بنوائی گئیں۔

دینی خدمات:- نائب رسولؐ کا سب سے اہم فرض تبلیغ اسلام ہے۔ حضرت عثمانؓ اس فرض سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ جو قیدی گرفتار ہو کر آتے ان کو اسلام کی دعوت دیتے۔ مسلمانوں کی مذہبی تربیت کا بھی خیال رکھتے خطبوں میں فقہ کے مسائل بیان کرتے اور جس مسئلہ میں شبہ ہوتا اس کو دوسرے صحابہؓ سے دریافت کرتے رہتے۔

دینی خدمات کے سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے قرآن حکیم کی متعدد نقلیں تیار کرا کے تمام صوبوں میں بھجوائیں۔ جس کی وجہ سے قرآن کریم ہمیشہ کے لئے تحریف سے محفوظ ہو گیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ عراق، آرمینیہ، آذربائیجان، شام اور مصر کے مسلمانوں کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ وہ قرأت میں باہم اختلاف کرتے ہر شخص اپنی قرأت کو شخص اپنی قرأت کو صحیح سمجھتا۔ حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے یہ حالت دیکھی تو انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ اگر آپ نے جلد اس کی اصلاح نہ کی تو مسلمان بھی یہود و نصاریٰ کی طرح کتاب اللہ

میں اختلافات کریں گے چنانچہ انہوں نے حضرت حفصہؓ سے عہد صدیقی کا نسخہ لے کر اس کی نقلیں کرائیں اور ان تمام مصاحف کو جن میں اختلافات قرأت پائے جاتے تھے دریا برد کرا دیا۔ اگر حضرت عثمانؓ ایسا نہ کرتے تو قرآن کا بھی وہی حال ہو جاتا جو دوسری آسمانی کتابوں کا ہوا۔

آنحضرتؐ کے عہد میں آپ نے مسجد نبویؐ کی توسیع کے لئے اس کی متصل زمین خرید کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ خود اپنے عہد میں لوگوں سے اپیل کر کے مسجد کے متصل والے مکان حاصل کئے۔ اور سابقہ مسجد سے تقریباً پچاس گز زیادہ وسیع مسجد از سر نو تعمیر کرائی۔

حضرت عثمانؓ لکھنا پڑھنا بخوبی جانتے تھے۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے آپ کو کاتب وحی مقرر کیا تھا۔ آپ نے جو فرامین اور خطوط بھیجے ان سے بھی علمیت اور انشا پردازی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ قرآن حکیم کی تلاوت سے خاص شغف تھا۔ چونکہ کاتب وحی رہ چکے تھے اس لئے ہر آیت کی شان نزول اور اس کے حقیقی مفہوم سے آگاہ تھے۔ آیات قرآنی سے استدلال کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔

آپ کی کل روایات کی تعداد ۱۴۶ ہے۔ جن میں سے ۳ متفق علیہ ہیں یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ روایات میں بہت محتاط تھے۔ اس لئے صرف ڈیڑھ صد کے قریب روایات ہیں۔

سیرت و کردار : پیدائشی طور پر پارسا، پرہیز گار، پاکباز اور امتیاز تھے رحمدلی اور حیا ان کی سیرت میں سب سے نمایاں تھیں، شراب کبھی نہیں پی جوا نہیں کھیلا، کذب افترا اور فسق و فجور سے ہمیشہ دور رہے۔

خوف خدا: تمام صفات حسنہ کا سرچشمہ ہے اور حضرت عثمانؓ پر خوف خدا ہمیشہ غالب رہتا تھا۔ قبرستان میں جاتے تو بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ قرآن

مجید کی تلاوت کرتے تو رقت طاری ہو جاتی۔

آپ کو آنحضرتؐ سے اس قدر محبت تھی کہ اپنے محبوب آقا کی فقیرانہ زندگی دیکھ کر بے قرار ہو جاتے اور جب موقع ملتا تو آنحضرتؐ کی خدمت میں تحائف پیش کرتے۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ کے فاقہ کا حال معلوم ہوا تو بے اختیار ہچکی بندھ گئی اور اسی وقت کھانے پینے کا بہت سا سامان اور ۳۰۰ درہم نقد لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے

حضورؐ کا ادب و احترام اس درجہ تھا کہ جس ہاتھ سے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ پھر اس کو ساری عمر ہر قسم کی نجاست سے پاک اور دور رکھا۔

شرم و حیاء آپ کا امتیازی وصف تھا اور اس درجہ نمایاں تھا کہ خود آنحضرتؐ ان کی شرم و حیاء کا پاس فرماتے۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ صحابہؓ کے مجمع میں اس طرح تشریف فرما تھے کہ زانوئے مبارک کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ حاضر خدمت ہوئے تو زانو ڈھک گیا۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا: "عثمانؓ سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں"

ناز و نعمت میں پرورش پائی تھی۔ اور اس لئے حضرت عمرؓ کی طرح موٹا کپڑا نہیں پہن سکتے تھے تاہم ان کی طبیعت عیش و عشرت کی طرف مائل نہ تھی۔ انتہائی دولت و ثروت کے باوجود امیرانہ زندگی بسر نہیں کی۔

تواضع اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ پچاسیوں لونڈی غلام موجود تھے۔ تاہم اپنا کام خود انجام دیتے۔ رات کو تہجد کے لئے دوسروں کو نہ اٹھاتے خود ہی اپنے وضو کا انتظام کر لیتے۔ ایک دفعہ منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا "عثمان! توبہ کر اور اپنی بے اعتدالیوں سے باز آ" یہ سنکر قبلہ رخ ہو کر کہا "اے خدا پہلا توبہ کرنے والا ہوں جو تیری بارگاہ میں توبہ کے لئے حاضر ہوا ہے"

ایثار اور فیاضی کا یہ عالم تھا کہ عہد خلافت میں ذاتی مصارف کے لئے بیت المال سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ اپنی دولت سے اسلام اور مسلمانوں کو اس قدر فائدہ پہنچایا کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ بیس ہزار درہم میں بئر رومہ خرید کر مسلمانوں پر وقف کر دیا۔ مسجد نبویؐ کی

توسیع میں ہزاروں روپیہ صرف کر دیا۔ اور غزوۂ تبوک میں تہائی فوج کو اپنے خرچ سے سارا سامان مہیا کیا اور ایک ہزار دینار سرخ نقد پیش کئے۔ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے صدہا بیواؤں اور تیامیٰ کی خبر گیری کرتے تھے۔

شہادت کے موقع پر چالیس دن تک جس صبر و تحمل کا اظہار کیا اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ سینکڑوں غلام اور ہزاروں انصار سرفروشی کے لئے تیار تھے مگر حضرت عثمانؓ نے اپنی ذات کے لئے جنگ وجدل کی اجازت نہ دی۔ اپنی جان دے دی۔ لیکن مسلمانوں کا خون نہیں بہایا۔

دینداری اور عبادت گذاری کا یہ عالم تھا۔ کہ کبھی کبھی ایک ہی رکعت میں پورا قرآن مجید ختم کر لیتے۔ عموماً ہر تیسرے دن روزہ رکھتے تھے۔ اور کبھی کبھی مسلسل کئی ماہ تک روزے رکھتے تھے۔ ہر سال حج کرنے کے لئے جاتے اور امیر حج کے فرائض خود انجام دیتے تھے۔

خلیفہ چہارم

حضرت علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہ

ذوالحجہ سنہ ۳۵ھ تا رمضان سنہ ۴۰ھ

بمطابق

جون سنہ ۶۵۶ء تا جنوری سنہ ۶۶۱ء

حضرت علی مرتضیٰ

ابتدائی حالات : علیؓ نام، ابوالحسن کنیت، حیدر لقب تھا، والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ آنحضرتؐ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔ آپ کے والد ابوطالب بذاتِ خود مکہ کے صاحبِ اثر بزرگوں میں سے تھے آنحضرتؐ نے انہی کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اور جب آپؐ نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ تو ابوطالب نے آپ کی حمایت کی وجہ سے مشرکین مکہ کے ہاتھوں سخت ایذائیں برداشت کیں، یہ سچ ہے، کہ وہ علانیہ اسلام نہیں لائے لیکن جس محبت سے انہوں نے آپ کی پرورش کی اور جس استقلال کے ساتھ آپ کی حمایت کی اس کی وجہ سے ان کا نام تاریخ اسلام میں ہمیشہ روشن رہیگا۔

حضرت علیؓ بعثت نبویؐ سے دس سال پہلے پیدا ہوئے ابوطالب کثیر العیال اور معاش کی تنگی سے بہت پریشان تھے۔ اس لئے آنحضرتؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ہمیں اس مصیبت میں چچا کی کچھ امداد کرنی چاہیئے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے بڑے بھائی جعفرؓ کی کفالت عباسؓ نے اپنے ذمہ لی اور حضرت علیؓ کو سرکار دو عالم نے اپنی تربیت میں لے لیا۔

حضرت علیؓ کی عمر دس سال کی تھی کہ آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا ایک دن انہوں نے آنحضرتؐ اور حضرت خدیجہؓ کو عبادت کرتے دیکھا تو دریافت کیا۔ کہ آپؐ کیا کر رہے تھے۔ آنحضرتؐ نے سمجھایا۔ فطرت پاکیزہ تھی۔ اسلام قبول کر لیا اور بچپن میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ محققین کا فیصلہ ہے کہ عورتوں میں خدیجہؓ، مردوں میں ابوبکرؓ، بچوں میں علیؓ، اور غلاموں میں زید بن حارثہؓ سب سے پہلے ایمان لائے۔

مکی زندگی اور ہجرت : اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت علیؓ نے ۱۲ سال مکہ میں بسر کئے۔ دن رات آنحضرتؐ کے ساتھ رہتے تھے اس لئے انہیں ہر قسم کی صحبتوں میں شرکت کا موقع ملا۔ آنحضرتؐ کے ساتھ خفیہ طور پر نماز پڑھتے کبھی کبھی ایام حج میں آنحضرتؐ کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لئے بھی جاتے

اس طرح سفر و حضر کی معیت کا شرف حاصل رہا۔

جب اللہ تعالیٰ نے نبوت کے چوتھے سال آپ کو حکم دیا۔ کہ اب علانیہ اسلام کی دعوت دیجئے۔ حضور صلعم اپنے رشتہ داروں کو عذاب الٰہی سے ڈرا دیجئے۔ تو آنحضرت ؐ نے اپنے خاندان والوں کی شام کے کھانے پر دعوت کی اس دعوت کا انتظام حضرت علیؓ کے سپرد ہوا۔

اس وقت حضرت علیؓ کی عمر ۱۴ سال سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم انہوں نے بہت اچھا انتظام کیا۔ شرکائے دعوت کی تعداد ۴۰ تھی۔ حمزہؓ۔ عباسؓ۔ ابوطالب اور ابولہب بھی شریک تھے۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو آنحضرت نے فرمایا "اے بنی مطلب! میں تمہارے لئے دنیا اور آخرت کی بہترین نعمت پیش کرتا ہوں۔ تم میں سے کون اس کام میں میرا مددگار اور معاون ہوگا؟ اس کے جواب میں سب لوگ خاموش رہے۔ صرف حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا "اگرچہ میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں"۔

آپ نے یہ وعدہ پوری زندگی سامنے رکھا۔ اور کبھی آنحضرت کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جب آنحضرت نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت عطا فرمادی تو رفتہ رفتہ سب مسلمان مدینہ چلے گئے۔ صرف چند افراد باقی رہ گئے۔ ان میں آنحضرت ؐ کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ بھی تھے۔ مشرکین نے آنحضرت ؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مشرکین کے ارادہ سے مطلع فرمایا اور ہجرت کا حکم آیا۔ آنحضرت ؐ نے اس خیال سے کہ مشرکین کو شبہ نہ ہو حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا۔ اور خود صدیق اکبرؓ کو ہمراہ لے کر ہجرت فرمائی۔ نیز آنحضرت ؐ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ صبح لوگوں کی وہ تمام امانتیں واپس کر دینا۔ جو انہوں نے ابھی تک حضور کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ گویا آپؓ کے مکہ چھوڑ جانے کے مقصد دو تھے ایک کفار کو اپنی روانگی سے بے خبر رکھنا۔ دوسرے امانتیں واپس کرنا۔

اس وقت حضرت علیؓ کی عمر ۲۳ سال کی تھی۔ اس عمر میں اپنے آپ کو قربانی کے لئے بخوشی پیش کر دینا جاں سپاری کا عدیم النظیر کارنامہ ہے۔ حضرت علیؓ نہایت اطمینان کے

ساتھ حضور کے بستر پر سوئے۔ مشرکین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حضور کے بجائے آپ کا عاشق صادق آپ کے بستر پر سو رہا ہے۔

اس کے بعد حضرت علیؓ دو تین دن تک مکہ میں مقیم رہے اور جن لوگوں سے لین دین تھا۔ ان کے معاملات سے فارغ ہو کر مدینہ روانہ ہو گئے۔ جب آنحضرت نے انصار اور مہاجرینؓ میں مواخات کا رشتہ قائم کیا۔ تو اپنا بھائی حضرت علیؓ کو بنایا۔ آنحضرتؐ نے مدینہ میں مسجد تعمیر فرمائی تو حضرت علیؓ نے بھی آنحضرتؐ کے ساتھ اس مسجد مبارک کی تعمیر میں حصہ لیا۔ رجز پڑھتے جاتے تھے اور اینٹ اور گارا لا کر دیتے جاتے تھے اس طرح مزدوروں کی طرح خانۂ خدا کی تعمیر میں حصہ لیا۔

غزوات میں شرکت:

۲ھ میں آنحضرتؐ ۳۱۳ جانثاروں کو ساتھ لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے آگے آگے دو سیاہ علم تھے جن میں سے ایک حضرت علیؓ کے ہاتھ میں تھا۔ بدر کے قریب پہنچ کر آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو چند منتخب بہادروں کے ساتھ دشمنوں کی نقل و حرکت کا پتہ چلانے پر مامور کیا۔ انہوں نے یہ خدمت نہایت خوبی سے انجام دی۔

آغاز جنگ میں کفار مکہ کی صفوں سے تین نامی بہادر آگے بڑھے ان کے مقابلہ کے لئے تین انصار سامنے آئے۔ قریش نے کہا۔ کہ "ہمارے جوڑ کے آدمی بھیجو" یہ سن کر آپ نے حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور ابو عبیدہؓ کو بھیجا۔ حضرت علیؓ نے اپنے حریف ولید ایک ہی وار میں ختم کر دیا۔ اس کے بعد فوراً عبیدہؓ کی مدد کی۔ اور ان کے حریف کو بھی جہنم واصل کیا۔

جب عام حملہ شروع ہوا تو حضرت علیؓ نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اس معرکہ میں انہوں نے سترہ زخم کھائے لیکن مشرکین کے پاؤں اکھاڑ دئے مال غنیمت میں آپ کو ایک اونٹ ایک زرہ اور ایک تلوار ملی۔

احد کی جنگ شروع ہوئی تو حضرت علیؓ نے دشمنوں کی صفیں درہم برہم کریں، جب تیراندازوں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اور کفار کے ناگہانی حملہ سے مسلمانوں کے اوسان خطا

ہو گئے۔ تو اس نازک وقت میں حضرت علیؓ، ابو دجانہؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور سعد وقاصؓ
نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھا۔ جب دشمنوں کا زور کم ہوا تو
حضرت علیؓ چند صحابہؓ کے ساتھ آپ کو ایک پہاڑی پر لے گئے۔ اور ڈھال میں پانی
لائے۔ جناب فاطمہؓ نے زخم دھویا اور چٹائی جلا کر اس کی راکھ زخم میں بھری۔

غزوہ خندق کے موقع پر خندق ایک جگہ سے کم چوڑی تھی اس لئے کفار
گھوڑے کدا کر اس پار پہنچ جاتے اور مسلمانوں
کو نقصان پہنچاتے۔ ایک دفعہ عرب کے مشہور بہادر عمرو بن ودّ نے خندق عبور کر کے مسلمانوں
کو تنہا مقابلہ کا چیلنج دیا۔ حضرت علیؓ سامنے آئے۔ اس نے کہا "میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا"
شیر خداؓ نے جواب دیا، "مگر میں تجھ سے لڑنا چاہتا ہوں"۔ یہ سن کر عمرو گھوڑے سے اترا
اور تلوار سونت کر سامنے آیا۔ حضرت علیؓ نے ایسا ہاتھ مارا کہ دو ٹکڑے ہو کر فرش زمین
پر لوٹنے لگا۔

غزوہ خندق سے فارغ ہو کر آنحضرتؐ نے بنو قریظہ کی سرکوبی کے لئے حضرت
علیؓ کو مامور کیا۔ چنانچہ انہوں نے قلعہ فتح کیا۔ اور اس کے صحن میں عصر کی نماز ادا کی۔ آئندہ
سال یعنی سنہ ۶ھ میں آنحضرتؐ نے ان کو بنو سعد کے مقابلہ میں بھیجا۔ حکم کے مطابق حضرت
علیؓ نے سو آدمیوں کی جمعیت ساتھ لے کر ان پر حملہ کیا اور ان کو منتشر کر دیا۔ پانچ سو
اونٹ اور دو ہزار بکریاں غنیمت میں لائے۔

اسی سال آنحضرتؐ نے عمرہ کی نیت سے مکہ کا قصد فرمایا۔ حدیبیہ پہنچ کر معلوم
ہوا کہ مشرکین مکہ داخل نہیں ہونے دیں گے۔ چونکہ آپؐ کا ارادہ جنگ کا نہ تھا۔ اس لئے
ان سے صلح کر لی۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو صلح نامہ مرتب کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے حضورؐ
کے اسم گرامی کے ساتھ "رسول اللہ" لکھا۔ مشرکین نے کہا۔ اگر ہم آپؐ کو رسول اللہ تسلیم کر لیتے
تو پھر جھگڑا ہی کیا تھا۔ آنحضرتؐ نے اس لفظ کو مٹانے کا حکم دیا۔ لیکن حضرت علیؓ کی
غیرت اسے گوارا نہ کر سکی۔ حضورؐ نے خود اپنے ہاتھ سے مٹایا۔

خیبر میں یہود کے بڑے مستحکم قلعے تھے۔ جن کا فتح کرنا بہت مشکل تھا۔ آنحضرتؐ

نے پہلے حضرت ابو بکرؓ کو پھر حضرت عمرؓ کو ان کی تسخیر پر مامور فرمایا مگر کامیابی نہ ہوئی، تو حضورؐ نے فرمایا، کل ایسے بہادر کو علم دوں گا۔ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور خیبر کی فتح اسی کے ہاتھ پر مقدر ہے۔

صبح ہوئی تو آنحضرتؐ نے فرمایا، علیؓ کہاں ہیں؟" لوگوں نے کہا "کئی دن سے آشوب چشم میں مبتلا ہیں" آپ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں میں لگایا فوراً تمام شکایات دور ہو گئیں، اس کے بعد علم عنایت فرمایا اور نصیحت کی کہ جنگ سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دینا۔

یہودیوں نے حضرت علیؓ کی دعوت و تبلیغ کے جواب میں اعلان جنگ کر دیا ان کا مشہور بہادر مرحب رجز پڑھتا ہوا قلعہ سے نکلا، حضرت علیؓ بھی رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے، مرحب نے شیر خدا کے سر پر وار کیا۔ آپ نے ڈھال پہ روکا۔ لیکن تلوار ڈھال میں ڈوب کر نکل آئی۔ اور آپ کی پیشانی پر رکی۔ آپ نے بھی مرحب کے سر پر ایسا زبردست وار کیا۔ کہ ذوالفقار، خود اور سر کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی۔ مرحب کو قتل کرنے کے بعد حضرت علیؓ نے قلعہ پر حملہ کیا اور غیر معمولی شجاعت سے اس کو فتح کر لیا۔ یہ آپ کی شجاعت کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

۸ھ میں آنحضرتؐ نے مکہ فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ لشکر کی روانگی سے دو تین دن پہلے معلوم ہوا کہ ایک عورت علیؓ قریش مکہ یہاں کے حالات سے مطلع کرنے کے لئے آئی ہوئی ہے۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ اس عورت کو گرفتار کر کے لائیں۔ چنانچہ اس عورت سے وہ خط لے کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا

آنحضرتؐ دس ہزار صحابہ کو لے کر عازم مکہ ہوئے جنگ کے بغیر مکہ فتح ہو گیا آنحضرت نے سب سے پہلے خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کیا۔ تانبہ کا ایک بڑا بت بلندی پر نصب تھا۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے کندھے پر چڑھا کر اس بت کو بھی پاش پاش کر دیا

غزوہ حنین میں پہلے مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی۔ لیکن وہ مال غنیمت لوٹنے میں مشغول ہو گئے۔ تو دشمنوں نے اچانک حملہ کر دیا۔ مسلمان

ایسے بدحواس ہوئے کہ صرف چند جانثار ثابت قدم رہ سکے۔ حضرت علیؓ نے اپنی بے نظیر شجاعت سے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ دشمن کو کامل طور سے شکست ہو گئی۔

حضرت فاطمہؓ سے عقد:۔۔۔ ۲ھ ہجری میں آنحضرتؐ نے اپنی محبوب بیٹی فاطمۃ الزہراؓ کا نکاح آپ سے کر دیا۔ اس سعادت کا حصول یوں ہوا کہ حضرت علیؓ نے خواہش ظاہر کی، آپ نے بخوشی قبول فرمائی۔ حضورؐ نے دریافت کیا مہر ادا کرنے کے لئے کیا پاس ہے؟ عرض کیا ایک گھوڑے اور ایک زرہ کے سوا اپنے پاس کچھ نہیں۔

آپ نے فرمایا گھوڑا اپنے پاس رکھو۔ البتہ زرہ فروخت کر دو، آپؓ نے اپنی زرہ حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ فروخت کر دی انہوں نے ۴۸۰ درہم پیش کئے چنانچہ یہ رقم حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔ آپ نے خود نکاح پڑھایا اور اپنے وضو کا پانی میاں بیوی پر چھڑکا۔

نکاح کے دس ماہ بعد رخصتی ہوئی۔ جدا مکان کی ضرورت تھی۔ حارثؓ ابن نعمان حضورؐ کے صحابی تھے۔ ان کے پاس کئی مکان تھے۔ مگر حضورؐ اُن سے کہتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ کہ کئی بار انہیں تکلیف دے چکا ہوں۔ جب حارثؓ بن نعمان کو معلوم تو انہوں نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ حضورؐ میرا سب کچھ آپ ہی کا ہے۔ مکان حاضر ہے۔

حضرت علیؓ اور فاطمۃ الزہراؓ اس نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے خاتون جنت کو جو جہیز دیا اس کی تفصیل یہ ہے۔

ایک پلنگ، ایک گدا، ایک چادر۔ دو چکیاں۔ ایک مشکیزہ یہ تھا وہ سامان جو دو جہاں کے سردار محبوب خداؐ نے اپنی عزیز بیٹی کے جہیز میں دیا۔ مہر ادا کرنے کے بعد جو رقم بچی اس سے ولیمہ کی دعوت کا انتظام ہوا۔ ولیمہ کی دعوت میں مہمانوں کو جو کی روٹی۔ پنیر اور شوربا کھلایا گیا۔

وصال نبویؐ اور عہد خلفائے ثلاثہؓ:۔۔۔ ۱۱ھ میں آنحضرتؐ بیمار ہوئے حضرت نے نہایت جانفشانی اور

تندہی کے ساتھ تیمار داری کی۔ ایک روز باہر آئے تو لوگوں نے پوچھا کہ اب حضورؐ کی طبیعت کیسی ہے؟ انہوں نے کہا" آج تو حالت بہت بہتر معلوم ہوتی ہے"۔ یہ سن کر حضرت عباسؓ نے کہا" میں وفات سے پہلے خاندان عبدالمطلب کے چہروں کو بخوبی پہچانتا ہوں آؤ چلیں اور آنحضرتؐ سے اپنے لئے خلافت کی وصیت کرالیں"۔ حضرت علیؓ نے کہا" میں اس کی درخواست یوں نہیں کروں گا۔ کہ اگر آنحضرتؐ نے انکار کر دیا۔ تو پھر آئندہ کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔

دس دن کی علالت کے بعد ۱۲ ربیع الاوّل کو حضورؐ نے رحلت فرمائی حضرت علیؓ نے غسل دیا۔ اور تجہیز و تکفین کے مراسم بھی خود ہی ادا کئے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں تقریباً تمام اہل مدینہ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ لیکن صحیح روایات کے مطابق حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک بیعت نہیں کی۔ اس ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ انہیں اپنے خلیفہ نہ بننے کا ملال تھا۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ حضرت فاطمہؓ کی سوگوار زندگی نے ان کو بالکل خانہ نشین بنا دیا تھا۔ معاملات سے قطع نظر کر کے صرف ان کی دلدہی میں مصروف رہتے تھے چنانچہ ان کی وفات کے بعد انہوں نے بیعت کر لی۔ اور اپنے مشوروں اور تعاون سے مدد کرتے رہے۔

حضرت عمرؓ کو بھی اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیشہ فائدہ پہنچایا۔ نہاوند کے معرکہ میں حضرت عمرؓ نے ان کو سپہ سالار بنانا چاہا انکار کر دیا۔ البتہ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس گئے تو حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بنایا اور تعلقات کو زیادہ خوشگوار بنانے کے لئے حضرت عمرؓ نے ان کی بیٹی ام کلثوم سے نکاح کر لیا۔

عہد عثمانی میں جب فتنہ و فساد کا آغاز ہوا تو حضرت علیؓ نے فتنہ کو ٹلانے کے لئے بہت کوشش کی۔ حضرت عثمانؓ کو مخلصانہ مشورے دیئے۔ جب حضرت عثمانؓ نے ان سے شورش و فساد کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے نہایت صفائی سے کہہ دیا کہ یہ سب آپ کے عمال کی نالائقیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ ضرورت سے زیادہ نرم دل ہیں۔ وہ

آپ کی اس نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عوام یہ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں۔ آپ ہی کے اشارے اور منظوری سے کرتے ہیں۔ مصری وفد کو آپ ہی نے سمجھا بجھا کر واپس کیا تھا۔

جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کر لیا تو حضرت علیؓ نے امام حسنؓ اور امام حسینؓ اپنے دونوں بیٹوں کو پہرہ کے لئے دروازہ پر متعین کر دیا انہوں نے نہایت تندہی سے مدافعت کی لیکن ہزاروں آدمیوں کو کس طرح روک سکتے تھے؟ جب باغیوں نے خلیفۂ مظلوم کو شہید کر دیا۔ تو آپ کو شدید رنج ہوا۔ اور اپنے فرزندوں کو سخت سست کہا کہ تمہاری موجودگی میں یہ حادثہ کیسے ہوا۔

خلافت اور مشکلات: حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد تین دن تک خلافت معطل رہی، لوگوں نے حضرت علیؓ سے اس کو قبول کرنے کے لئے سخت اصرار کیا۔ شروع میں وہ اس کے لئے تیار نہ تھے لیکن مہاجرین اور انصار کے اصرار سے مجبور ہو کر قبول کر لیا۔ اور ۲۱ ذی الحجہ کو مسجد نبوی میں سب لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

خلافت قبول کرتے ہی آپ کو چند در چند دشواریاں اور مشکلات پیش آئیں سب سے اہم سوال حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ تھا ایک جماعت مسلسل اُن کے قصاص کا مطالبہ کر رہی تھی۔ مگر باغی آپ کے ہاتھ نہ آ رہے تھے مزید برآں یہ کہ اصل قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

آپ کے سامنے پہلا کام حضرت عثمانؓ کے قاتل کو سزا دینا تھا لیکن خلیفۂ مظلوم کی بیوی نائلہ اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکیں کہ محمد بن ابی بکرؓ دو آدمیوں کے ساتھ اندر آیا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے ایک فقرے سے شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا پھر دو بدکرداروں نے آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ لیکن میں ان کو نہیں جانتی کہ وہ کون تھے۔ غرض تحقیق کے باوجود اصلی قاتلوں کا پتہ نہ چل سکا۔

وہ نیک نہاد اور پاکباز عمال جو پہلے خلفا کو میسر تھے اب اُٹھ چکے تھے نہ حامل

اس پایہ کے تھے۔ نہ مشیر اس درجہ کے تھے۔ آپ خود اس کمی کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کا سارا عہد فسادات فرد کرنے میں ضائع ہوا۔ کوئی باقاعدہ اور مفید کام انجام نہ پاسکا۔

مخالفت کے اسباب: دوسرے اصحاب کے علاوہ حضرت علیؓ کے خلاف یا دوسرے لفظوں میں حضرت عثمانؓ کے خون کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں میں امیر معاویہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ پیش پیش تھے۔

حضرت علیؓ نے خلافت کی بیعت لینے کے بعد شام کے عامل امیر معاویہ کو لکھا کہ مہاجرین اور انصار نے بالاتفاق میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ اس لئے تم بھی میری اطاعت کرو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ امیر معاویہ نے اپنے خاص قاصد کی معرفت اس خط کا جواب بھیجا، اس میں بسم اللہ کے بعد صرف اپنا اور حضرت علیؓ کا نام لکھا تھا امیر معاویہ کے قاصد نے حضرت علیؓ کے سامنے مجمع کو مخاطب کر کے کہا "حضرات! میں پچاس ہزار شیوخ کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ عثمان کی خون آلود قمیص کو دیکھ کر ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہیں اور انہوں نے عہد کر لیا ہے۔ کہ جب تک خلیفہ مظلوم کا قصاص نہیں لیں گے۔ تلوار نیام میں نہیں کرینگے۔

دوسری طرف حضرت عائشہؓ مکہ سے واپس آرہی تھیں۔ کہ راستہ میں ان کو حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر ملی۔ یہ خبر سن کر وہ پھر مکہ واپس چلی گئیں۔ لوگوں نے واپسی کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ حضرت عثمانؓ مظلوم شہید کئے گئے تم لوگ خلیفہ مظلوم کے قصاص لے کر اسلام کی عزت قائم کرو۔

مدینہ میں فتنہ کے آثار دیکھ کر حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی مکہ چلے گئے۔ حضرت عائشہ نے ان سے حالات دریافت کئے۔ انہوں نے بھی فتنہ و فساد کا اندیشہ ظاہر کیا۔ یہ حالات سن کر حضرت عائشہ کا ارادہ بھی مضبوط ہو گیا اور انہوں نے باقاعدہ خلیفہ مظلوم کے قصاص کی دعوت شروع کر دی۔

حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا پتہ نہ چلنا، ان کے دشمنوں کو اپنا معاون اور انصار بنانا، اور خلیفہ ہوتے ہی تمام عثمانی عمال کو معزول کر دینا لوگوں کو بدگمان کر دینے کا سبب بنا۔ حضرت عثمانؓ کے اقرباء نے جو مدینہ سے بھاگ کر مکہ آ گئے تھے اس دعوت کو پوری قوت کے ساتھ پھیلانا شروع کیا۔ ان لوگوں نے طے کیا۔ کہ پہلے بیت المال پر قبضہ کیا جائے۔ پھر بصرہ، کوفہ اور عراق کے دوسرے شہروں میں اس دعوت کو پھیلایا جائے

حضرت علیؓ کو ان باتوں کا علم ہوا تو انہوں نے بھی عراق جانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ وہاں کے سرکاری خزانوں کی حفاظت کر سکیں اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکیں۔ انصار نے عراق جانے کو پسند نہ کیا۔ لیکن حضرت علیؓ نے کہا کہ اگر عراق پر مخالفوں کا قبضہ ہو گیا تو بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کی روانگی کا حکم دیا۔ چند صحابہؓ کے علاوہ سب لوگ ساتھ ہو گئے۔

ذی قار پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بصرہ پہنچ چکے ہیں۔ اور بنو سعد کے سوا تقریباً سب لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔

جنگ جمل: حضرت علیؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت طلحہ اور زبیر بصرہ پہنچ گئے ہیں اور وہاں کے عوام اُن کے ساتھ ہو گئے ہیں تو انہوں نے حضرت حسنؓ کو عمار بن یاسر کے ساتھ کوفہ روانہ کیا۔ وہ کوفہ پہنچے تو ابوموسیٰ اشعری والیٔ کوفہ جامع مسجد میں تقریر کر رہے تھے۔ کہ آنحضرتؐ نے جس فتنہ کی پیش گوئی کی تھی۔ وہ رونما ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ گوشہ نشین ہو جائیں۔ امام حسنؓ مسجد میں داخل ہوئے۔ اور اشعری سے کہا "کہ تم بھی ہماری مسجد سے نکلو اور جہاں جی چاہے چلے جاؤ" اس کے بعد منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو حضرت علیؓ کی سعادت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ دوسرے دن ۹۔۱۰ ہزار آدمی مسلح ہو کر حضرت علیؓ کی فوج میں آ شامل ہوئے اور اس کے بعد انہوں نے بصرہ کا رخ کیا۔

بصرہ میں اس وقت تین گروہ تھے۔ ایک غیر جانبدار، دوسرا حضرت عائشہ کا حامی، تیسرا حضرت علیؓ کا طرفدار۔ ہر نیک نیت آدمی چاہتا تھا۔ کہ صلح ہو جائے۔

حضرت عائشہ اور حضرت علیؓ بھی یہی چاہتے تھے۔ چنانچہ صلح کی گفتگو ہو رہی تھی اور یہیں ممکن تھا کہ صلح ہو جاتی لیکن حضرت علیؓ کی فوج میں عبداللہ بن سبا کے ساتھی اور حضرت عثمانؓ کے قاتلین شامل تھے اور ان لوگوں کے لئے صلح موت سے کم نہ تھی۔ انہوں نے رات کی تاریکی میں حضرت عائشہ کی فوج پر شبخون مارا۔ ہر فریق نے یہ سمجھا کہ دوسرے نے دھوکہ دیا ہے۔ چنانچہ دونوں طرف سے جنگ شروع ہو گئی۔

خود حضرت عائشہؓ اپنی ہودج میں سوار ہوئیں۔ محمد بن طلحہؓ رسالہ کے اور عبداللہ بن زبیرؓ پیدل فوج کے افسر تھے۔ اور حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ پوری فوج کی قیادت کر رہے تھے آج مسلمان کی تلوار مسلمان کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔

جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت علیؓ نے حضرت زبیرؓ کو بلا کر کہا "ابو عبداللہ! تمہیں یاد ہے۔ ایک دن آنحضرتؐ نے تم سے پوچھا تھا "کیا تم علیؓ کو دوست رکھتے ہو؟ تم نے کہا تھا ہاں یا رسول اللہؐ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا تھا۔ کہ ایک دن تم اس سے ناحق لڑو گے"!!

حضرت زبیرؓ نے جواب دیا "ہاں یاد آگیا" چنانچہ انہوں نے اپنے فرزند عبداللہ سے کہا "بیٹا! علیؓ نے ایسی بات یاد دلائی کہ جنگ کا سارا جوش ختم ہو گیا، بے شک ہم حق پر نہیں ہیں اب میں جنگ میں شریک نہیں ہوں گا۔ چنانچہ وہ تنہا بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے" ان کو جاتے دیکھ کر حضرت طلحہؓ بھی مذبذب ہو گئے، یہ دیکھ کر مروان بن حکم نے زہر آلود تیر سے ان کا کام تمام کر دیا۔

حضرت طلحہؓ کے مارے جانے اور زبیرؓ کے کنارہ کش ہو جانے سے عبداللہ ابن سبا کے ساتھیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے وہ یہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح حضرت عائشہؓ کو گرفتار کر لیں مگر بنو بکر ازد اور بنو ضبہ حضرت عائشہ کے اونٹ کو اپنے حلقہ میں لے اس جوش کے ساتھ لڑے کہ اس کی مثال نہیں ملتی اونٹ کی نکیل عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھ میں تھی جب وہ زخموں سے چور ہو کر گرے تو فوراً دوسرے نوجوان نے نکیل پکڑ لی اسی طرح یکے بعد دیگرے ستر بہادروں نے اپنے آپ کو ام المومنینؓ پر قربان کر دیا مگر کسی کو قریب نہ آنے دیا۔

حضرت علیؓ نے خیال کیا کہ جب تک اونٹ کو بٹھایا نہیں جائے گا خونریزی بند نہیں ہو گی۔ چنانچہ ان کے حکم سے ایک شخص نے پیچھے جا کر اونٹ کے پاؤں پر تلوار ماری وہ بلبلا کر بیٹھ گیا اور اس بیٹھتے ہی فوج کی ہمت پست ہو گئی اور تھوڑی دیر کے بعد سب نے ہتھیار ڈال دئیے حضرت علیؓ نے محمد بن ابی بکرؓ کو حضرت عائشہؓ کی حفاظت پر متعین کیا اور منادی کرا دی کہ نہ تو بھاگنے والوں کا تعاقب کیا جائے اور نہ زخمیوں پر گھوڑے دوڑائے جائیں اور نہ مالِ غنیمت لوٹا جائے۔

چند روز کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو عزت کے ساتھ مدینہ رخصت کیا اور خود کوفہ روانہ ہو گئے اس طرح جنگِ جمل کا خاتمہ ہوا اس جنگ کو جنگِ جمل اس لئے کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ جمل (اونٹ) پر سوار تھیں یہ جنگ جمادی الاخریٰ ۳۶ھ میں ہوئی۔

حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کو حسب ذیل خط لکھ کر بھیجا۔

جنگ صفین:۔ "تم پر میری بیعت لازم ہے مہاجرین اور انصار نے اتفاق رائے سے مجھے خلیفہ بنایا ہے اگر تم میری اطاعت نہیں کرو گے تو جنگ یقینی ہے اگر تم کو عثمانؓ کے قاتلوں سے انتقام کی آرزو ہے تو پہلے میری اطاعت کرو اس کے بعد میں کتاب اور سنت کے مطابق اس کا فیصلہ کر دوں گا۔ انہیں یہ بات منظور نہ تھی

امیر معاویہؓ عرصہ دراز سے شام کے والی تھے، علاوہ بریں حضرت علیؓ کے معزول کردہ عمال سب ان کے گرد جمع ہو گئے تھے عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، عبیداللہ بن عمرؓ بھی ان کے ساتھ تھے انہوں نے اس خط کے جواب میں حسب معمول قاتلین عثمانؓ کو حوالہ کرنے پر اصرار کیا۔

دوسرے دن قاصد جواب لینے کے لئے حاضر ہوا تو دس ہزار مسلح سپاہیوں نے باآواز بلند کہا کہ ہم عثمان کے قاتل ہیں حضرت علیؓ نے کہا "اس بات سے تم خود سمجھ سکتے ہو کہ عثمانؓ کے قاتلوں پر مجھے کس قدر اختیار حاصل ہے جواب میں پھر انہوں نے امیر معاویہؓ کو یہی لکھا کہ قتل عثمانؓ میں میری شرکت نہیں تھی اس لئے

ناحق ضد سے باز آجاؤ لیکن امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کی کوئی بات نہ مانی اس لئے مجبور ہو کر حضرت علیؓ نے اسی ہزار سپاہ کے ساتھ شام کا رُخ کیا۔

جب حضرت علیؓ کی فوج حدود شام میں داخل ہوئی تو ابوالاعور نے مقدمۃ الجیش کو آگے بڑھنے سے روکا لیکن اسے کامیابی نہ ہو سکی اس لئے اپنی فوج ہٹالی اور امیر معاویہؓ کو حالات سے مطلع کر دیا انہوں نے صفین کے میدان کو مدافعت کے لئے منتخب کیا۔

علوی فوج صفین پہنچی تو پانی کی دقت پیش آئی۔ حضرت علیؓ نے بزور شمشیر گھاٹ پر قبضہ کا حکم دیا سخت خونریزی کے بعد علویوں نے گھاٹ پر قبضہ کر لیا اب شامی فوج پانی کی محتاج ہو گئی مگر حضرت علیؓ نے شامی فوج کو پانی لینے کی اجازت دے دی اس طرزِ عمل سے دونوں جماعتوں میں دوستانہ آمد و رفت شروع ہو گئی۔

جنگ شروع کرنے سے پہلے حضرت علیؓ نے اتمام حجت کے لئے صلح کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی شروع میں طریقہ یہ تھا کہ تھوڑی فوج صبح و شام میدان، جنگ میں آکر لڑتی اور واپس چلی جاتی یہ سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا جب ماہ رجب شروع ہوا تو دستور کے مطابق جنگ ملتوی ہو گئی۔

نیک دل لوگوں نے پھر صلح کی کوشش کی چنانچہ ابو درداء اور ابوامامہ امیر معاویہؓ کے پاس گئے اور کہا تم حضرت علیؓ سے کیوں لڑتے ہو؟ وہ تم سے زیادہ خلافت کے مستحق ہیں اگر حضرت عثمان کے قصاص کے لئے لڑ رہے ہو تو وہ ان کے قاتل نہیں ہیں یہ سن کر امیر معاویہ نے جواب دیا کہ انہوں نے قتل تو نہیں کیا مگر قاتلوں کو پناہ دی ہے اگر وہ ان لوگوں کو میرے حوالہ کر دیں تو فوراً بیعت کے لئے تیار ہوں۔

یہ سُنکر دونوں حضرت علیؓ کے پاس آئے اور امیر معاویہؓ کی شرط ان کے سامنے پیش کی اس کو سن کر بیس ہزار آدمی علوی فوج سے نکل کر کہنے لگے ہم سب عثمانؓ کے قاتل ہیں" یہ دیکھ کر ابوالدرداء اور ابوامامہ دونوں لشکر سے نکل کر ساحل

علاقہ کی طرف چلے گئے۔

صفر ۳۷ھ سے پھر جنگ شروع ہوئی اور بڑی خونریزی ہوئی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ایک دن حضرت علیؓ نے اپنی فوج کو فیصلہ کن جنگ پر آمادہ کیا چنانچہ ان کے ساتھیوں نے شامیوں پر اس زور سے حملہ کیا کہ بڑے بڑے بہادروں کے پاؤں اکھڑ گئے حضرت علیؓ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے امیر معاویہؓ تک پہنچ گئے اور پکار کر کہا "معاویہ! کیوں خلق خدا کا ناحق خون گراتے ہو؟ آؤ ہم تم لڑ کے فیصلہ کر لیں لیکن امیر معاویہؓ مقابلہ پر نہ آئے۔

اب دونوں طرف سے پوری فوج مقابل ہونے لگی اور جمعہ کے دن ایسی لڑائی ہوئی جو اپنی شدت اور خونریزی کے اعتبار سے اسلامی تاریخ میں عدیم المثال ہے دونوں طرف سے ہزاروں آدمی مارے گئے امیر معاویہ اور عمرو بن عاص نے اب تک بڑی پامردی سے جنگ جاری رکھی تھی لیکن اب ان کو یقین ہو گیا کہ مقابلہ ناممکن ہے اس لئے انہوں نے حضرت علیؓ سے صلح کی درخواست کی لیکن اب انہوں نے انکار کر دیا۔

عمرو بن عاص نے امیر معاویہ سے کہا "میں نے ایسی تدبیر سوچی ہے کہ یا تو جنگ ختم ہو جائے گی یا علیؓ کی فوج میں پھوٹ پڑ جائے گی چنانچہ دوسری صبح کو شامی فوج اس شان سے میدان جنگ میں آئی کہ پانچ آدمی دمشق کے مصحف اعظم کو پانچ نیزوں پر بلند کئے ہوئے تھے اور جس سپاہی کے پاس قرآن مجید تھا اس نے اسے اپنے نیزہ سے باندھ لیا تھا۔

جب علویوں نے حملہ کیا تو ابو الاعور قرآن مجید کو سر پر رکھ کر ان کے قریب آیا اور کہا "اے اہل عراق! اللہ کی کتاب ہمارے تمہارے درمیان حکم ہے اشتر نخعی نے اپنے ساتھیوں سے کہا "یہ دشمن کی چال ہے"، لیکن حضرت علیؓ کی فوج پر شامیوں کا جادو چل گیا، چنانچہ ایک جماعت نے نہایت شدت سے یہ کہا کہ ہمیں قرآن کے فیصلہ کو تسلیم کرنا چاہئے اگر جنگ بند نہ کی گئی تو ہم

حضرت علیؓ سے جنگ کریں گے اس جماعت کے سردار اشعث ابن قیس نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ قرآن مجید کو حکم تسلیم کریں" مجبوراً حضرت علیؓ کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور جنگ ملتوی ہو گی۔

امیر معاویہ کی یہ زبردست چال تھی انہوں نے اپنی شکست کو بہ آسانی روک لیا اور حضرت علیؓ کے ساتھیوں کو اپنی سیاست کا شکار بنا کر ایک زبردست چال چلی۔

تحکیم اور اس کے نتائج: دونوں جماعتوں کے علماٗ نے فیصلہ کیا کہ خلافت کا مسئلہ دو آدمیوں کے سپرد کر دینا چاہیے اور ان کا فیصلہ قطعی ہو امیر معاویہؓ کے ساتھی شامیوں نے اپنی طرف سے عمرو بن عاص کا نام پیش کیا حضرت علیؓ کے طرف دار اہل عراق کی طرف سے اشعث بن قیس نے ابو موسیٰ اشعری کا نام پیش کیا حضرت علیؓ نے اس سے اختلاف کیا اور عبد بن عباس کا نام لیا اس پر اشعث نے کہا کہ لڑائی کی آگ تو اسی نے بھڑکائی ہے حضرت علیؓ نے دیکھا کہ لوگ ابو موسیٰ کے خلاف اور کسی پر راضی نہیں ہوتے تو مجبوراً جسے چاہو حکم بنا لو۔

ابو موسیٰ اشعری کو قاصد بھیج کر بلا یا گیا۔ دونوں کی طرف سے ایک عہد نامہ لکھا گیا کہ" حضرت علیؓ اور معاویہ اور ان کے طرف دار باہمی رضامندی کیسا تھ اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص قرآن اور سنت کے مطابق جو فیصلہ کریں گے بلا تامل تسلیم کریں گے ان کے لئے قرآن اور سنت کی اتباع ضروری ہے اگر ان کا فیصلہ قرآن اور سنت کے خلاف ہو گا تو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

اشعث بن قیس جب مختلف قبیلوں کو اس معاہدہ سے مطلع کرنے نکلا تو بنو تمیم کے سردار عروہ بن ادیہ نے اشعث سے کہا" کیا تم اللہ کے دین میں آدمیوں کا فیصلہ قبول کرتے ہو؟ اگر ایسا ہے تو بتاؤ ہمارے مقتول کہاں جائیں گے؟ اس

کے بعد بہت سے آدمیوں نے حضرت علیؓ سے آکر کہا کہ امیر المومنین آپ اس معاہدہ سے رجوع کر لیجئے حضرت علیؓ کے حامیوں سے ایک بڑی جماعت نے تحکیم کو ناپسند کیا اور آگے چل کر یہی جماعت خوارج کی شکل میں نمودار ہوئی کہ یہی لوگ جو کل تک حضرت علیؓ کے مخلص ساتھی تھے اُن کے خلاف ہو گئے۔

دومۃ الجندل میں پنچوں کا اجلاس منعقد ہوا یہ دونوں تخلیہ میں جمع ہوئے ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے ابو موسیٰ نے کہا میں ایسی رائے دیتا ہوں جس سے اللہ کی خوشنودی اور قوم کی بہبودی دونوں ہی حاصل ہو جائیں کیوں نہ عبداللہ بن عمرؓ کو خلیفہ بنا دیا جائے۔

عمرو بن عاصؓ نے کہا۔ خود امیر معاویہؓ میں کوئی خرابی نہیں پھر اگر وہ موزوں نہیں تو میرے لڑکے کو خلیفہ بنا دیا جائے

ابو موسیٰ اشعریؓ نے کہا خانہ جنگی میں شریک ہو کر اس کا دامن داغ دار ہو گیا ہے اس پر عمرو بن عاصؓ نے سوال کیا پھر آپ کی کیا رائے ہے اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کر دیں اور مسلمانوں کی مجلس شوریٰ کو اختیار دیں کہ وہ جسے چاہے خلیفہ منتخب کر لے عمرو بن عاص نے اس رائے سے اتفاق کیا۔

دوسرے دن مسجد میں سارے مسلمان جمع ہوئے ابو موسیٰ اشعریؓ نے عمرو سے کہا کہ منبر پر چڑھ کر فیصلہ سناؤ انہوں نے کہا آپ عمر اور علم و تقویٰ میں ہر طرح مجھ سے بڑھ کر ہیں آپ پہلے اپنا فیصلہ سنائیں ابو موسیٰ پر عمرو کا جادو چل گیا انہوں نے کھڑے ہو کر اعلان کیا "ہم نے علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کیا مجلس کو اختیار ہے جسے چاہے خلیفہ منتخب کر لے"

ابو موسیٰ کے بعد عمرو منبر پر آئے اور کہا علی کو جس طرح ابو موسیٰ نے معزول کیا میں بھی معزول کرتا ہوں لیکن معاویہؓ کو اس منصب پر قائم رکھتا ہوں وہ خلافت کے مستحق ہیں۔

ابو موسیٰ اس پر بہت حیران ہوئے اور مجمع میں بڑی برہمی پیدا ہو گئی ابو موسیٰ کو اس قدر ندامت ہوئی کہ اسی وقت مکے چلے گئے اور ساری عمر گھر سے باہر نہیں نکلے

خوارج ؛ خوارج کا لفظ خروج سے نکلا ہے جس کے معنی بغاوت اور نافرمانی کے ہیں دراصل ابتدا میں یہ لوگ حضرت علیؓ کے بہت مخلص ساتھی تھے "تحکیم" کے مسئلہ پر انہیں اختلاف ہو گیا ان کا دعویٰ یہ تھا کہ دین کا فیصلہ، انسانوں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا حضرت علیؓ نے عمرو بن عاص اور ابو موسیٰ اشعری کو حکم بنا کر غلطی کی ہے۔

یہ لوگ اس مسئلہ پر اس قدر برہم ہوئے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے خلاف خروج (بغاوت) کی صورت کر لی جب جنگ صفین کے بعد حضرت علی بصرہ سے کوفہ واپس لوٹے تو بارہ ہزار اشخاص نے آپ سے جدا ہو کر "حروراء" میں سکونت اختیار کر لی۔

حضرت علیؓ نے پہلے عبداللہ بن عباس کو انہیں سمجھانے کے لئے بھیجا پھر خود تشریف لے گئے اور انہیں واپس لے آئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس جماعت نے ایک مستقل فرقہ کی صورت اختیار کر لی۔

ان لوگوں نے حضرت علیؓ کی بیعت توڑ کر عبداللہ بن وہب الراسبی کے ہاتھ پر بیعت کر لی نہروان کو اپنا ٹھکانہ بنایا اور ہر طرف قتل و غارت شروع کر دی۔

نہروان کے مقام پر خود حضرت علی نے ان سے شدید مقابلہ کیا راسبی کے ہمراہ صرف چار ہزار خوارج تھے مگر ان لوگوں نے آخر دم تک مقابلہ کیا میدانِ جنگ میں کھیت ہو گئے مگر کسی ایک شخص نے راہِ فرار اختیار نہ کی۔

اس کے بعد بھی ان کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں عراق میں فتنہ فساد برپا کرتی رہیں۔ کئی بار غیر مسلم (ذمیوں) کو انہوں نے بغاوت پر ابھارا آخر حضرت علیؓ، کی طرف سے زیاد اور معقل ان کی سرکوبی پر مامور ہوئے انہوں نے خارجیوں

نے سردار خریت بن راشد کو ختم کرکے اس فتنہ کو وقتی طور پر فرو کیا۔

جنگ نہروان: خوارج نے تحکیم کو قبول نہ کیا اور دونوں جماعتوں کو واجب القتل قرار دیا چنانچہ انہوں نے بہت سے مسلمانوں کو قتل کر دیا اور غارتگری شروع کر دی حضرت علیؓ کو ان افسوسناک واقعات کا علم ہوا تو انہوں نے حارث بن مرہ کو تحقیق کے لئے بھیجا خوارج نے انہیں بھی قتل کر دیا اس لئے حضرت علی نے خود نہروان کی طرف رُخ کیا۔

نہروان پہنچ کر حضرت علیؓ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کو ان لوگوں کے پاس بھیجا مگر وہ ناکام واپس آئے اس کے بعد ان کے ایک سردار ابن الکوا کو بلاکر خود سمجھایا مگر کوئی اثر نہ ہوا مجبور ہو کر جنگ کی تیاری کی۔ جنگ شروع ہوئی تو ایک ہزار خارجیوں نے توبہ کرکے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی کچھ لوگ علیٰحدہ ہو کر کوفہ چلے گئے ۔ باقی کے صرف چار ہزار آدمی رہ گئے مگر یہ لوگ ایسی ہمت سے لڑے کہ اگر حضرت علیؓ خود میدان جنگ میں نہ ہوتے تو ان پر غالب آنا دشوار تھا آخر وقت تک کسی خارجی نے ہمت نہ ہاری پوری جماعت میدان جنگ میں ڈھیر ہو گئی ایک شخص نے بھی میدان سے فرار اختیار نہ کیا۔

نہروان سے فارغ ہو کر حضرت علیؓ نے شام کی طرف کوچ کا حکم دیا، لیکن اشعث نے کہا امیرالمومنین! ہمارے ترکش خالی ہو چکے ہیں تلواریں کند ہو گئی ہیں اور نیزوں کے پھل ٹوٹ گئے ہیں پہلے ہمیں سامانِ جنگ درست کرنا چاہیے حضرت علیؓ نے اس کی رائے سے اتفاق کیا کوفیوں نے جنگ کی تیاری کی بجائے چپکے چپکے کوفہ کھسکنا شروع کر دیا حضرت علیؓ کے ساتھ صرف ایک ہزار جان نثار رہ گئے ان حالات میں آپ نے شام پر حملہ کا ارادہ ترک کر دیا۔

امیر معاویہؓ سے چپقلش: حضرت علیؓ نے قیس بن سعد انصاری کو مصر کا والی مقرر کیا تھا امیر معاویہ نے انہیں اپنا طرف دار بنانا چاہا۔

جب اس میں ناکامی ہوئی تو مشہور کر دیا کہ قیس در پردہ میرے حامی ہیں جب یہ افواہ کوفہ پہنچی تو محمد بن ابی بکر نے حضرت علیؓ کو قیس کی طرف سے بدظن کر دیا جناب امیرؓ نے اس افواہ سے متاثر ہو کر قیس کو لکھا اگر خرتبا کے باشندے بیعت نہ کریں تو ان سے جنگ کرو۔ انہوں نے جواب دیا کہ خرتبا کی آبادی دس بارہ ہزار کی ہے یہاں کے لوگ بہادر اور جنگ آزما ہیں اس وقت ان کو بیعت کے لیے مجبور کرنا مصلحت کے خلاف ہے جب حضرت علیؓ نے اصرار کیا تو قیس نے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔

حضرت علیؓ نے ان کی جگہ محمد بن ابی بکر کو والی مقرر کر دیا اس نے حضرت عثمانؓ کی داڑھی پکڑی تھی یوں بھی بہت ناتجربہ کار تھا اس کے طرز عمل سے سارے ملک میں شورش بپا ہو گئی۔

حضرت علیؓ کو حالات کا علم ہوا تو انہوں نے اشتر نخعی کو مصر کا والی مقرر کیا، امیر معاویہ نے راستہ میں ہی ان کا کام تمام کرا دیا اور عمرو بن عاص کے ماتحت ایک فوج مصر کی طرف روانہ کی محمد بن ابی بکر کے لئے اس فوج کا مقابلہ سخت دشوار تھا تاہم وہ لڑنے نکلا لیکن پیچھے سے معاویہ نے آ کر گھیر لیا یہ دیکھ کر اس کے ساتھی بھاگ نکلے اور خود اس نے ایک کھنڈر میں پناہ لی جاسوسوں نے اس کو ڈھونڈ نکالا اور خرتبا میں محمد بن ابوبکرؓ کو قتل کر دیا اس طرح ۳۸ھ میں ملک مصر پر امیر معاویہؓ کا قبضہ ہو گیا اور مصر کا علاقہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں سے بالکل نکل گیا۔

مسئلہ تحکیم کے بعد ایک طرف حضرت علیؓ کی فوج میں پھوٹ پڑ گئی اور خوارج پیدا ہو گئے دوسری طرف آپ کے جاں نثاروں کے حوصلے پست ہو گئے حضرت علیؓ بار بار انہیں شام پر حملہ کی ترغیب دیتے تھے لیکن ایسے افسردہ خاطر ہو چکے تھے کہ وہ پھر کبھی آمادۂ جنگ نہ ہو سکے۔

امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے ساتھیوں کی اس کمزوری سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا وہ جارحانہ اقدام کرنے لگے چنانچہ ۳۹ھ میں انہوں نے حجاز عراق اور جزیرہ میں اپنی فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے پھیلا دیئے چنانچہ نعمان نے عین التمر پر اور سفیان نے مداین پر اور خود؛ دجلہ کے ساحل پر حملہ کر کے ، بہت سے شیعان علی کو قتل کیا اور بیت المال لوٹ لیا۔

۴۰ھ میں امیر معاویہ نے از سر نو چھیڑ چھاڑ شروع کی اور بسر بن ارطاۃ کو ۳ ہزار آدمیوں کے ساتھ حجاز روانہ کیا اس نے مکہ اور مدینہ پر قبضہ کر لیا اس کے بعد یمن کا رخ کیا اور یمن پہنچ کر شیعان علی کی ایک بڑی جماعت کو قتل کر دیا دوسری طرف شامی فوج نے سرحد عراق پر حملہ کیا اور انبار پر قبضہ کر لیا جب حضرت علیؓ کو بسر کی کامیابیوں کا حال معلوم ہوا تو آپ نے جاریہ اور وہب کو اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا اور شیعان علیؓ کو شامیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ابھارا آپ کے پر جوش خطبوں سے شیعان علی کے اندر کچھ عارضی حرکت پیدا ہوئی اور ہزاروں آدمیوں نے سرفروشی کا دعدہ کیا لیکن جب کوچ کا وقت آیا تو صرف تین سو آدمی رہ گئے۔

اس صورت حال سے حضرت علیؓ نہبت رنجیدہ ہوئے حجر بن عدی اور سعید بن قیس نے عرض کی کہ جب تک آپ سختی نہیں کریں گے یہ لوگ راہ پر نہیں آئیں گے ، چنانچہ حضرت علیؓ نے اعلان عام کر دیا کہ جو شخص میدان جنگ سے جی چرائے گا اسے سزا دی جائے گی لیکن اس اعلان کا بھی ، خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔

شہادت جنگ نہروان کے بعد چند سرفروش خارجیوں نے حج کے موقع پر ایک خوفناک سازش کی کہ جب تک علیؓ معاویہؓ اور عمروؓ دنیا میں زندہ ہیں مسلمانوں کو خانہ جنگیوں سے نجات نہیں مل سکتی چنانچہ تین آدمیوں نے ان تین حضرات کے قتل کا بیڑا اٹھایا عبدالرحمٰن بن ملجم نے

حضرت علی کے قتل کا ذمہ لیا۔

کوفہ پہنچ کر ابن ملجم کی ملاقات قطام نامی ایک حسین خارجی عورت سے ہوئی وہ اس پر فریفتہ ہوگیا اس نے حضرت علیؓ کے سر کو اپنا مہر قرار دیا ابن ملجم تو چلا ہی اس ارادہ سے تھا قطام کی فرمائش نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

نماز فجر سے پہلے حضرت علیؓ حسب معمول مسجد میں آئے اور حسب معمول مسجد میں سونے والوں کو جگایا ان میں ابن ملجم بھی تھا وہ پہلے سے مسجد میں آکر سوگیا تھا جب آپ سجدہ میں گئے تو اس نے وار کیا۔ تلوار زہر بجھی ہوئی تھی اس لئے شام ہوتے ہوتے آپ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت حسنؓ نے اپنے ہاتھ سے تجہیز وتکفین کی نماز جنازہ میں چار کے بجائے پانچ تکبیریں کہیں اور ۲۱ رمضان ۴۰ھ کو فضل وکمال اور رشد وہدایت کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۰

ابن ملجم کے دوسرے دونوں ساتھی امیر معاویہ اور عمرو بن عاص کو قتل نہ کرسکے۔ یوں ابن ملجم کے ناپاک ہاتھوں سے اسلام کا ایک درخشندہ ستارہ غروب ہوگیا

سیاسی ناکامی کے اسباب: حضرت علیؓ کو سیاسی طور پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا جس کے اسباب درج ذیل تھے،

وہ جس زہد وتقویٰ دیانتداری اور عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کرنی چاہتے تھے لوگوں کے اندر اس کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی آپ اپنے ساتھیوں سے ایک ایک پائی کا حساب لیتے تھے ان کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ اپنے طرفداروں کو مالا مال کر رہے تھے اس حال میں دنیا دار آپ کا ساتھ کیسے دیتے لیکن اگر حق کو باطل کے مقابلہ میں شکست ہو جائے تو اس سے حق کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑسکتا

دوسرا سبب یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے طرفداروں میں اتحاد نہیں تھا ایک بڑا طبقہ عبداللہ بن سبا کا پیرو تھا جس کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ فوق البشر ہیں حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو شدید ترین سزائیں دیں مگر اس فتنہ کا قلع قمع نہ ہوسکا دوسری

جماعت ان لوگوں کی تھی جو ہر معاملہ میں قرآن کی لفظی پابندی کرتے تھے چنانچہ واقعہ تحکیم کے بعد یہی جماعت خوارج کی صورت میں ظاہر ہوئی اور ردوستی کے بجائے شدید دشمنی کا سبب بنی۔

حضرت علیؓ کے طرفداروں میں ایک جماعت مخلص آدمیوں کی بھی تھی مگر جنگ صفین کے بعد ان کی ہمتیں پست ہو گئی تھیں۔ ان دشواریوں کے باوجود حضرت علیؓ نے انتہائی ہمت اور استقلال کے ساتھ تمام مشکلات کا مقابلہ کیا اور ناکامیوں کے اسباب سے واقف ہونے کے باوجود شریعت سے انحراف گوارا نہیں کیا اگر حضرت علیؓ تھوڑی سی دنیا سازی سے کام لے لیتے تو کامیاب ہو جاتے انہوں نے دین کی خاطر دنیاوی کامیابی سے قطع نظر کر لی اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت عثمانؓ کی شہادت اسلامی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ثابت ہوئی اس سے خلافت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔

نظام خلافت:- حضرت علیؓ انتظامی معاملات میں حضرت عمرؓ کے نقش قدم پر چلنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ نجران کے یہود نے جن کو حضرت عمرؓ نے جلاوطن کر دیا تھا۔ وہ خواست کی کہ ہمیں پھر وطن لوٹنے کی اجازت دی جائے لیکن حضرت علیؓ نے ان کی درخواست رد کر دی اور کہا، حضرت عمرؓ سے زیادہ صائب الرائے اور کون ہو سکتا ہے۔؟

آپ اعمال کی نگرانی میں بہت سختی سے کام لیتے تھے۔ اکثر اوقات ان کے طرز عمل کی تحقیقات کراتے رہتے۔ مالیات میں عمال کی بے عنوانیوں پر شدید بازپرس کرتے تھے اس بازپرس سے اقربا بھی محفوظ نہیں تھے۔ ایک دفعہ عبداللہ بن عباس (چچیرے بھائی) نے کثیر رقم قرض لی۔ حضرت علیؓ نے جواب طلب کیا تو ڈر کے مارے بصرہ سے بھاگ کر مکہ چلے گئے۔

آپ نے محاصل کے صیغہ میں کئی اصلاحات نافذ کیں۔ مثلاً پہلے جنگلات سے کسی قسم کا

مالی فائدہ حاصل نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن انہوں نے جنگلات کو بھی محاصل کے صیغہ میں داخل کر دیا۔ گھوڑوں پر زکوٰۃ موقوف کر دی۔

عوام کے لئے حضرت علیؓ کا وجود سراپا رحمت تھا۔ بیت المال کا دروازہ مسکینوں کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ جب کافی رقم جمع ہو جاتی تو مستحق لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی۔ ذمیوں کے ساتھ بھی نہایت فیاضانہ سلوک کرتے تھے۔

ملک شام کی سرحد پر بہت سی فوج چوکیاں قائم کیں، چنانچہ جب امیر معاویہؓ نے عراق پر یورش کی، تو پہلے انہی سرحدی سپاہیوں نے ان کو آگے بڑھنے سے روکا۔ ایران میں مسلسل بغاوت کے باعث انہی سرحدی سپاہیوں نے ان کو آگے بڑھنے سے روکا۔ ایران میں مسلسل بغاوت کے باعث بیت المال اور عورتوں کی حفاظت کے لئے بہت مضبوط قلعے بنوائے۔ فوجی ضروریات کے لحاظ سے دریائے فرات پر پُل بنوایا۔

مذہبی خدمات: خانہ جنگی نے بہت کم فرصت دی۔ تاہم حضرت علیؓ اس فرض سے غافل نہیں ہوئے آرمینیہ میں نومسلم مرتد ہو گئے تو ان کی سرکوبی کی خارجیوں اور سبائیوں کا قلع قمع کرنا بھی دراصل مذہب کی بہت بڑی خدمت تھی

آپ نے مجرموں کو عبرت انگیز سزائیں دیں نئی سزائیں تجویز کیں۔ شراب نوشی کی سزا اسّی کوڑے متعین کی۔ چہرے اور شرمگاہ پر کوڑے مارنے کی ممانعت کی۔ دس درہم سے کم چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں دیتے تھے۔

ناجائز حمل سے حاملہ عورت پر حد جاری کرنے سے پہلے وضع حمل کا انتظار کیا جاتا تاکہ بچہ محفوظ رہ سکے عام قیدیوں کو بیت المال سے کھانا ملتا ہے۔ لیکن جو مالدار شخص اپنے فسق و فجور کے باعث نظر بند کیا جاتا تھا۔ اس کو اپنے کھانے پینے کا انتظام خود کرنا پڑتا تھا

آپ کو بچپن ہی سے آنحضرتؐ کی صحبت نصیب ہوئی سفر اور حضر میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے۔ اس صحبت، تقرب اور تربیت ہی کو علماء نے ان کے فضائل کی اصل بنیاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی "ازالۃ الخلفاء" میں لکھتے ہیں "حضرت

علیؓ میں جو کمالات پیدا ہوئے اس کا پہلا سبب یہ ہے۔ کہ وہ شروع سے آنحضرت کے ساتھ رہے، دوسرا سبب یہ ہے۔ کہ وہ آپ کے بھائی اور داماد بھی تھے۔ آنحضرت نے خود اُن کو قرآن کے حقائق و معارف تلقین فرماتے تھے۔ انہی خصوصیات کی بناپر آنحضرت نے انہیں "دروازہ علم" کا لقب عطا فرمایا تھا۔ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے۔ اسی لئے کاتبان وحی میں شامل تھے۔

حضرت علیؓ نے قرآن کا مطالعہ بڑی کاوش کے ساتھ کیا تھا۔ پورا قرآن حفظ یاد تھا اور وہ ہر آیت کے مفہوم اور اس کی شان نزول سے واقف تھے۔ اسی لئے ان کا شمار مفسرین کے اعلیٰ طبقہ میں ہے۔ قرآن سے استنباط مسائل میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اکابر صحابہؓ کی طرح آپ بھی روایت میں بہت محتاط تھے۔ آپ سے کل (۵۸۶) احادیث مروی ہیں آپ نے چند احادیث آنحضرتؐ سے سُنکر ایک لمبے کاغذ پر لکھ لی تھیں اور یہ تحریر آپ کی تلوار کی نیام سے وابستہ رہتی تھی۔ یہ احادیث فقہی احکام سے متعلق تھیں۔ اور آپ نے اس کا نام صحیفہ رکھا تھا۔

سیرت و کردار: حضرت علیؓ نے بچپن ہی سے حضور سرور کائنات صلعم کی آغوش محبت میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر سیرت کی تمام خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کے ہونٹ شراب سے پاک رہے، نیز ان کی زبان مدۃ العمر کلمۂ کفر سے کبھی آلودہ نہیں ہوئی۔

انہوں نے الامینؐ کی صحبت حاصل کی تھی۔ اس لئے سراپا امانت تھے ایک دفعہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے غنیمت کی نارنگیوں میں سے ایک ایک نارنگی اُٹھالی انہوں نے دیکھا تو ان سے لے کر لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ ایک دفعہ بیت المال کا تمام اندوختہ تقسیم کر کے اس میں جھاڑو دی۔ اور دو رکعت نماز پڑھی کہ قیامت میں ان کی دیانت پر گواہی دے۔

زندگی زہد کا نمونہ تھی۔ جب کوفہ آئے تو محل کی بجائے میدان میں قیام کیا زہد کا

اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت فاطمہؓ کو جو سامان دجہیز، آنحضرتؐ نے رخصتی پر دیا تھا۔ حضرت علیؓ اس میں کسی چیز کا اضافہ نہ کر سکے۔

"خلیفہ ہو کر بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہی موٹا جھوٹا لباس اور وہی روکھا پھیکا کھانا۔ دروازہ پر نہ کوئی دربان نہ امارت کا سامان ایک دفعہ منبر پر خطبہ دیتے ہوئے کہا "میں اپنی تلوار بیچنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس ایک تہبند خریدنے کے لئے روپیہ نہیں ہے"، ایک شخص نے کہا "امیر المومنین تہبند کی قیمت میں بخوشی آپ کو قرض دینے کے لئے تیار ہوں"

اللہ تعالیٰ کی عبادت ان کا مشغلہ حیات تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں "جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ وہ بہت روزہ دار اور عبادت گذار تھے"۔

ظاہر دولت مند نہ تھے۔ مگر دل غنی تھا۔ اس لئے ساری عمر اللہ کی راہ میں صرف کرتے رہے سائل دروازہ سے کبھی خالی ہاتھ نہیں گیا۔ ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ اپنا کھانا فقیر کو دے دیا۔ اور خود بھوکے رہے۔

سادگی اور تواضع ان کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے محنت مزدوری کرنے باغ سینچنے۔ جوتا گانٹھنے اور اونٹ چرانے میں انہیں کوئی عار نہ تھا۔ فرش زمین پر سو جاتے ایک دن زمین پر سو رہے تھے۔ جسم کو مٹی لگ رہی تھی۔ آنحضرتؐ نے دیکھا تو اپنے دست مبارک سے ان کا بدن صاف کیا اور کہا "اجلس یا اباتراب"، "اے مٹی کے باپ! اٹھ کر بیٹھ جا!"، اس دن سے ان کی کنیت ہی "ابو تراب" پڑ گئی۔

شجاعت حضرت علیؓ کا وصف خاص ہے تمام غزوات میں شریک رہے اور ہر غزوہ میں اپنی شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ آپ بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین ان سب غزوات کے ہیرو ہیں۔ عمرو بن عبدود اور مرحب جیسے بہادروں کو شیر خدا نے ایک ہی وار میں جہنم رسید کر دیا۔

آپ نے ہمیشہ اپنے دشمنوں کے ساتھ شرافت کا برتاؤ کیا۔ ایک دفعہ ایک جنگ

میں ان کا دشمن برہنہ ہو گیا انہوں نے اسے قتل کرنے کے بجائے اپنا منہ پھیر لیا۔ تاکہ اسے خجالت نہ ہو۔ جب حضرت زبیرؓ کا سر اور ان کی تلوار حضرت کی خدمت میں پیش ہوئی۔ تو آبدیدہ ہو کر کہنے لگے۔ یہ وہی تلوار ہے۔ جس نے کئی دفعہ شدید خطرات میں آنحضرتؐ کی حفاظت کی ہے"

ابن ملجم ان کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ لیکن اس کے متعلق کبھی انہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ اسے مثلہ نہ کیا جائے اگر میں بچ گیا تو میں جانوں اور وہ۔ اور اگر میں مر گیا۔ تو اسے مجھ سے ملا دینا۔

حضرت علیؓ بہت صائب الرائے تھے عہد نبوت میں بھی ان سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ اور تینوں خلفاء نے بھی ہر مشکل معاملہ میں اُن کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر کہا تھا "اگر علیؓ نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا"

فضائل و مناقب:- وسعت معلومات کے اعتبار سے حضرت علیؓ کی مستحضرانہ قوت سب سے ارفع تھی۔ بعض اوقات اکابر صحابہؓ آپ کے اجتہاد سے استفادہ کرتے تھے۔ اللہ نے آپ کو فہم و دانش سے بہرۂ وافر عطا کیا تھا پیچیدہ مسائل تک آپ کی نگاہ بآسانی پہنچ جاتی تھی۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک مجنون زانیہ پیش کی گئی۔ انہوں نے اس پر حد جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ مجنون تو حدود شرعی سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔

صحابہؓ عام طور سے اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ حضرت علیؓ مقدمات کے فیصلوں کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کا قول ہے۔ "اقضانا علیؓ" یعنی مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے علیؓ ہم میں سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ آنحضرتؐ نے ان کو یمن کا قاضی مقرر کیا تھا۔ اور رخصت کے وقت یہ دعا دی تھی۔ کہ اللہ تمہاری زبان کو راستی اور دل کو ثبات عطا فرمائے" حضرت علیؓ کہتے ہیں۔ کہ اس دعا کے بعد کبھی مجھے مقدمات کے فیصلوں میں تذبذب نہیں ہوا۔

تصوف مذہب کی جان ہے۔ اور خاصان امت کا حصہ ہے۔ حضرت علیؓ اس فن کے ماہر تھے۔ انہوں نے اس کے رموز و نکات بہت عمدگی کے ساتھ بیان کئے ہیں شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے۔ کہ خلافت سے پہلے حضرت علیؓ کو اس میں بہت انہماک تھا۔ لیکن خلافت کے بعد اس فن کی تفصیل بیان کرنے کی فرصت نہیں مل سکی۔

تقریر و خطابت میں خداداد ملکہ حاصل تھا۔ بڑے بڑے مجمعوں میں برجستہ تقریر کر سکتے تھے اور ان کی تقریریں بڑی مدلل اور موثر ہوتی تھیں۔ مندرجہ ذیل خطبہ سے ان کے زور خطابت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

" جب میں موسم سرما میں تم سے فوج کشی کے لئے کہتا ہوں۔ تو یہ عذر کرتے ہو کہ ہم سردی میں کیسے لڑ سکتے ہیں۔ اور جب میں موسم گرما میں تم سے نکلنے کے لئے کہتا ہوں تو تم یہ کہتے ہو کہ ایسے گرمی میں کیسے نکلیں؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ سب موت سے بھاگنے کے حیلے ہیں، خدا کی قسم تم سردی یا گرمی سے نہیں بھاگتے۔ بلکہ تلوار سے بھاگتے ہو۔ اے مردوں کی تصویر و! اور اے بچوں کی سی سمجھ رکھنے والو! میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھے تمہاری جماعت سے نکال کر دور لے جائے، اور اپنی رحمت میں داخل کر دے۔ کاش تم سے میری شناسائی نہ ہوتی "

حضرت علیؓ شعر بھی کہتے تھے۔ چنانچہ دو چار اشعار صحیح حدیثوں میں مذکور ہیں مثلاً آپ کا وہ رجز جو آپ نے معرکۂ خیبر میں پڑھا تھا۔ لیکن جو دیوان آپ سے منسوب ہے۔ وہ دراصل آپ کا نہیں ہے۔ آپ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات پر ایک دردانگیز مرثیہ لکھا۔

حضرت علیؓ نے علم نحو کی بنیاد رکھی۔ ایک شخص کو قرآن شریف غلط پڑھتے سنا تو خیال کیا۔ کہ ایسے قواعد بنا دیئے جائیں کہ جن کی وجہ سے اعراب میں غلطی نہ ہو سکے چنانچہ ابوالاسود کو نحو کے ابتدائی قواعد بتائے۔ جو اس فن کی ابتداء ثابت ہوئے۔

خلافت راشدہ کی خصوصیات

خلفائے راشدینؓ کا زمانہ تاریخ اسلام کا مثالی اور درخشندہ یہ دور منفرد د ممتاز خصوصیات کا حامل ہے جن میں سے بعض اہم خصائص حسب ذیل ہیں۔

۱۔ طرز حکومت: یہ دور الٰہی جمہوریت کا تھا اس میں تمام فیصلے اور تمام قوانین "کتاب اللہ" اور سنت نبوی" کی بنیادوں پر ہے جمہوریت کی رائے یا خلیفہ کی اپنی مرضی کو اس میں دخل نہیں ہوتا تھا اسکے علاوہ مشورہ صرف اہل الرائے سے لیا جاتا ۔ مشورہ کے بعد آخری فیصلہ خلیفہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن کتاب اللہ اس کے بعد سنت رسول اللہؐ کی موجودگی میں کسی مشورہ کی ضرورت نہ تھی ۔ ان دونوں کو آخری قانونی حیثیت حاصل تھی ۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے ۔ کہ خلافت راشدہ ایک محدود جمہوریت تھی۔

۲۔ انتخاب:-

خلافت راشدہ میں انتخاب نہ تو شہنشاہیت کی طرح ہوا کہ باپ کے بعد بیٹا ہی تخت پر بیٹھے ۔ نہ آمریت کی طرح کہ کسی ایک شخص نے فوج یا اپنے دوستوں کی مدد سے اپنی پارٹی کے ذریعے حکومت پر قبضہ کیا ہو ۔ اور نہ وہ انتخابات ووٹوں کے ذریعے اور کثرت رائے سے ہوتے ۔ بلکہ ان چاروں خلفاء کے انتخاب کی مختلف صورتیں ہوئیں۔ تاہم خلفاء کا انتخاب اور نامزدگیاں جمہوری طریق پر ہوئیں ۔ عوام کی مرضی کو معلوم کیا کیا گیا ۔ اُن سے مہر تصدیق ثبت کرائی گئی ۔ مجلس شوریٰ اور اس کے بعد بیعت اس کی عملی صورتیں تھیں۔

۳۔ نظم ونسق

نظم ونسق کو بہتر بنانے کے لئے مختلف صوبوں میں تقسیم کیا گیا جوں جوں اسلامی سرحدات وسیع ہوتی گئیں ۔ صوبوں میں اضافہ ہوتا گیا ۔ ہر صوبہ کا ایک عامل ہوتا تھا ۔ عامل دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے اپنے علاقہ کے لئے ذمہ دار ہوتا تھا ۔ وہ امیر جماعت، سپہ سالار افواج، علاقہ کا سربراہ، نظم ونسق کا ذمہ دار اور قیام عدل کا امین

ہوتا تھا۔ عامل موجودہ دور کے مفلوج گورنروں جیسا نہیں ہوتا تھا۔

عامل کے علاوہ قاضی۔ محتسب اور بیت المال کے امین کے عہدے بہت وقیع ہوتے تھے۔ قاضی عدالتی امور میں سب سے بڑی حیثیت کا مالک ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے عامل بھی اس کے سامنے ایک عامی کی صورت میں پیش ہوتے تھے۔ محتسب شرعی امور اور واجبات کا ذمہ دار ہوتا تھا بیت المال کا خزانہ آمد و خرچ کا حساب اور مالی امور اس کے سپرد ہوتے تھے

۴۔ فوجی تنظیم

فوجی تنظیم کی صورت یہ تھی کہ خلافت راشدہ کے ابتدائی زمانہ میں جداگانہ فوج نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ہر مسلمان اللہ کا سپاہی تھا۔ اور بوقت ضرورت میدان قتال میں حاضری اس کا فریضہ تھی۔ بعد میں آہستہ آہستہ باقاعدہ فوجی تنظیم ہوئی۔

رجسٹر تیار کئے گئے۔ لوگوں کے نام درج ہوئے چھاؤنیاں بنیں۔ قلعے تعمیر ہوئے۔ چوکیاں بنائی گئیں۔ چراگاہیں مقرر ہوئیں فوجیوں

۵۔ آزادی : ۔ عوام کو آزادی رائے کا پورا حق حاصل تھا۔ ایک معمولی سے معمولی انسان بڑے سے بڑے عامل بلکہ خود خلیفہ کا محاسبہ کرنے کا حق رکھتا تھا۔ کسی عامل یا خلیفہ کو امتیازی حقوق حاصل نہ تھے نہ کوئی شخصیت قانون سے بالاتصور ہوتی تھی۔

۶۔ عدل و مساوات

اس دور میں مساوات اور عدل اپنے انتہائی کمال پر تھا۔ عوام حقوق و مراعات میں یکساں حیثیت کے مالک تھے۔ انصاف حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن سہولت اور آسانی میسر تھی ہر فریادی قاضی اور عامل تک بلا روک ٹوک بآسانی پہنچ سکتا تھا۔

۷۔ خلفاء کا کردار : ان سب باتوں سے بڑھ کر خلفاء کا اپنا ذاتی کردار بہت بلند اور لوگوں کے لئے مثالی نمونہ ہوتا ہے۔ خلفاء عام لوگوں کی طرح سادہ زندگی بسر کرتے تھے اسلام خود کرتے اور تقویٰ و پرہیزگاری کا نمونہ ہوتے تھے رعایا کی دیکھ بھال کرتے اور خود کو رعایا کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے۔ انکی خصوصیات کی بنا پر اس ۳۰ سالہ مثالی دور کو خلافت راشدہ کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تیس سال کے بعد اسلامی حکومت نہ رہی۔ اور اسلام کا قانون صرف اس مختصر سے عرصے میں نافذ رہا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ ایک مثالی دور ہے

خلافت راشدہ کے اہم واقعات

خلافت صدیقیؓ (۱۱ھ تا ۱۳ھ)

۱۱ھ۔ ربیع الاول، حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب
باغی عرب قبائل کی سرکوبی

۱۲ھ۔ باغی قبائل (مرتدین) کا انسداد اور امن وامان کا قیام
جمع قرآن کی خدمت۔

۱۳ھ۔ عراق کی جنگ کی ابتداء، شام کی جنگ کی ابتداء
اجنادین کا معرکہ، حضرت ابو بکرؓ کی وفات

خلافتِ فاروقیؓ (۱۳ھ تا ۲۳ھ)

۱۳ھ۔۔ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کی ابتداء
۱۴ھ۔۔ عراق کی مکمل فتح۔ ایران میں جھڑپیں شروع ہوئیں۔
۱۵ھ۔۔ یرموک۔ دمشق اور قادسیہ کی فتح۔ جنگ اجنادین۔ بصرہ کی آبادی۔ سنہ ہجری کا آغاز۔ محکمۂ فوج کا قیام
۱۶-۱۷ھ۔۔ الجزیرہ اور خوزستان کی فتح۔ بیت المقدس کی فتح
۱۸ھ۔۔ کوفہ کی آبادی۔ طاعون عمواس۔
۱۹ھ۔۔ امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔
۲۰ھ۔۔ مصر کے قلعہ بابلیون کی فتح۔
۲۱ھ۔۔ نہاوند (ایران)، سکندریہ (مصر) کی فتح۔
شہر فسطاط (مصر) کی بنیاد پڑی۔
۲۲ھ۔۔ آذربائیجان۔ اور طرابلس کی فتح۔
۲۳ھ۔۔ ۲۶ ذوالحجہ کو حضرت عمرؓ کی شہادت ہوئی۔

خلافتِ عثمانی رضؓ (۲۴ھ تا ۳۵ھ)

۲۴ھ ۔۔ محرم میں خلافت عثمانی کی ابتداء

۲۷ھ ۔۔ طرابلس کی فتح مکمل ہوئی ۔

۲۸ھ ۔۔ جزیرہ قبرص کی فتح ۔

۳۱ھ ۔۔ ساسانی خاندان کا خاتمہ

۳۲ھ ۔۔ قفقاز میں پیش قدمی ۔ آذربائیجان ۔ آرمینیا کی فتح

۳۳-۳۴ھ ۔۔ عبداللہ بن سبا کا فتنہ اور اہل کوفہ کی کارشی ۔

۳۵ھ ۔۔ مدینہ میں مفسدین کا اجتماع اور شورشیں

۱۸ ذوالحجہ کو شہادت

خلافت علوی رضؓ (۳۵ھ تا ۴۰ھ)

۳۶ھ ۔۔ جنگ جمل ۔

کوفہ میں دارالخلافہ منتقل ہوا ۔

۳۷ھ ۔۔ جنگ صفین اور نہروان ، خارجیوں کا ظہور ۔

۴۰ھ ۔۔ ۲۱ رمضان کو حضرت علیؓ کی شہادت ۔

حضرت حسنؓ کی خلافت صرف چند ماہ رہی اور پھر وہ دستبردار ہو گئے ۔

اہم امتحانی سوالات
و
پرچہ جات بورڈ

اہم امتحانی سوالات

اسلامی تہذیب و تمدن!

۱. اسلامی تہذیب کا مفہوم بیان کرتے ہوئے اس کی خوبیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے
(لاہور سنہ ۱۹۶۵ء)

۲. تمدن سے کیا مراد ہے؟ اسلامی تمدن کی نمایاں خصوصیات بیان کیجئے (لاہور سنہ ۱۹۶۷ء)

۳. اسلامی تہذیب زندگی کے کن کن دائروں پر اثر انداز ہوتی ہے؟ اسلام کے ایک کامل نظام حیات ہونے کی تفصیل لکھئے (۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۲ / ۱۹ء)

۴. ان عوامل و عناصر کو بیان کیجئے جو کسی قوم کی تہذیب پر اثر انداز ہوتے ہیں نیز بتائیے کہ کسی تہذیب کے قیام میں دین کا کہاں تک تعلق ہے! (لاہور ۶۲ / سنہ ۱۹۶۳ء)

۵. مندرجہ ذیل پر مختصر مگر جامع مضمون قلمبند کیجئے اور اپنے جواب کو قرآن و حدیث کی مثالوں سے واضح کیجئے۔ (ا) اسلام کا تصور وحدت حیات (ب) انسانی زندگی کا مقصد (لاہور سنہ ۱۹۶۳ء)

فرد: اخلاق اسلامی

۱. اخلاق کی تعریف کیجئے اور بتائیے کہ اخلاق عام اور اخلاق اسلامی میں کیا فرق ہے اور دونوں کی بنیاد کن امور پر ہے (لاہور سنہ ۱۹۶۳ء)

۲. اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے ان کی اہمیت واضح کیجئے اور بتائیے کہ فرد کے اخلاق سوسائٹی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ (لاہور ۶۳ / ۱۹۶۴ء)

۳. اخلاق کا مفہوم واضح کرتے ہوئے اسلام میں اخلاق کی جو اہمیت ہے اس پر روشنی ڈالئے نیز بعض اہم اسلامی اخلاقی اقدار کی نشاندہی کیجئے۔

(لاہور ۱۹۶۶ء)

۲. رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" کی روشنی میں اسلامی نظام اخلاق پر ایک مفصل مضمون قلم بند کیجیے (لاہور ۱۹۶۷ء)

تقویٰ:

۱. تقویٰ کا مفہوم بتائیے اور کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت واضح کیجیے۔

۲. "تقویٰ در اصل تمام اخلاق اسلامی کی بنیاد ہے"، مدلل بحث کیجیے۔

۳. قرآن و احادیث کی روشنی میں تقویٰ کے تقاضے قلمبند کیجیے

ذکر:

۱. ذکر سے کیا مراد ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت و فضیلت بیان کیجیے

۲. ذکر الٰہی کی مختلف صورتیں بیان کیجیے اور اس کے ثمرات و فوائد قلمبند کیجیے۔

۳. "اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے"، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کیجیے۔

شکر:

۱. شکر کا مفہوم بتائیے اور قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجیے۔

۲. شکر اور کفر کی حقیقت واضح کیجیے اور شکر کے فوائد قلمبند کیجیے۔

۳. صبر اور شکر میں کیا فرق ہے؟ ہر ایک کی تعریف کیجیے اور بتلائیے کہ ہر ایک کی مختلف قسمیں کیا ہیں؟ مثالیں بھی تحریر کیجیے۔ (لاہور ۱۹۶۳ء/۲)

صبر:

۱. صبر سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید میں صبر کے کون کون سے مفہوم بیان ہوتے ہیں؟ تفصیل قلمبند کیجیے۔

۲. صبر کا مفہوم واضح کیجیے اور قرآن و سنت کی روشنی میں صبر کی اہمیت بیان کیجیے

۳. قرآن و حدیث کی روشنی میں صبر کے ثمرات و فوائد پر ایک جامع نوٹ قلمبند کیجیے

۴. صبر و تحمل میں فرق واضح کیجیے اور بتائیے کہ اسلام کے جذبہ عزت و جہاد کا

ان سے کیا رابطہ اور تعلق ہے؟ (لاہور ۱۹۶۲ء)

عفو:

۱. "عفو" سے کیا مراد ہے قرآن وسنت کی روشنی میں عفو کی اہمیت بیان کیجئے۔

۲. شریعت نے عفو کی کیا حد مقرر کی ہے؟ قرآن واحادیث کی روشنی میں عفو کے تقاضے لکھئے۔

۳. عفو کے بارے میں سیرت رسولؐ اور سیرت صحابہؓ سے عملی مثالیں قلمبند کیجئے۔

عدل:

۱. عدل کا مفہوم بتائیے۔ نیز قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

۲. "عدل انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے" اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وضاحت کیجئے۔

۳. عفو اور عدل کی تعریفات لکھئے اور مثالیں دیجئے نیز بتائیے کہ عفو میں قانون عدل کی خلاف ورزی ہوتی ہے یا نہیں۔ (لاہور ۱۹۶۲ء)

۴. عدل وانصاف کا اعلیٰ معیار جو قرآن حکیم نے قائم کیا ہے اس کی وضاحت کیجئے نیز معاشرہ انسانی کے استحکام میں جو عدل کا اہم کردار ہے اس پر بھی روشنی ڈالیے (لاہور ۱۹۶۵ء)

خدمت خلق:

۱. خدمت خلق کا مفہوم بتائیے اور قرآن واحادیث کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

۲. آنحضرتؐ کی حیات طیبہ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے خدمت خلق کی مثالیں قلمبند کرتے ہوئے یہ واضح کیجئے کہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔

۳. خدمت خلق کی کیا شرائط ہیں؟ خدمت خلق کی مختلف صورتیں قلمبند کیجئے۔

تدبر:

۱. تدبر کا کیا مفہوم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں تدبر کی اہمیت بیان کیجئے۔

۲۔ انسانی زندگی میں تدبر کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ تدبر کے فوائد تحریر کیجیے۔

تحمل:

۱۔ تحمل کا مفہوم بتایئے اور کتاب و سنت کی روشنی میں تحمل کی اہمیت بیان کیجیے۔

۲۔ صبر اور تحمل میں کیا فرق ہے؟ روزمرہ زندگی میں تحمل کے فوائد تحریر کیجیے۔

خاندان (عائلی زندگی):

۱۔ عائلی زندگی کے بنیادی مقاصد تحریر کیجیے اور اپنے جواب میں اسلامی نظر و فکر کی وضاحت کیجیے۔ (لاہور ۶۲، ۶۳، ۱۹۶۴)

۲۔ گھریلو زندگی کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اس میں ایک مسلمان ماں کے فرائض کیا ہیں؟ (لاہور ۱۹۶۳ء)

۳۔ عائلی (گھریلو) زندگی کی نوعیت اور اس کے بنیادی مقاصد قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیجیے۔ (لاہور ۱۹۶۵ء)

۴۔ منزلی (گھریلو) زندگی کی اہمیت اور اس کے مقاصد پر قرآن و سنت کی روشنی میں ایک مفصل مضمون تحریر کیجیے۔

حقوق والدین:

۱۔ اولاد اور ماں باپ کے باہمی حقوق و فرائض کیا کیا ہیں؟ تفصیل سے بتایئے۔ کہ اولاد کی حسن تربیت اور ماں باپ کی خدمت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا کیا ہیں۔ (لاہور ۱۹۶۳ء)

۲۔ والدین کے حقوق و فرائض کیا کیا ہیں؟ اپنے جواب کی وضاحت قرآن و حدیث کی روشنی میں کیجیے۔ (لاہور ۱۹۶۴ء)

۳۔ والدین کے احترام و فرمانبرداری اور ان کے حقوق کی ادائیگی کی جو تعلیم قرآن و سنت میں درج ہے اس کی وضاحت کیجیے۔ (لاہور ۱۹۶۵ء)

حقوق اولاد:

۱۔ اولاد کے حقوق پر قرآن و احادیث کی روشنی میں ایک جامع مضمون قلمبند کیجیے۔

۲. اولاد اور ماں باپ کے باہمی حقوق و فرائض کیا کیا ہیں؟ تفصیل سے بتائیے کہ اولاد کی حسن تربیت اور ماں باپ کی خدمت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا کیا ہیں!

(لاہور ۱۹۶۳ء)

۳. اسلام نے اولاد کے حقوق کی حفاظت کس طرح کی؟ وضاحت کیجئے نیز بتائیے کہ تربیت اولاد کے بارے میں اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟

حقوق زوجین:

۱. اسلامی نظام حیات میں خاوند اور بیوی کے ایک دوسرے پر کیا کیا حقوق ہیں؟ اپنے جواب کو مثالوں سے واضح کیجئے۔ (۱۹۶۲ء)

۲. میاں بیوی کے باہمی تعلقات اور حقوق و فرائض پر قرآن و سنت کی روشنی میں بحث کیجئے۔ (لاہور ۶۷، ۱۹۶۵ء)

۳. حقوق الزوجین سے کیا مراد ہے؟ نیز ازدواجی زندگی کا مقصد اور اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

اسلامی نظام تعلیم:

۱. اسلام کے جذبۂ طلب علم پر بحث کیجئے اور بتائیے کہ یہاں کون علم مراد ہے؟ دنیوی تجربات اور معاشی نظریات سے جو علم حاصل ہوتا ہے ایک مسلمان کے لیے اس کی طلب کیسی ہے؟ (لاہور ۱۹۶۳ء)

۲. تعلیم کی ضرورت۔ اس کی نوعیت اور مقاصد کے بارے میں اسلامی نقطۂ نگاہ کی وضاحت کیجئے۔ (لاہور ۱۹۶۵ء)

۳. اسلام نے علم کے حصول کا کیا درجہ رکھا ہے؟ وہ کون کونسے علم کے حصول کا تقاضا کرتا ہے؟ نیز علم کے حصول کا مقصد کیا ہے؟ (۶۷، ۱۹۶۵ء)

استاد اور شاگرد:

۱. استاد کے مقام اور اس کے فرائض پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالیے۔

(لاہور ۱۹۶۶ء)

۲۔ قرآن وسنت اور دیگر تعلیمات اسلامی کی روشنی میں طالب علم کے فرائض کا جائزہ لیجئے
۳۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ایک نظریاتی استاد اور ایک نظریاتی شاگرد کے اوصاف بیان کیجئے۔

مکتب:

۱۔ اسلامی مکتب کا مفہوم واضح کرتے ہوئے اس کی اہمیت بیان کیجئے۔
۲۔ مکتب کی اہمیت پر تاریخی انداز میں ایک ایسا مضمون قلمبند کیجئے جس سے مکتب کے فرائض واضح ہو جائیں۔ (لاہور ۱۹۶۵ء)
۳۔ کسی معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں مکتب کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ اسلامی معاشرے میں مکتب کی افادیت واضح کیجئے۔

مسجد:

۱۔ مسجد شعائر اسلام میں کیا اہمیت رکھتی ہے اس کی عظمت اور افادیت پر بحث کیجئے اور مثالیں بھی دیجئے۔ (لاہور ۶۴، ۱۹۶۳ء)
۲۔ حقائق کی روشنی میں واضح کیجئے کہ مسجد مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ (لاہور ۱۹۶۵ء)
۳۔ اسلامی معاشرہ میں مسجد کو کیا حیثیت حاصل ہے؟ دور جدید میں مسجد کی عظمت رفتہ اور مرکزیت کو بحال کرنے کے لیے کن عملی اقدامات کی ضرورت ہے؟ (لاہور ۱۹۶۷ء)

اسلامی معاشرہ:

۱۔ اسلامی معاشرہ کا مفہوم واضح کیجئے اور اس کی خصوصیات پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے۔
۲۔ معاشرہ سے کیا مراد ہے؟ اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرہ کا مقصد اور اس کی اہمیت و ضرورت قلمبند کیجئے۔
۳۔ اسلام اور اصلاح معاشرہ پر ایک مدلل مضمون سپرد قلم کیجئے۔

اقارب (رشتہ دار):

۱۔ رشتہ داریاں معاشرے میں کیا کیا کردار پورا کرتی ہیں اور ان کے فوائد کیا ہیں؟

رابطہ ختم کرنے کی سزا کیا ہے اور بدخواہ رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنا کیسا ہے ؟

(لاہور ۱۹۶۴ء)

۲. قرآن و احادیث کی روشنی میں حقوق اقارب قلمبند کیجئے

۳. صلہ رحمی سے کیا مراد ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

ہمسایہ :

۱. ہمسایہ کے متعلق اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ ان کا معاشرہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟

(لاہور ۱۹۶۳ء)

۲. قرآن وسنت دیگر تعلیمات اسلام کی روشنی میں ہمسایوں کے حقوق و فرائض بیان کیجئے۔

(لاہور ۱۹۶۵ء)

۳. ہمسایہ کا مفہوم بیان کیجئے اور حقوق ہمسایہ کی ادائیگی کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالیئے۔

شہری :

۱. مسلمان شہری کے حقوق و فرائض اسلامی تعلیمات کی رو سے قلمبند کیجئے۔

۲. شہری سے کیا مراد ہے؟ اسلامی نقطہ نظر سے ایک اچھے شہری کی اوصاف بیان کیجئے

ریاست :

۱. اسلامی ریاست کے حقوق و فرائض قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں واضح کیجئے۔

(لاہور ۱۹۶۶ء)

۲. اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کیجئے نیز ان اصولوں کی نشاندہی کیجئے جن کو اپنا کر ایک ریاست اسلامی ریاست کہلا سکتی ہے۔

(لاہور ۱۹۶۵ء)

۳. اسلامی نقطہ نظر سے خلافت سے کیا مراد ہے؟ ایک عام ریاست اور اسلامی ریاست کا فرق بالتفصیل بیان کیجئے۔

۴. اسلامی ریاست میں خلیفہ یا امیر المومنین کو کیا حیثیت حاصل ہے؟ اس کا انتخاب

کیسے عمل میں لایا جاتا ہے؟ وضاحت کیجئے۔

اُمت:

۱. قوم اور امت میں کیا فرق ہے؟ نیز بتایئے کہ قومی زندگی کن کن دائروں سے مرتب ہوتی ہے۔ (لاہور ۱۹۶۴ء)

۲. قرآن حکیم نے مسلمانوں کو جو امت کا نظریہ دیا ہے اس کی وضاحت کیجئے۔ نیز بتایئے کہ مسلمانوں پر بحیثیت امت کون کونسی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

(لاہور ۶۷، ۱۹۶۵ء)

۳. امت مسلمہ کی اہمیت و فضیلت اور اس کی امتیازی خصوصیات کتاب و سنت کی روشنی میں کیا ہیں؟

اخوت:

۱. اسلام کے تصور اخوت پر ایک مختصر مگر جامع مضمون قلمبند کیجئے اور اپنے جواب کو قرآن و حدیث کی مثالوں سے واضح کیجئے۔ (لاہور ۱۹۶۲ء)

۲. اخوت اسلامی سے کیا مراد ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

۳. قرآن و احادیث کی روشنی میں مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض کا جائزہ کیجئے۔

تبلیغ:

۱. تبلیغ دین سے کیا مراد ہے اس کی اہمیت طریقہ اور شرائط بیان کیجئے۔

(لاہور ۱۹۶۴ء)

۲. تبلیغ اسلام کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تبلیغ کے لیے تنظیم کی ضرورت اور تبلیغ کے طریق کار کی وضاحت کیجئے۔ (لاہور ۱۹۶۵ء)

۳. تبلیغ دین کے اصول بیان کیجئے۔ نیز بتایئے کہ مبلغ کو کن کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے؟

۴. حضرت رسول اکرمؐ نے تبلیغ اسلام کا حق کس طرح ادا کیا؟ نیز تبلیغ دین کی اہمیت

کے بارے میں آپ کے چیدہ چیدہ ارشادات قلمبند کیجئے۔

جہاد :

۱۔ جہاد اسلامی کی تعریف کیجئے۔ نیز اس کا مقصد واضح کرتے ہوئے بتلائیے کہ اقدامی اور دفاعی جہاد میں کیا فرق ہے اور جہاد کا زندگی سے کیا تعلق ہے؟ (لاہور ۶۳ء ۱۹)

۲۔ جہاد کی اہمیت و فضلیت پر قرآن و سنت کی روشنی میں ایک تفصیلی مضمون سپرد قلم کیجئے۔ (لاہور ۶۲ / ۱۹۶۵ء)

۳۔ اسلامی عبادات میں جہاد کو کیا مقام حاصل ہے؟ اس کی مختلف صورتیں بیان کرتے ہوئے واضح کیجئے کہ جہاد کی افضل ترین صورت کونسی ہے؟

۴۔ جہاد اور جنگ میں کیا فرق ہے؟ قرآن و احادیث کی روشنی میں شرائط جہاد بالتفصیل بیان کیجئے۔

تاریخ اسلام

اسلام کا پس منظر :

۱۔ ظہور اسلام کے وقت عربوں کی سیاسی، سماجی اور تمدنی زندگی کا جائزہ پیش کیجئے۔
(لاہور ۷۴ء ۱۹ و سرگودھا ۷۵ء ۱۹)

سیرت النبیؐ :

۱۔ آنحضرتؐ کی ابتدائی زندگی کے واقعات نزول وحی تک مختصراً بیان کیجئے۔

۲۔ بعثت سے کیا مراد ہے؟ رسول اکرمؐ کے قیام مکہ کے دوران اسلام کی اشاعت اور فروغ کا حال مختصراً قلمبند کیجئے۔

۳۔ ہجرت حبشہ کا حال اور اس کے نتائج پر مختصر مضمون تحریر کیجئے۔
حضور نبی کریمؐ کی مکی زندگی کے حالات بیان کیجئے (لاہور ۷۴ء ۱۹ سرگودھا ۷۵ء ۱۹)

۴۔ ہجرت مدینہ کے اسباب اور واقعات بیان کیجئے۔ نیز بتائیے کہ اسی واقعہ کو تاریخ اسلام

میں کیا اہمیت حاصل ہے؟ (لاہور ۱۹۷۵ء)

۵۔ غزوہ بدر کے وجوہ ، واقعات اور نتائج لکھیے۔ نیز بتائیے کہ مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب کیا تھے؟

۶۔ معرکہ بدر حق و باطل کا اولین تصادم تھا جس کے نتیجے میں اسلام کو عرب بالخصوص مدینہ میں خاص تقویت حاصل ہوئی ۔'' اس نظریے پر مدلل بحث کیجیے ۔

۷۔ غزوہ احد کے اسباب اور واقعات بیان کیجیے۔ نیز بتائیے کہ اس میں مسلمانوں کے نقصان کی وجوہات کیا تھیں؟

۸۔ غزوہ احد نے مسلمانوں کی انفرادی صلاحیتوں کو آشکار کر دیا '' وضاحت کیجیے۔

۹۔ غزوہ خندق کے اسباب ، واقعات اور نتائج لکھیے (سرگودھا ۱۹۷۵ء)

۱۰۔ غزوہ احزاب میں مسلمانوں نے مدینہ کے دفاع کے لیے کون کونسی تدابیر اختیار کیں؟ نیز بتائیے کہ ان کی کامیابی کے اسباب کیا تھے؟

۱۱۔ غزوہ خندق عرب میں فروغ اسلام کی راہ میں آخری رکاوٹ تھی '' یہ نظریہ کہاں تک درست ہے؟ بحث کیجیے۔

۱۲۔ ہجرت کے وقت مدینہ میں یہود کے کون کونسے قبائل آباد تھے؟ ان کی ریشہ دوانیوں اور مدینہ سے اخراج کے واقعات لکھیے۔

۱۳۔ صلح نامہ حدیبیہ کے کیا اسباب تھے۔ اس صلح نامہ کی شرائط تحریر کیجیے اور اس کی اہمیت واضح کیجیے۔

۱۴۔ فتح مکہ کے واقعات تحریر کیجیے اور بتائیے کہ اس واقعہ کو تاریخ اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے؟ (لاہور ۱۹۷۴ء ، سرگودھا ۱۹۷۵ء)

۱۵۔ آنحضرتؐ کے '' حجۃ الوداع '' کی تفصیلات بیان کیجیے؟ اور خطبۃ الوداع کا خلاصہ لکھیے۔

۱۶۔ سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ بیان کیجیے اور واضح کیجیے کہ آپ کی ذات بنی نوع انسان کے لیے ایک بہترین نمونہ تھی۔

۱۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مصلح و بانی ملت اسلامیہ ،، اس عنوان پر مدلل

مضمون لکھئے ۔

۱۸۔ عہد رسالت کے نظام حکومت کا جائزہ پیش کیجئے ۔

۱۔ مندرجہ ذیل پر مبسوط نوٹ سپرد قلم کیجئے ۔

حلف الفضول ۔ واقعہ حجر اسود ۔ شعب ابی طالب ۔ سفر طائف بیعت عقبہ میثاق مدینہ (لاہور ۷۲ ، ۱۹۷۵ء) بادشاہوں کو تبلیغ ۔ غزوہ خیبر (لاہور ۷۸) غزوہ حنین بریٔہ معرقہ غزوہ تبوک ۔

خلافت راشدہ

۱۔ خلافت راشدہ کا مفہوم بتائیے اور اس دور کے اہم خصائص بیان کیجئے ۔

۲۔ خلفائے راشدین رضی کے عہد میں اسلام کی ترقی کا حال لکھئے اور اس دور کے سیاسی اور تمدنی پہلوؤں کا جائزہ لیجئے ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی :

۱۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی کے ابتدائی حالات زندگی بیان کیجئے اور آپ کے انتخاب خلافت کا حال لکھئے ۔

۲۔ حضرت ابوبکر رضی کو خلافت سنبھالنے کے بعد کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور آپ نے ان پر کیسے قابو پایا ؟ وضاحت کیجئے ۔

۳۔ صدیقی ہی فتنہ ارتداد کیونکر رونما ہوا ؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی نے اس کا کیسے انسداد کیا ؟ (لاہور ۱۹۷۵ء)

۴۔ عہد صدیقی میں ایران اور شام کے ساتھ جنگوں کی ابتداء کیسے ہوئی ؟ بالوضاحت قلمبند کیجئے ۔ (لاہور ۱۹۷۲ء)

۵۔ حضرت ابوبکر رضی صدیق کے اخلاق وعادات پر مضمون لکھئے اور آپ کی دینی خدمات کا بھی بیان کیجئے ۔

حضرت عمر فاروق رضی :

۱۔ حضرت عمر فاروق رضی کے ابتدائی حالات زندگی بیان کیجئے اور آپ کے انتخاب خلافت

کا حال بھی لکھئے۔

۲. عہد فاروقی میں اسلامی فتوحات کا مختصر جائزہ پیش کیجئے اور اسلامی سلطنت کی وسعت کے اسباب لکھئے۔

۳. حضرت عمر فاروق رضؓ نے کون کونسی آئینی و تنظیمی اصلاحات رائج کیں؟ مختصراً بیان کیجئے۔ (لاہور ۱۹۷۵ء)

۴. حضرت عمرؓ نے غیر مسلموں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا؟ مثالیں دے کر واضح کیجئے۔

۵. حضرت عمرؓ کی سیرت و اخلاق پر مفصل مضمون لکھئے۔

حضرت عثمان غنیؓ:

۱. حضرت عثمان غنیؓ کے ابتدائی حالات زندگی بیان کیجئے اور آپ کے انتخاب خلافت کا حال لکھئے۔

۲. عہد عثمانؓ میں وسط ایشیا اور شمالی افریقہ کی شاندار فتوحات تاریخ اسلام کا ایک زریں باب ہیں" واضح کیجئے۔

۳. حضرت عثمانؓ کے خلاف تحریک بغاوت کے اسباب اور واقعات کا جائزہ لیجئے۔

۴. حضرت عثمانؓ کے خلاف اعتراضات و الزامات کا تجزیہ کیجئے اور آپ کی شہادت کے اثرات بیان کیجئے۔

۵. حضرت عثمانؓ کے کردار اور آپ کی دینی خدمات قلمبند کیجئے (لاہور ۱۹۷۴ء سرگودھا ۱۹۷۵ء)

حضرت علی مرتضیٰؓ:

۱. حضرت علی مرتضیٰؓ کے ابتدائی حالات زندگی بیان کیجئے اور آپ کے انتخاب خلافت کا حال لکھئے۔

۲. عہد مرتضویؓ میں مسلمانوں کی باہمی آویزشوں کا حال لکھئے۔

۳. خوارج کون تھے؟ ان کا ظہور کیسے ہوا؟ ان کے عقائد و اعمال اور حضرت علیؓ کے ساتھ انکی منافقت کا حال لکھئے۔

۴. حضرت علیؓ کی سیرت، اخلاق اور آپ کے فضائل پر جامع مضمون تحریر کیجئے (سرگودھا ۱۹۷۵ء)

امتحان انٹرمیڈیٹ ۱۹۷۴ء لاہور بورڈ

اسلامک سٹڈیز پرچہ الف

وقت : تین گھنٹے کل نمبر ۱۰۰

کوئی سے پانچ سوالوں کے جواب لکھئے ۔ سب سوالوں کے نمبر یکساں ہیں ۔

۱۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ماں باپ اور اولاد کے حقوق و فرائض بیان کیجیے ۔

۲۔ شکر کا مفہوم بیان کرتے ہوئے عملی زندگی میں اس کی اہمیت اور فوائد وضاحت سے لکھیے ۔

۳۔ قرآن و سنت کی روشنی میں امت اسلامیہ کی تعریف کیجیے اور اس کی ذمہ داریاں قلمبند کیجیے ۔

۴۔ اسلام میں جہاد کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اس کی مختلف صورتیں بیان کیجیے ۔

۵۔ کتاب و سنت کی روشنی میں ہمسایوں کے حقوق پر تفصیلی نوٹ لکھیے ۔

۶۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے حالات بیان کیجیے ۔

۷۔ فتح مکہ کے اسباب اور واقعات اور نتائج پر روشنی ڈالیے ۔

۸۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کی اسلامی فتوحات کی تفصیل بیان کیجیے ۔

۹۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کردار اور کارناموں پر تبصرہ کیجیے ۔

۱۰۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی دو پر نوٹ لکھیے (ا) میثاق مدینہ (ب) فتح خیبر (ج) عدل (د) قبل از اسلام عرب کی اخلاقی حالت ۔

امتحان انٹرمیڈیٹ ۱۹۷۵ء لاہور بورڈ

اسلامک سٹڈیز پرچہ الف

وقت ۳ گھنٹے کل نمبر ۱۰۰

کوئی سے پانچ سوالوں کے جواب لکھیے ۔ سب سوالوں کے نمبر یکساں ہیں ۔

۱۔ تمدن سے کیا مراد ہے؟ اسلامی تمدن کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے ۔

۲۔ والدین اور اولاد کے باہمی حقوق و فرائض پر قرآن و سنت کی روشنی میں تفصیلاً بحث کیجیے۔
۳۔ تعلیم کی اہمیت اور مقاصد پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالیے۔
۴۔ اسلامی معاشرے میں مسجد کی اہمیت اور مقاصد کو واضح کیجئے۔
۵۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے صبر کا مفہوم بیان کیجئے اور عملی زندگی میں اس کی اہمیت و فوائد پر تبصرہ کیجئے۔
۶۔ ہجرت مدینہ کے اسباب۔ واقعات اور نتائج لکھئے۔
۷۔ حضرت علیؓ کی سیرت و کارناموں پر تفصیلی نوٹ لکھئے۔
۸۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نظام حکومت کی تفصیلات تحریر کیجئے۔
۹۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں ارتداد کا کیسے انسداد کیا؟
۱۰۔ مندرجہ ذیل عنوانات میں سے کسی دو پر نوٹ لکھئے۔ (۱) میثاق مدینہ (۲) اسلام میں امت کا تصور (۳) حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (۴) احسان۔

امتحان سالانہ ۱۹۷۵ء سرگودھا بورڈ

اسلامیات

پرچہ الف

وقت ۳ گھنٹے

کل نمبر: ۱۰۰

کوئی سے پانچ سوالوں کے لکھیے۔ سب سوالوں کے نمبر یکساں ہیں۔

۱۔ تقویٰ کا مفہوم بیان بیان کیجئے۔ نیز کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجئے
۲۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں استاد اور شاگرد کے حقوق و فرائض بیان کیجئے۔
۳۔ واضح کیجئے کہ مسجد مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے
۴۔ اسلام میں جہاد کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اس کی مختلف صورتیں بیان کیجئے۔
۵۔ کتاب و سنت کی روشنی میں ہمسایوں کے حقوق پر تفصیلی نوٹ لکھئے۔
۶۔ صلح حدیبیہ کے واقعات، شرائط اور نتائج بیان کیجئے۔
۷۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے حالات بیان کیجئے۔
۸۔ جنگ خندق کے اسباب، واقعات اور نتائج لکھئے۔

۹. حضرت عثمانؓ کے کردار اور کارناموں پر مفصل مضمون لکھئے۔

۱۰. مندرجہ ذیل میں سے کسی دو پر نوٹ لکھئے۔ (ا) فتح مکہ (ب) حضرت عمرؓ کی شہادت (ج) حضرت علیؓ کی سیرت و اخلاق (د) قبل از اسلام عرب کی سیاسی حالت۔

اسلامی

تاریخ و تمدّن

امتیاز احمد سعید

فیصل پبلیکیشنز

۹۸۔ گلزیب کالونی سمن آباد لاہور

ملنے کا پتہ۔ نیو بک پیلس چوک اردو بازار لاہور